صوصی اشاعت
دل دل پاکستان

آنکھ مچولی

اگست ۱۹۹۰ء

دل پاکستان نمبر کے ساتھ
صور کھیل "منزل پاکستان" مع گوٹیاں
فت حاصل کریں

IBLAGH ابلاغ

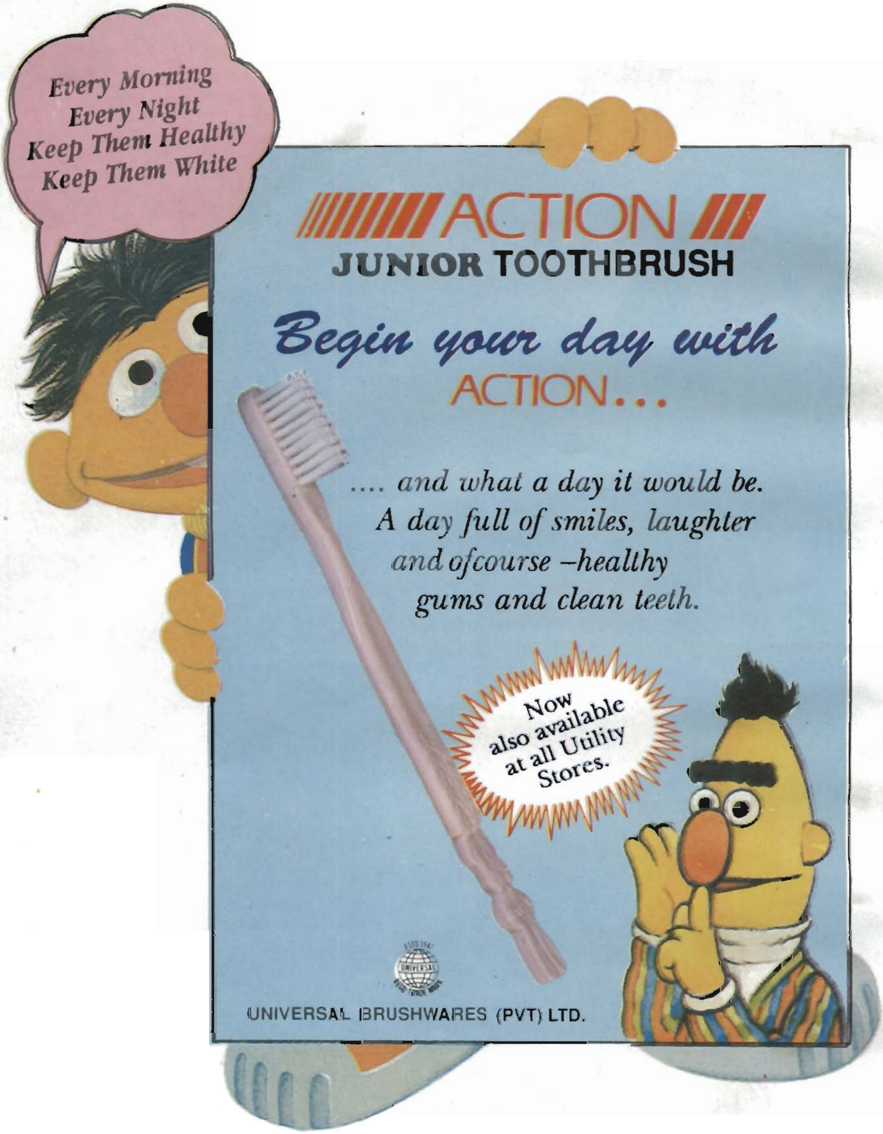
Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

When you need a little pep-up along the way
The cool taste of
Paxy's®
Hacks will freshen your day.
DROPS
Paxy's®
HACKS
HACKS®
mentholated drops
to freshen your day.

برسات کے اثرات

کچھ چہرے شاداب، کچھ چہرے بے آب

برسات کا موسم شروع ہوتے ہی خون میں شامل فاسد مادّے جسم پر پھوڑے، پھنسیوں، دانوں، مہاسوں اور خارش کی شکل میں اُبھر آتے ہیں۔ چہروں کی رونق ماند پڑ جاتی ہے۔ طبیعت پژمُردہ ہوجاتی ہے۔

موسمِ برسات کے ان منفی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے صافی استعمال کیجیے۔ صافی کا باقاعدہ استعمال خون کو فاسد مادّوں سے پاک کرکے جِلدی بیماریوں سے نجات دلاتا ہے اور چہرے کو شگفتگی و شادابی عطا کرتا ہے۔

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

صافی

ہمدرد

خون صاف، چہرہ شاداب

آوازِ اخلاق

غیبت اللہ کی نافرمانی ہے

ADARTS-HSF-3/88

Free Time
COMFORTABLE CHILDREN
SANDALS FOR THE
GROWING FEETS
Servis

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۵، شمارہ ۲، محرم الحرام ۱۴۱۱ھ، اگست ۱۹۹۰ء فون ۲۹۹۱۷۸

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مُشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلسِ مشاورت
شاہنواز فاروقی ساجد سعید مُنیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات وضعی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

ناشر، ظفر محمود شیخ طابع، زاہد علی مطبع، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط و کتابت کا پتہ، ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت
۱۸ روپے ۱۴ درہم ۱۴ ریال

۹ — اداریہ

۱۱ — نعت
عزیز الدین خاکی

۱۳ — ڈیئر ایڈیٹر

۱۷ — پاکستان کا مطلب کیا؟
غلام عباس طاہر لیل

۲۱ — درخت کا پیغام
نثار احمد زبیری

۲۷ — زندہ باد پاکستان
ضیاء الرحمٰن ضیاء

۳۳ — لہو کے چراغ
ناصر محمد

۳۸ — میں نے پاکستان بنتے ..
متین الرحمٰن مرتضیٰ

۴۶ — خادم ہوں وطن کا (نظم)
شاہنواز فاروقی

۴۷ — ٹوٹا ہوا پل
طاہر مسعود

۵۸ — باریک بین آرٹسٹ
سین ۔ میم

۵۹ — اللہ میاں سے ایک دُعا
طارق محمود میاں

۶۳ — پاکستان بنانے میں .....
ادارہ

۶۶ — ایک گھر نہیں بنا سکے
شاہنواز فاروقی

۷۵ — گیسو دراز پاکستانی بچی
ابنِ فضل کریم

۷۷ — کھوٹا سکہ
شبیر احمد راشد

۸۱ — ہمارے قائدِ اعظم
غ ۔ ع ۔ طاہر لیل

۸۳ — نیلی آنکھیں
محمد عمر احمد خان

۹۰ — میرا وطن نظم
شبیر بیگ نازؔ

۹۳ — منزلِ پاکستان
طاہر مسعود

۱۰۰ — شعلۂ آزادی (نظم)
کیف بنارسی

۱۰۳ — کتے میرے وطن کے
ایس ایم شاہد

۱۰۵ — بنگالی دوست کے نام خط
قرۃ العین سلیم

۱۱۱ — گمنام ہیرو
بشریٰ اشفاق

۱۱۴ — نئی نسل اور پاکستان
شبیر احمد راشد

۱۲۹ — آفتاب ظفر سے گفتگو
ابو اُسامہ

وعدہ — حنا خیری ۱۳۳

سائنس انکوائری — ایان محمود ۱۳۸

تعاقب — م۔الف۔راشد ۱۴۱

آنکھ مچولی جیت گیا — رپورٹ: مدیر اعزازی ۱۴۷

شہیدِ وطن ۱۵۳

پاکستان نے مجھے کیا دیا؟ — م۔الف۔راشد ۱۵۶

میں تو ماتا بھاگ آیا (نظم) — مسعود انور شفقی ۱۶۵

نغمہ اور نغمہ گر — سلیم مغل ۱۶۷

دِل دِل پاکستان — عامر یونس ۱۷۵

ببلو پٹاخہ عرف پاکستانی — شین فاروقی ۱۸۳

قائدِ اعظم سے ایک ملاقات — محب علی خان ۱۸۹

ہم دُکھ اُٹھاتے ہیں پھر بھی — ساجد سعید ۱۹۱

وطن عظیم ہے (نظم) — محمد جاوید خالد ۲۰۰

ڈنڈا ڈولی — منتخب لطائف ۲۰۱

دلدل — حمید کاشمیری ۲۰۵

کیا آپ سچے پاکستانی ہیں — احمد آفتاب ۲۱۵

یقین کی جیت — ادارہ ۲۲۱

ہم ایک ہیں — ملاحت کلیم شیروانی ۲۲۳

نئے کپڑے — کلیم چغتائی ۲۳۱

نذرِ اہلِ وطن (نظم) — کیف بنارسی ۲۳۶

کم سِن قلم کار ۲۳۹

قلمی دوستی ۲۵۷

امّی ابّو کا صفحہ — ام رمیصا ۲۶۲

صحت کا یہ راز ہے۔ طاقت توانائی ساتھ ہے
MEIJI
Fu
MEIJI Fu
ماں کے دودھ کے بعد پہلا انتخاب وٹامنز سے
بھرپور اور مکمل غذا میجی ایف۔ یہ دودھ
جو اپنے ذائقے کی وجہ سے بچوں کو انتہائی پسند ہے۔
میجی ایف۔ یہ شکر سے پاک ہے۔
صحت کا یہ راز ہے، طاقت توانائی ساتھ ہے۔
بارہ ماہ سے بڑھتے ہوئے بچوں کیلئے

Reach

اداریہ

ماہ رواں کی پہلی بات

ہمارے پیارے ملک نے اپنی زندگی کے ۴۳ سال مکمل کر لئے۔ سچ پوچھئے تو یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ پاکستان جب بنا تھا تو یہ ہر لحاظ سے کمزور اور بے حد غریب ملک تھا۔ اس کے پاس خزانہ، کارخانہ، مشینری، ذرائع پیداوار، تربیت یافتہ افرادی قوت، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو مسائل کے انبار در انبار...... جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ نوزائیدہ پاکستان انہی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جائے گا۔ ہندو لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کا نیا ملک تو بس چند مہینوں کا مہمان ہے۔لیکن پاکستان، قائد اعظم کے الفاظ میں "قائم رہنے کے لئے" بنا تھا۔ یہ قائم رہا اور اس کے لوگوں نے بہت جلد یہ ثابت کر دیا کہ ان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی امنگ ہے۔ انہوں نے دن رات کام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کا نقشہ بدل دیا۔ جہاں جنگلوں کے ویرانے تھے وہاں جاگتے جگمگاتے شہر آباد ہو گئے۔ جہاں صحرا و بیابان تھے وہاں فیکٹریاں اور کارخانے لگ گئے۔ جہاں بھوک اگتی تھی وہاں شاداب فصلیں لہلہانے لگیں۔جہاں بوسیدہ جھونپڑیاں تھیں وہاں سربہ فلک عمارتیں اگ آئیں۔ دھول بھرے راستے شاہراہوں میں تبدیل ہوئے۔ تعلیم کے چراغ جلے۔ نئے نئے ادارے بنے۔ قوم کی حالت بدلی، عام آدمی کی زندگی خوش حال ہوئی۔ افسوس کہ بدخواہوں کی نظر ترقی کے اس سفر کی طرف نہیں جاتی۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں آج کوئی بھوک سے نہیں مرتا۔ ہمارے لوگ پڑوسی ممالک کے لوگوں سے زیادہ خوش حال ہیں۔ ہمارے پاس دنیا کی بہترین افواج ہیں۔ ہم میں ایٹمی طاقت بننے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے سائنس دان مصروف ایجادات ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر، ماہر تعمیرات، شاعر و ادیب دنیا بھر میں ہماری پہچان ہیں۔ ہمارے کسانوں کا پیدا کردہ اناج اور کارخانوں میں تیار ہونے والے بہترین ملبوسات کی عالمی منڈی میں اپنی ایک ساکھ ہے۔ ہم نے ہاکی، کرکٹ اور اسکواش جیسے کھیلوں میں ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ ہم نے بڑی نامور شخصیات پیدا کی ہیں۔ تو پھر ہم خدا کا شکر کیوں نہ ادا کریں؟

ہمارا ملک آبادی، جغرافیائی محل وقوع، اپنے عقیدے اور ثقافت کے لحاظ سے سینکڑوں ممالک میں

ممتاز ہے۔ ہمارے پاس کیا نہیں ہے؟ قدرت نے ہمیں بے کراں سمندر، گھنے جنگل، سر بہ فلک پہاڑ، حسین وادیاں، وسیع و عریض صحرا اور دلکش مناظر فطرت عطا کئے۔ وطن کی گود میں ندیاں مچلتی ہیں، آبشار گرتے ہیں، جھرنے گیت سناتے ہیں۔ یہاں موسموں کے سارے رنگ ہیں۔ بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ برسات میں خوبصورت بارشیں ہوتی ہیں۔ صحت افزا مقامات پر برف باری ہوتی ہے۔ موسم سرما میں نرم دھوپ ہماری چادر بن جاتی ہے۔

یہ وطن ہمارا سرمایہ ایمان ہے۔ اس سے ہمارا وقار ہے۔ ہم کیا تھے؟ ایک مجبور اور غلام قوم...... اس نے ہمیں آزاد کیا...... ہم کچھ بھی تو نہیں تھے اس نے ہمیں بہت کچھ بنا دیا۔ آج دنیا میں ہمارا ایک نام، ہماری ایک پہچان ہے۔

تو پھر ہم خدا کا شکر کیوں نہ ادا کریں؟ ہم کیوں اس کے مستقبل سے مایوس ہوں۔ بے شک مسائل ہیں...... لیکن یہ ہوتے ہیں تو حوصلہ ہوتا ہے۔ عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو زندگی کا ثبوت ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو پھر آپ وعدہ کیجئے کہ آپ ہر ایسے عمل سے بچیں گے جو اس ملک کو نقصان پہنچانے والا ہو گا۔ ہر اس شخص سے ناتا توڑ لیں گے جو اس ملک کا دشمن ہو گا۔ آپ کا ہر قدم اس ملک کی ترقی و تعمیر کے لئے ہو گا۔ آپ کی دعائیں اور آپ کے آنسو، آپ کے قہقہے اور آپ کی امیدیں۔ سب اس ملک کے لئے ہوں گی۔

اسی ملک پاکستان کے لئے...... زندہ و پائندہ باد پاکستان!

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

نعت

عزیزالدین خاکی

محمدؐ مصطفیٰ جیسا کوئی آیا نہ آئے گا
شہ ہر دوسراؐ جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

ہزاروں انبیاء و رہنما و مرسلیں آئے
حبیب کبریاؐ جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

تمام اوصاف کی تکمیل کی خاطر انہیں بھیجا
رسول مجتبٰیؐ جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

صحیفوں اور کتابوں میں زمینوں آسمانوں میں
شہ ارض و سما جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

مسلسل ذکر ہو ان کا جو سب کے مقتداء ٹھہرے
اب ایسے پیشوا جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

عزیزالدین خاکی اختتام نعت پر کہہ دو
امام الانبیاء جیسا کوئی آیا نہ آئے گا

جِلد پہ نکھار.... تازگی برقرار!

نیا کیپری

نیا

کیپری.... زیادہ جھاگ... زیادہ خوشبو!
دو اسکن کنڈیشنرز کے ساتھ... آپ کی جِلد کی مکمل حفاظت
نئے کیپری کے استعمال سے جِلد کی تازگی برقرار!

نیا کیپری... اپنے رنگ و رُوپ میں آپ بھی اسٹار!

نیا کیپری... جِلد آپ کی نِکھار کیپری کا

Prestige

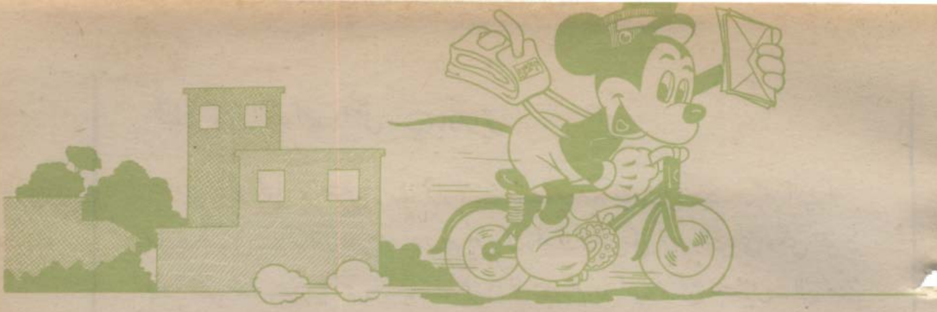

ڈیئر ایڈیٹر

ہمیں آزادی کا تحفہ دیجئے

انکل ! آپ نے اعلان کیا ہے کہ " دل دل پاکستان " کے ساتھ ایک تحفہ بھی ملے گا۔ انکل ہم کو تحفے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں آزادی کی ضرورت ہے۔ ہمیں آزاد رہنا ہے...... ہمیں آزادی کا تحفہ دیں۔ ہمیں یہ ضمانت دیں کہ ہم سدا آزاد رہیں گے۔ کیونکہ آپ ہم سے بڑے ہیں۔ ہمیں تحفہ نہیں چاہئے۔ صرف یہ یقین دلادیجئے کہ پورے پاکستان میں امن رہے گا۔ حیدر آباد اور کراچی میں سکون رہے گا۔ یہ یقین دہانی ہی ہمارے لئے بہت بڑا تحفہ ہوگی۔ (طارق محمود انجم۔ رحیم یار خان)

○ ...... پیارے طارق ! اگر تم دنیا کی تاریخ پڑھو گے تو یہ دیکھ کے حیران رہ جاؤ گے کہ آج جو دنیا کی ترقی یافتہ قومیں نظر آرہی ہیں۔ وہ کتنے خون خرابے اور کتنے دکھوں اور مصیبتوں سے گزر کر اس منزل تک پہنچی ہیں ان کی آزادی کو بھی خطرات درپیش ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنے عزم اور حوصلے سے ان خطروں کو شکست دی۔ انشاء اللہ ہم بھی ایک نہ ایک دن ان مسائل پر قابو پالیں گے۔ لیکن ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے اور تمہارے اندر یہ یقین پختہ ہو جائے کہ " پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت تباہ نہیں کر سکتی "۔

غلام رسول، شمس آباد

آپ نے جون کے شمارے میں "ڈوگھروں کی ایک کہانی" شائع کی جو پہلے بھی ایک بار شائع ہو چکی ہے۔ میں آپ کو اس کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ آپ اس کہانی کے مصنف محمد جاوید خالد کا نام بلیک بکس میں شائع کیجئے۔

شگفتہ نسیم، افتخار احمد دانش سعید آباد کراچی

آنکھ مچولی کو بہترین رسالہ قرار دیئے جانے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ ہم آپ کو نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ رفعت ہمایوں کی تحریر "چیونٹی کو بھی حقیر نہ جانو" نقل شدہ ہے۔ یہ جس کتاب سے نقل کی گئی ہے ہم وہ آپ کو بھیج رہے ہیں۔ ان کا نام بلیک بکس میں شائع کیجئے۔

○ ...... آپ لوگوں کے خطوں کا جواب ایک ساتھ اس لئے دیا جارہا ہے کہ آپ نے ہمارے دو ایسے لکھنے والوں پر نقل کرنے الزام لگایا ہے جو عرصہ دراز سے لکھ رہے ہیں اور جن کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی رسالے یا کتاب سے نقل کر کے کوئی تحریر ہمیں بھیجیں گے لیکن آپ لوگوں نے جو تراشے بھیجے ہیں انہیں پڑھ کر نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا الزام بڑی حد تک درست ہے۔ ہمارے یہ دونوں لکھنے والے ہمیں بے حد عزیز ہیں اور ہم ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اور اس لئے ہم ان کا نام بلیک بکس میں شائع نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن ان سے ہم یہ ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ کیا آپ نے سوچا ہے کہ اس طرز عمل سے آپ نئے لکھنے والوں کے لئے کیا مثال قائم کر رہے ہیں؟ آپ جو اپنی کہانیوں سے بچوں کو نصیحت آمیز باتیں سکھاتے ہیں۔ جب بچے یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لکھنے والوں کی تحریریں نقل شدہ ہوتی ہیں تو ان پر آپ کی اخلاقی کہانیوں کا کیا اثر مرتب ہو گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ان دو سوالوں پر غور کر لینے سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ آپ سے کیسی بُری بات سرزد ہوئی ہے۔

شاہد، فیصل کالونی، کراچی : ہمارے ملک میں اتنا تعصب پھیل گیا ہے کہ بھائی، بھائی کا دشمن ہو گیا ہے۔ ہر طرف لڑائی جھگڑے ہیں۔ آخر لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آخرت میں خدا کو ہر بات کا جواب دینا ہے۔

○ ...... ہمارے دُکھوں کا سبب ہی یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ ایک دن ہمیں کہیں جواب دینا ہے۔ کاش! یہ بات ہمیں یاد رہے۔ ہر وقت، ہر لمحے۔

راحت ملاحت الدین، گلشن اقبال، کراچی : میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں آپ کو کہانیاں نہیں بھیجوں گی۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ میں آنکھ مچولی کے معیار کی کہانی کوشش کے باوجود کبھی نہیں لکھ

سکتی۔ پھر بھی میں آنکھ مچولی پڑھنا بند نہیں کروں گی۔

○ ...... کیا آپ نے تیمور لنگ اور چیونٹی کی کہانی نہیں پڑھی۔ چیونٹی کو بار بار دیوار پر چڑھتے اور گرتے دیکھ کر تیمور کی ہمت بیدار ہو گئی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کو مجھ سے بہتر تو یہ چیونٹی ہے جو ہمت نہیں ہارتی۔ کیا آپ اس چیونٹی سے کوئی سبق نہیں لیں گی؟

محمد سلیم (؟): ہم سب پاکستانی "دل دل پاکستان" تو پکارتے ہیں۔ مگر ہم حقیقی معنوں میں اسے اپنا دل نہیں سمجھتے۔ ہم سب پاکستان سے صرف اپنا مفاد سوچتے ہیں۔ صرف اپنے مفاد کی خاطر مسلمان بھائیوں کو قتل کر دیتے ہیں انہیں اغوا کر لیتے ہیں۔ اگر ہمیں پاکستان کو عروج پر لے جانا ہے تو قائد اعظمؒ کا یہ قول ہمیں اپنانا ہو گا کہ "صوبائیت ایک لعنت ہے۔ ایک بیماری ہے۔ اس سے مسلمانوں کو نجات دلانا چاہتا ہوں ...... کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ ایک عزم کے ساتھ متحد، ہو کر نہ چلے۔"

○ ...... آپ کی بات سے ہم مطمئن ہیں۔ لیکن آپ کو نہیں بھولنا چاہئے کہ آج بھی اس ملک کی اکثریت اچھے اور محبّ وطن لوگوں پر مشتمل ہے اور اس کے وہی جذبات ہیں جو آپ کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ خاموش اکثریت ہے۔

وحید عامر، بورے والا ضلع وہاڑی: میں نے آپ کی سگریٹ چھڑاؤ تحریک پر عمل کیا۔ اور اپنے محلے کے چند نو عمر لڑکوں کو اس لعنت سے بچایا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً آپ کے رسالے کا حوالہ دے کر ان کی رہنمائی کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے میری نصیحت پر عمل کیا اور سگریٹ نوشی ترک کر دی۔

○ ...... شاباش! آپ نے یہ بہت شاندار خدمت انجام دی۔ خدا آپ کو اس کا انعام دے گا۔

محمد رفیق۔ کراچی: گزشتہ چند مہینوں سے رسالہ خریدنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ یہ مشکلات میری امی کی طرف سے پیدا کردہ ہیں بقول ان کے ہم آنکھ مچولی خرید کر اپنا جیب خرچ ضائع کرتے ہیں۔ خاصی بحث کے بعد شمارہ خریدنے کی اجازت مل بھی جائے تو آنکھ مچولی پڑھنے کا وہ مزہ باقی نہیں رہتا۔ آپ تمام بچوں کے والدین کو سمجھائیں کو اس عمل سے روپیہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ یہ تو جیب خرچ کا بہترین مصرف ہے۔

○ ...... افسوس کا مقام ہے کہ جو بات آپ کی امی کو خود سمجھنا چاہئے تھی۔ وہ بات آپ کو سمجھانی پڑ رہی ہے۔ لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ امی کو رسالہ پڑھنے کے فائدے بتایئے۔ چونکہ انہیں فائدوں کا علم

نہیں ہے اسی لئے وہ مخالفت کرتی ہیں۔ جب بات ان کی سمجھ میں آجائے گی تو وہ یقیناً مخالفت ترک کر دیں گی۔ آخر وہ آپ کی امی ہیں۔ آپ کی بھلائی انہیں عزیز ہوگی۔

رقیہ آزو، کوئٹہ: آج کل میں کچھ علیل ہوں۔ بس دعا کیجئے کو اللہ تعالیٰ صحیح سلامت اس دنیا سے اٹھا دے۔ اب زندگی سے دل بھر گیا یا پھر اس بیماری نے بڑا مایوس کر دیا ہے۔ پانچ دفعہ کان کے آپریشن ہوئے پھر اپنڈکس ہوا اور اب اس کا زخم ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ دعا کی اپیل شائع کر دیجئے۔

○ ...... اس محفل میں ہم مایوس لوگوں کو جگہ نہیں دیتے۔ کیونکہ مایوسی کفر ہے۔ آپ چونکہ اس محفل کی پرانی شریک ہیں۔ اس لئے آپ کے ساتھ رعایت کی گئی۔ صحت کے ساتھ بیماری تو لگی رہتی ہے۔ ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو پیدائشی روگی تھے لیکن ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہے۔ انہیں دیکھ کر دوسروں کو جینے کا حوصلہ ملتا تھا۔ آپ کا خط پڑھ کر تو ہم پر بھی مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ آپ کو جلد صحت یاب کر دے گا۔ ہمارے سارے ساتھی آپ کے لئے دعا گو ہیں۔

صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدر آباد۔ انکل! اس بار عید میں ذرا مزہ نہیں آیا۔ اس لئے کہ اس بار بہت سے لوگوں نے قربانی نہیں کی۔ اس لئے کہ حیدر آباد میں ہونے والے ہنگاموں کی وجہ سے ان کا بہت نقصان ہوا اور بہت سے لوگوں کے تو رشتہ دار ہلاک کر دیئے گئے۔ انکل! آپ آنکھ مچولی کے ساتھ ایک اسٹیکر دیجئے جس پر اتحاد قائم کرنے کی درخواست کی گئی ہو۔ ہم اسے اپنے محلے میں لگائیں گے کہ شاید ہمارے بڑوں کو عقل آجائے۔ شاید وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہو جائیں۔

○ ...... کاش! اے کاش! ہمارے بڑوں کو عقل آجائے۔ تم بہنوں کی دعا قبول ہو۔ ہم نے پہلے بھی اسی طرح کے اسٹیکرز دیئے ہیں اس تجویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سرفراز علی زنگیجو، ماتلی ضلع بدین: سید نظر زیدی صاحب کا مضمون "کراچی کا نام کراچی کیسے پڑا؟" اس میں انہوں نے سرہندی کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں سب غلط ہیں۔ کراچی کا اصلی پرانا نام کلاچی تھا۔ میری گزارش ہے کہ آپ ہمیں نئی تاریخ پڑھنے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں؟

○ ...... زنگیجو ...... میرے پیارے دوست! سید نظر زیدی صاحب نے اپنے مضمون میں کوئی بھی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی۔ سرہندی ایلیٹ اور ہاشمی فرید آبادی کی کتابوں کے حوالے سے لکھی تھی۔ تاریخی مقام اور شہروں کے بارے میں مورخین میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہی صحیح ہو جو آپ نے لکھا ہو۔ بات یہ ہے کہ دشمنوں کے پروپیگنڈے نے ہمیں ایک دوسرے سے اتنا بدگمان کر دیا ہے کہ ہمیں ہر بات میں تعصب نظر آتا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کراچی کا نام کلاچی تھا یا قریشی۔ کراچی آپ کا اپنا شہر ہے۔ آپ اسے جس نام سے چاہیں پکاریں۔

پاکستان کا مطلب کیا

غلام عبّاس طاہر

چوہدری رحمت علی تحریک پاکستان کی وہ برگزیدہ ہستی تھی جس نے ہمارے پیارے ملک کا نام رکھا۔ انہوں نے "پاکستان" کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب ہے:

"پاک لوگوں کی سرزمین" پاک سے مراد ہے روحانی طور پر صاف ستھرا "بقول چوہدری رحمت علی لفظ "پاکستان" ہمارے عوام کے مذہبی عقیدے کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جس سرزمین پر آباد ہیں اس کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہماری آبادی اور وطن کی نظریاتی اور علاقائی حد بندی کی ضمانت دیتا ہے۔

چوہدری رحمت علی نے طالب علی کے زمانے میں بزم شبلیؒ کی بنیاد رکھی اور اسی بزم کے پلیٹ فارم سے تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ "ہندوستان کا شمالی حصہ مسلم اکثریت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہم "مسلم" ایک علیحدہ ریاست بنائیں گے اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم متحدہ قومیت کے نظریہ کو خیرباد کہہ دیں"۔ آپ کی اس بات کی ہندو اور سکھ طلبہ نے مخالفت کی تو رحمت علی نے کہا "میرا ایمان ہے کہ ملت اسلامیہ علیحدہ وجود رکھتی ہے"۔ انہوں نے کہا مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں اگر تم کو (ہندو اور سکھوں کو) میرا موقف پسند نہیں تو تم اپنی راہ چلو میں اپنی۔ گریجویشن کے بعد چوہدری رحمت علی نے گھریلو حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت اختیار کرلی۔ حالات قدرے بہتر ہوئے تو اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ انگلستان میں آپ نے کیمرج سے ایم اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں۔

چوہدری رحمت علی نے ۱۹۳۳ء میں پاکستان قومی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ان ایام میں آپ پر جو جذبہ حاوی تھا وہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تھا۔ انگلستان میں گول میز کانفرنس میں کانفرنس کے مندوبین سے ملاقات کی اور پارلیمینٹ کے اراکین کے سامنے مسلم مطالبات کو ایک یادداشت کی صورت میں پیش کیا جس کا مشہور عنوان تھا "اب ورنہ کبھی نہیں"۔ چوہدری رحمت علی نے اس آزاد مملکت کا نام پاکستان تجویز کیا تھا اس سے قبل یہ لفظ لغت میں موجود نہ تھا۔ اس موقع پر آپ نے جو یادداشت تقسیم کی تھی اس میں سبز رنگ میں پاکستان کا نقشہ بنا ہوا تھا اور اس نقشے میں وہ علاقے دکھائے گئے تھے جہاں مجوزہ پاکستان کا قیام عمل میں آنا تھا۔ چوہدری رحمت علی نے اپنے ایجاد کردہ لفظ کی وضاحت اس طرح کی ہے "پاکستان فارسی اور اردو زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ ان حروف سے ترتیب دیا گیا ہے یعنی پنجاب سے "پ" افغانی صوبہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کا "الف" کشمیر کا "ک" سندھ سے "س" اور بلوچستان سے "تان" لے کر پاکستان کا لفظ مرتب کیا۔ خدا رحمت علی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

پاکستان سوہنا پاکستان

زندہ رہے تابندہ رہے۔

زیرِ نظر شمارے میں متین الرحمٰن مرتضیٰ صاحب کی تحریر "میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا؟" کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے مگر غلطی سے تحریر کے آخر میں یہ وضاحت نہیں کی جا سکی۔ واضح رہے کہ قیامِ پاکستان اور ہجرت کے حوالے سے لکھی گئی یہ خوبصورت تحریر تین حصوں پر مشتمل ہے "میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا" کا دوسرا حصہ ستمبر اور تیسرا حصہ اکتوبر میں شائع ہو گا۔

(ادارہ)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کا یومِ آزادی ہے۔ آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لئے برصغیر کے مسلمانوں کو آگ اور خون کے دریا کو عبور کرنا پڑا تھا۔

حصولِ آزادی کے کڑے سفر میں ایسے تکلیف دہ لمحے اور ایسے کرب ناک مناظر بھی آئے جن کے تصوّر سے روح تک کانپ جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک منظر پاکستان کے معروف آرٹسٹ ابوتراب مرحوم نے بھی دیکھا اور اُس کی منظر کشی رنگوں کے ذریعہ کی۔ ابوتراب مرحوم نے آزادی اور ہجرت کے حوالے سے اور بھی کئی یادگار پینٹنگز چھوڑی ہیں جو ہماری قومی تاریخ کا انمول ورثہ ہیں

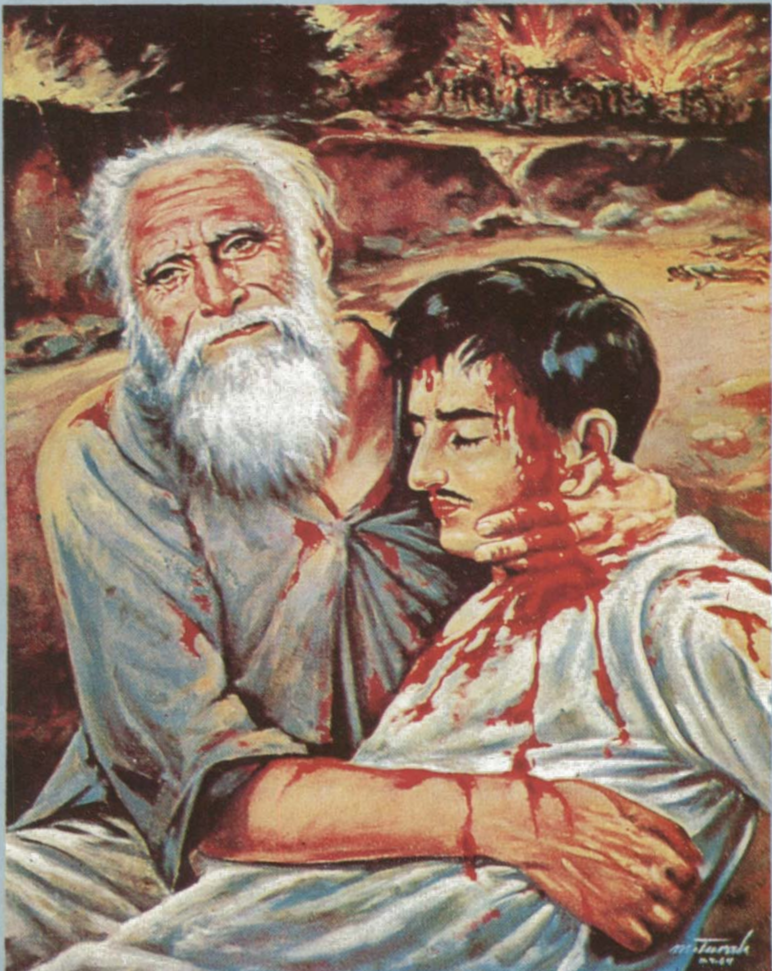

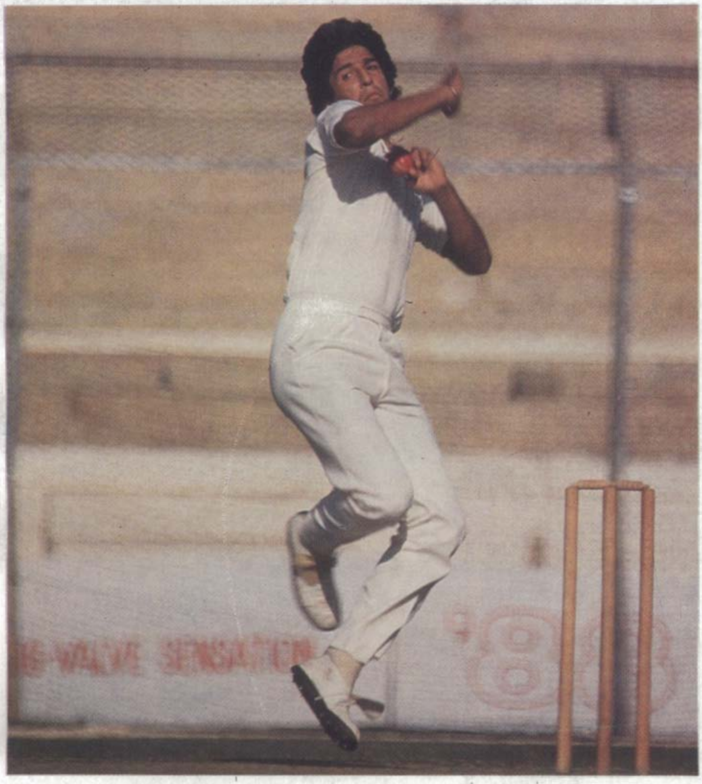

مہارت کی بلندی۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکران کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں، جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

درخت کا پیغام

نثار زبیری

جب وہ چند منٹ انتظار کے لئے درخت کے نیچے کھڑا ہوا تو چند لمحوں کے اندر ہی اس کا دل سکون اور خوشی سے بھر گیا۔ وہ تیز دھوپ میں جھلستا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ ہرے بھرے، اونچے چھتنار اور من موہنے درخت نے اسے ایسی پناہ دی کہ وہ تپتے ہوئے موسم کے دکھ بھول گیا۔ اس نے درخت کے موٹے اور شاندار تنے کے پاس رک کر پسینہ خشک کیا اور پھر اوپر نگاہ کی۔ ہرے بھرے رنگ کی پیار بھری تازگی اور چمک اسے دل کے ہر گوشے میں اترتی ہوئے محسوس ہوئی۔

اس نے دیکھا............ درخت کا بھرپور تنا............ شاخوں کا بوجھ مزے سے اٹھائے کھڑا تھا اور شریر اور شوخ پتے، شاخوں پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ اوپر سے نیچے کی طرف نظر لاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ پتے ڈالیوں سے لگے ہوئے ہیں، ڈالیاں پتلی شاخوں سے پیوست ہیں۔ پتلی شاخیں موٹی تنے سے جڑی ہوئی ہیں اور تنا مضبوطی کے ساتھ دھرتی میں جما ہوا ہے۔ تنے سے نیچے جڑیں۔ نظر تو نہ آتی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے، بھاری بھر کم اور شاندار درخت کو سنبھال رکھا تھا۔ "تازہ" سرسبز اور شاداب بنا رکھا تھا۔

وہ سائنس کا طالب علم تھا۔ اسے درخت کے سب حصوں کے سائنسی نام ازبر تھے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ہرا بھرا............ شاندار درخت اس لئے شاندار ہے کہ اس کا ہر حصہ اپنا کام بغیر آرام کے پوری دیانت داری، فرض شناسی اور مستعدی کے ساتھ کر رہا ہے۔ جڑ............ زمین سے پانی اور نمکیات کشید کرتی ہے جنہیں تنا پوری ایمانداری کے ساتھ شاخوں اور ڈالیوں کے ذریعہ سے ایک ایک پتے تک بھی پہنچاتا ہے اور اپنی نشو و نما کے لئے اپنا مقررہ حصہ بھی پوری ایمانداری کے ساتھ لیتا ہے۔ تنے اور شاخوں کی یہ ایمانداری پیڑ کے ہر حصے سے ظاہر تھی............ کیوں کہ ہر حصے میں نمو تھا، ترقی تھی، بڑھوتری اور خوبصورتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پتے سورج کی روشنی سے ہرا مادہ "کلوروفل" بناتے ہیں جو ان کے لئے غذا بھی ہے اور رنگ بھی یہ رنگ پیڑ کو خوبصورت بناتا ہے پھر اس خوبصورتی سے کیڑے مکوڑے اور پرندے پیڑ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور ان کی آمد سے درخت کی بار آوری کا گہرا تعلق ہے۔

وہ سوچتا رہا............ درخت کا ایک نظام ہے۔ اس نظام میں کوئی بے ایمانی نہیں، جعل فریب نہیں، الزام تراشی اور بیہودہ گوئی نہیں، کسی کا حصہ غصب کرنے کا سلسلہ نہیں، اپنے حصے سے زیادہ ہڑپ کرنے کی ہوس نہیں، تیرا میرا کا جھگڑا نہیں، بندر بانٹ کا تنازعہ نہیں، کسی محروم کی فریاد کا مقدمہ نہیں، کسی کی سرشاری اور سرکشی کا فساد نہیں۔ درخت کا ہر حصہ............ اپنے اور دوسروں کے لئے کچھ نہ کچھ نہایت اہم کام کرتا ہے۔ سب باہم مل کر درخت کی ترقی اور زینت کا کام کرتے ہیں اور سب خوش رہتے ہیں۔ پتے دھوپ میں چمک کر بہار کے خیر مقدمی ترانے گاتے ہیں............ اور انہیں یہ ترانے زیب دیتے ہیں۔

وہ اس شاندار درخت کے نیچے رکا تو چند منٹ کے لئے تھا............ لیکن پھر یوں ہوا کہ اس کے پاؤں جیسے جم کر رہ گئے۔ وہ رشک سے اس پیڑ کی یک جہتی اور ہم آہنگی کو دیکھتا رہا............ دیکھتا چلا گیا .... اور سوچ کے دریچے کھلتے چلے گئے۔

اس درخت پر کتنے پتے ہوں گے؟ اس نے خود سے پوچھا پھر ایک چھوٹی سے ڈالی پر لگے پتے شمار

کرنے لگا .... ایک دو تین چار پانچ .... آٹھ .... دس .... بیس .... بے شمار پتے تھے۔ اور سب خوش تھے، ہوا میں جھوم رہے تھے، تالیاں سی بجا رہے تھے .... "سب ملا کر لاکھ دو لاکھ .... یا شاید کروڑ دو کروڑ پتّے تو ہوں گے ہی" اس نے خود سے کہا۔ "اور یہ سب مطمئن ہیں۔ سبھی ترو تازہ و شاداب ہیں .... پھر اس کے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی .... وطن .... ہاں وطن بھی تو درخت کی طرح ہوتے ہیں .... جو ایسے نہیں ہیں .... وہ ہو سکتے ہیں ...."

وہ وہاں کھڑے کھڑے پاکستان اور ہرے بھرے سرسبز درخت کے بارے میں سوچتا رہا۔ درخت کے گھنیرے .... خنک .... بھرپور سائے سے دور، جھلملا دینے والی دھوپ چمک رہی تھی .... اور وہ ایمانداروں کے حامل درخت کے سائے تلے دھوپ سے محفوظ کھڑا تھا .... اور اتنا خوش تھا کہ اسے گزرتے وقت کا احساس نہ رہا تھا۔

اسے وطن کی بابت اِدھر اُدھر پڑھے ہوئے بہت سے جملے اور مقولے یاد آئے۔

فرانس میں رہنے سے سمجھ میں آیا کہ اپنے وطن سے مطمئن ہونے کے کیا معنی ہیں (سیموئل جانسن)

ہمارا کام کیا ہے؟ برطانیہ کو بڑے لوگوں کے رہنے کے قابل بنانا (جارج لائڈ)

ملک اللہ نے بنایا، شہر انسان نے (ولیم کوپر)

برطانیہ! تیری تمام خرابیوں کے باوجود مجھے تجھ سے عشق ہے (ولیم کوپر)

اپنے ملک کے لئے شہید ہونا۔ سرشاری والا عمل ہے (کوئنٹس ہوریس)

جب مجھے خیال آتا ہے کہ اللہ منصف ہے .... تو میں اپنے وطن کے لئے کانپ اٹھتا ہوں (ہنری جیمس)

اے وطن میں ہر ایک بہترین چیز اور اپنی محبت کی خدمت تیرے نام کرتا ہوں (آرتھر اسپرنگ رائس)

ہمارا مقصد ہمارا ملک ہونا چاہئے، اپنا پورا ملک، کچھ اور نہیں صرف اپنا وطن (ڈینئل ڈیبسٹر)

ہمارا کام کیا ہے؟

ملک کو بڑے لوگوں کے رہنے کے قابل بنانا۔؟

جارج لائڈ کا یہ جملہ اس کے پیچھے پڑ گیا .... اس کے کانوں میں گونجتا رہا کیا اس کا مطلب ہے .... چھوٹے لوگوں کو ملک سے نکال باہر کرنا ....؟ نہیں اس کا ذہن بولا "اس کا مطلب

ہے ملک کو اتنا اچھا بنانا کہ اس کے سب خدمت گار بڑے لوگ بن جائیں اور ان کا ملک ان کے رہنے کے قابل ہو" ایسا کس طرح ہو سکتا ہے .... کسی نے سوال کیا۔ ؟

"اپنی محبت کی خدمت وطن کے نام کرنے سے .... اور محبت خالص ہوتی ہے اس میں میرے تیرے کے تنازعے نہیں ہوتے۔ وطن کے سب لوگ اپنی خدمت وطن کے نام کرتے ہیں .... اور اس سے سب کو زندگی، کامیابی، کامرانی ملتی ہے .... ورنہ سب برباد ہو جاتے ہیں جیسے درخت کے سب پتے .... کلوروفل بناتے ہیں .... رنگ، خوبصورتی اور غذا کا بندوبست کرتے ہیں .... تو درخت ہرا بھرا، شاندار اور صحت مند ہوتا ہے۔ ایسے نہیں ہوتا کہ کچھ پتے کلوروفل بنائیں .... اور کچھ پتے خود کچھ نہ کریں بلکہ دوسروں کا کلوروفل ہڑپ کر جائیں۔

اس طرح نہ درخت صحت مند ہو سکتا ہے۔

نہ وطن۔ !

اس طرح نہ درخت شاندار ہو سکتا ہے

نہ وطن۔ !!

اسے دیر ہو رہی تھی، وقت بہت قیمتی ہوتا ہے نا، اس لئے وہ اپنے کام کے لئے وہاں سے چل دیا لیکن درخت کا پیغام اس کی آنکھوں میں بس چکا تھا۔

انسان

بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد بھارت کے ساتھ اس کی ملحقہ سرحدیں سخت کر دی گئیں تاکہ کوئی بآسانی سرحد پار نہ کر سکے۔ اس غرض سے باڈر کے ارد گرد خار دار تاروں کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ ادھر سپاہی بھی ہر دم چوکس رہتے۔ ایک رات پہرے پر موجود سنتری کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی سایہ ممنوعہ تاروں کو عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سپاہی کی زور دار آواز گونجی۔

"ہالٹ" پھر دور سے بلند آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟" جواب میں خاموشی "کیا بنگالی ہو؟" نہیں!

"بہاری"؟ نہیں! .... پٹھان؟ .... نہیں!

پھر کون ہو تم؟ ...... انسان!

اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک گولی انسان کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ (ماخوذ)

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

- ★ ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
- ★ ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
- ★ ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

- ★ ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
- ★ ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

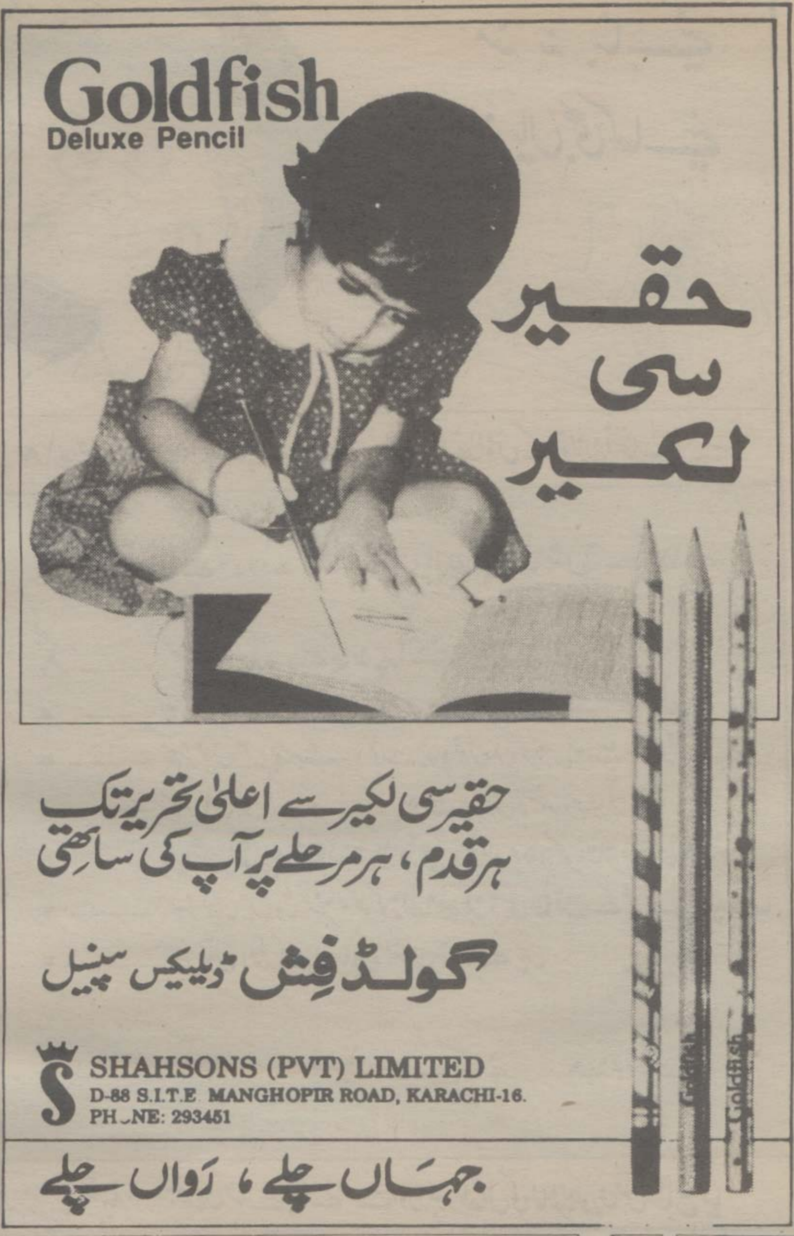
Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر سی لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فش ڈیلیکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PH.NE: 293451
جہاں چلے، رواں چلے
Goldfish
Goldfish

زندہ باد پاکستان

ضیاء الرحمٰن ضیاء

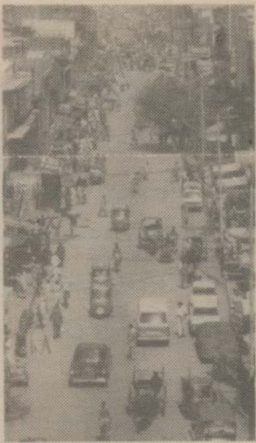

پاکستان .... دنیا کے مختلف ممالک سے کئی حیثیتوں میں منفرد و ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس خطّے کو اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ محنت کش باشندے ، خوبصورت اور بلند و بالا پہاڑ ، گنگناتے دریا، سرسبز و شاداب میدان ، تپتے صحرا ، میلوں طویل ساحل ، وسیع و عریض گلیشیئر ، سونا اگلتی زمینیں اور زمین کی وسعتوں میں موجود لامحدود معدنی ذخائر .... وہ کون سی نعمت ہے جو اس خطّے میں نہیں ہے۔ پاکستان کے باشندوں نے بھی اپنی مسلسل کوششوں سے ایسے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو کارنامے کہلانے کے مستحق ہیں۔ "زندہ باد .... پاکستان" کے عنوان کے تحت پاکستان سے منسوب ایسی ہی چند منفرد چیزوں ، شخصیات ، تعمیرات اور کارناموں وغیرہ کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

پاکستان ایک معجزہ :-

پاکستان اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے۔ پاکستان دنیا کا وہ پہلا اور واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ یہ شب قدر جیسی مقدس رات کو وجود میں آیا۔ پاکستان کے دارالحکومت کا نام اسلام آباد ہے۔ یہ وہ واحد دارالحکومت ہے جس کا نام ایک مذہب کے نام پر رکھا گیا ہے۔

ایک مثالی رہنما :-

اللہ تعالیٰ نے قائداعظم محمد علی جناح کی شکل میں جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کو ایک مثالی رہنما عطا کیا۔ قائداعظم کئی اعتبار سے اقوام عالم کے رہنماؤں سے منفرد تھے۔ قائداعظم کا کردار بے داغ تھا قائد اعظم کو نہ تو خریدا جا سکتا تھا اور نہ ہی جُھکایا جا سکتا تھا۔ اپنے اور غیر سب ہی ان کے معترف ہیں۔

دنیا کے اکثر رہنما اپنی تحریک آزادی کے دوران صرف ایک فریق سے لڑے۔اس کے برعکس قائد اعظم نے دو محاذوں پر جنگ لڑی۔ ایک طرف انگریز تھے اور دوسری جانب کانگریس۔ قائد اعظم پوری تحریک آزادی کے دوران پرامن رہے، انہیں کوشش کے باوجود بھی انگریز گرفتار نہ کر سکے۔

ایک منفرد کھلاڑی :-

جہانگیر خان، کھیلوں کی دنیا میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انہیں ۱۰ اپریل ۱۹۸۱ء سے ۱۰ نومبر ۱۹۸۶ء تک تقریباً ساڑھے پانچ سال کے دوران، دنیا کا کوئی کھلاڑی شکست نہیں دے سکا۔ اس عرصے میں انہوں نے مسلسل ۵۵۵ میچ جیت کر ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ جہانگیر نے صرف ۱۵ برس دس ماہ کی عمر میں ورلڈ امیچر اسکواش ٹورنامنٹ میں کامیابی حاصل کی۔ جہانگیر خان سب سے کم عمر ورلڈ چیمپئن ہیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۱ء کو جب انہوں نے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں منعقد ہونے والی ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ میں آسٹریلیا کے جیوف ہنٹ کو ہرایا تو ان کی عمر صرف ۱۷ برس ۳۵۴ دن تھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء کو انگلینڈ کے مقام چیچسٹر پر انہوں نے مصری کھلاڑی کمال عواد کو اسکواش کی تاریخ کے طویل ترین مقابلے میں شکست دی۔ وہ میچ دو گھنٹے پینتالیس منٹ تک جاری رہا۔ اس مقابلے کے پہلے گیم کا دورانیہ

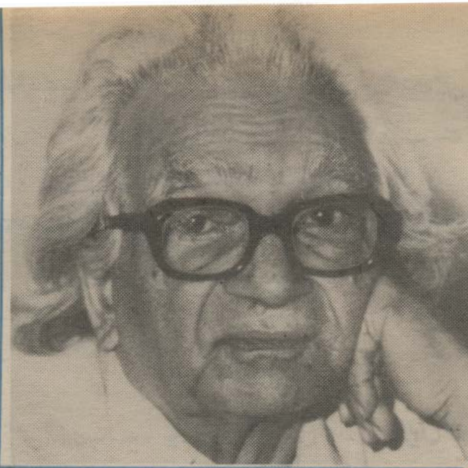

FIELD JURY
JURY

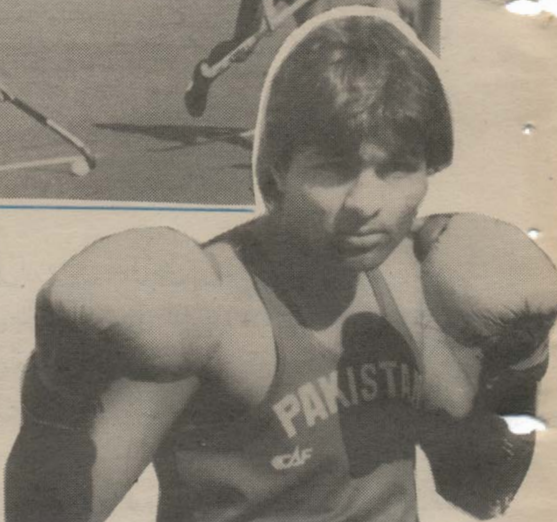

سترمنٹ تھا جو کہ اپنی جگہ ایک علیحدہ عالمی ریکارڈ ہے۔ جہانگیر خان نے برٹش اوپن اسکواش ٹورنامنٹ میں پہلی مرتبہ کامیابی ۱۹۸۲ء میں حاصل کی۔ وہ اس سال صرف ۱۸ برس ۱۱۹ دن کی عمر میں دنیا کے سب سے کم عمر برٹش چیمپئن بنے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۹۰ء، پاکستان اور جہانگیر خان کے لئے ایک اور روشن تاریخ تھی۔ انہوں نے اس روز برٹش اوپن اسکواش ٹورنامنٹ میں مسلسل نویں بار فتح حاصل کر کے ایک نئی تاریخ لکھی۔

دنیا کی وسیع ترین تہذیب :-

وادی سندھ کی تہذیب دنیا کی وسیع ترین تہذیب ہے۔ یہ تہذیب شمال میں شملہ کی پہاڑیوں اور افغانستان کے مقام "شرت گئے"، مشرق میں وسطی ہند، مغرب میں صوبہ بلوچستان کے مقام نوشہرو اور جنوب میں عمان تک پھیلی ہوئی ہے۔

ضلع لاڑکانہ میں واقع قدیم شہر موئن جو دڑو، اپنے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کا مجموعی رقبہ ۱۳۶ ہیکڑ ہے۔ اتنے وسیع رقبے پر دنیا کا کوئی اور شہر دریافت نہیں ہوا پانچ ہزار سال پہلے کا موئن جو دڑو آج کا کوئی ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا ہے۔ سادہ مگر باوقار اور پکی اینٹوں کے مکانات، گھروں کے قریب کنوئیں، چوڑی شاہرائیں، ڈھکی ہوئی نالیاں اور گندے پانی کی نکاسی کا مکمل نظام۔ ایسی شہری سہولیات دنیا کی کسی اور ہم عصر تہذیب میں نظر نہیں آتیں۔

اردو

اس وقت دنیا میں تقریباً پانچ ہزار زبانیں اور بولیاں، بولی جاتی ہیں۔ چینی دنیا کی قدیم ترین زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس کی عمر چھ ہزار سال سے بتائی جاتی ہے۔ چین کی مندارن (Mandarin) زبان دنیا میں سب سے زیادہ افراد بولتے ہیں جن کی تعداد تقریباً اسی کروڑ ہے۔

انگریزی زبان تقریباً پندرہ سو برس قدیم ہے۔ گنیز بک کے مطابق دنیا میں پچاس کروڑ افراد انگریزی بولتے اور سمجھتے ہیں۔

اردو زبان کی عمر تقریباً سات سو برس ہے لیکن اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے مطابق چینی اور انگریزی کے بعد اردو، دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان ہے۔

اردو کو درحقیقت دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان کا اعزاز حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے بولنے اور سمجھنے والے انگریزی کی طرح کثرت سے موجود ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق بھارت کے اسی کروڑ باشندوں میں سے پچاس کروڑ باآسانی اردو سمجھ لیتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت بھارت میں بننے والی فیچر فلمیں بھی ہیں جو عوام میں بڑی مقبول ہیں۔ وہ فلمیں اگرچہ ہندی فیچر فلمیں کہلاتی ہیں لیکن ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اصل میں اردو فلمیں ہیں جن میں ہندی الفاظ کی آمیزش ہوتی ہے۔

پاکستان، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں رابطے کی سب سے بڑی زبان اردو ہی ہے۔ بنگلہ دیش اور دیگر سارک ممالک میں بھی اردو اجنبی نہیں۔ مشرق وسطیٰ، امریکہ، کینیڈا، یورپ اور افریقہ میں برصغیر کے کروڑوں باشندے آباد ہیں جو اردو ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے دنیا میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کسی بھی طور پر ستر اسی کروڑ سے کم نہیں۔

ایک عجوبہ :-

پاکستان کے محمد عالم چنا، اس وقت دنیا کے دوسرے سب سے بلند قامت انسان ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے دنیا کے طویل ترین انسانوں کی فہرست میں موزنبیق کے گبرائیل ایستے واؤ مونجے اور لیبیا کے سلیمان علی ناش نش کے بعد تیسرا نمبر عالم چنا کو دیا۔ کچھ عرصے پہلے مونجے انتقال کر گئے اس لئے اس فہرست میں اب سلیمان علی ناش نش کے بعد دوسرا نمبر عالم چنا کا ہو گیا ہے۔

گنیز بک نے عالم چنا کے ساتھ بڑا مذاق کیا۔ ۱۹۸۴ء میں انہیں آٹھ فٹ ۲۶۷۵ انچ قد کے ساتھ دنیا کا طویل ترین انسان قرار دیا۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۸ء تک یہ تحریر کیا گیا کہ عالم چنا نے اپنے قد کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا تھا، ان کا اصل قد سات فٹ دس انچ ہے۔

۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں ان کا قد مزید دو انچ کم کر کے سات فٹ آٹھ انچ لکھا گیا۔

محمد عالم چنا کا اصل قد سات فٹ دس انچ ہے جو اس وقت دنیا کے سب سے لمبے آدمی لیبیا کے سلیمان علی ناش نش سے ۲۶۴ انچ کم ہے۔

۱۹۹۰ء کی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دنیا میں سب سے لمبا انسانی پیر، عالم چنا کا ہے، ان کے جوتے کا سائز بائیس ہے۔

ہاکی :-

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے ہاکی کے تینوں بڑے بین الاقوامی مقابلے .... اولمپک، ورلڈ کپ اور چیمپئنز ٹرافی جیتے۔ پاکستان نے ان ٹورنامنٹس میں ایک بار نہیں، کم از کم دو دو مرتبہ کامیابی حاصل کی۔

منفرد اعزاز :-

پاکستان .... دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں دنیا کے تین مشہور پہاڑی سلسلے .... ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش آپس میں ملتے ہیں۔ پاکستان کوہ پیماؤں کی جنت ہے۔ پاکستان کے شمال میں صرف ۲۵ کلومیٹر کے رقبے میں ۳۵ پہاڑ ایسے ہیں جن کی بلندی ۲۴ ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ کے۔ ٹو، دنیا کا دوسرا سب سے بلند پہاڑ ہے اس کی بلندی اٹھائیس ہزار دو سو پچاس فٹ ہے۔

پاکستان .... جنت ارضی ہے۔ پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہے؟ قدرت کی یہ فیاضیاں دیکھ کر، دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

”تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“

MASS

لہو کے چراغ

مرسلہ:- ناصر محمد

پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہندو غنڈوں اور بلوائیوں نے مسلمانوں کی بستیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے بے دریغ مسلمانوں کو قتل کیا، عورتوں کو اغوا کیا اور ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے کہ ان کی تفصیل سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے واقعات کی تفصیل اردو کے ایک نامور ادیب مرتضیٰ احمد خان میکش کی کتاب "اخراج اسلام از ہند" میں ملتی ہے۔ اس کتاب سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں جو ان لوگوں کی زبانی ہیں جو ان واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان اقتباسات کو پڑھئے اور سوچئے کہ پاکستان بنانے میں مسلمانوں کو آگ اور خون کے کتنے سمندروں سے گزرنا پڑا ہے۔

جموں کے فسادات کی خبر پہنچی تو وہاں کے فرعون صفت جاگیر دار نے حکم دیا کہ مسلمان جہاں ملیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ صرف تین دن کے اندر اندر یہ علاقہ مسلمانوں سے صاف ہو گیا۔ فوج اور پولیس مکانوں کو آگ لگاتی اور غنڈے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی لڑکیاں اٹھا کر جاگیرداروں اور فوجی افسروں کی نذر کرتے۔ جاگیردار صاحب نے خود ان جگہوں کا معائنہ کیا جہاں مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں قتل کیا گیا تھا۔ کئی مقامات پر ایسے زخمی مسلمان تڑپتے ہوئے دکھائی دیئے۔ حکم دیا کہ انہیں زندہ زمین میں گاڑ دیا جائے اور ایک جگہ بہت سے نیم جان مسلمانوں کو جمع کر کے ان پر پٹرول چھڑکا اور آگ لگا دی۔ اس سفاک انسان نے مسلمانوں کی نعشوں کے ٹکڑے پالتوں کتوں کو کھلائے۔ نابالغ بچیوں کے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک کیا گیا کہ ان کی چیخیں آسمان تک جا پہنچی۔ ان ہنگاموں میں میرے بہت سے رشتے دار شہید ہوئے۔ باپ، بھائی، بہنیں، بچے، ماموں غرض بوڑھی والدہ کے سوا کوئی زندہ نہ بچا۔ والدہ کو لے کر سیالکوٹ آرہا تھا راستے میں جدھر نظر اٹھتی انسانی اعضاء دکھائی دیتے۔ کتے اور گدھ مسلمانوں کی لاشوں سے پیٹ بھر رہے تھے۔ (منشی صدیق احسن)

ہندو کسی کا دوست نہیں

اونہ ضلع ہوشیار پور میں میری کتابوں کی دکان تھی۔ ہوشیار پور میں فسادات کا آغاز ہوتے ہی غنڈوں نے اونہ میں لوٹ مار شروع کر دی۔ نقدی اور زیورات اپنے قبضے میں کر لئے اور جائدادیں نذر آتش کر دیں۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو جلتی ہوئی دکانوں اور مکانوں میں جھونک دیا گیا۔ سینکڑوں بندگان خدا آگ میں جل گئے۔ میں دکان میں بیٹھا تھا ایک شخص نے آکر بتایا کہ تمہارے گھر کو آگ لگا دی گئی ہے۔ بھاگم بھاگ پہنچا۔ دیکھا گھر کے تمام افراد بھسم ہو چکے ہیں صرف دو سال کا لخت جگر زندہ ہے اور ایک کونے میں گھائل پڑا ہے۔ اسے اٹھایا اور سینے سے لگا کر باہر آگیا۔ گوشت جلنے کی بُو ابھی تک آرہی تھی۔ یہ میرے عزیز و اقارب کے گوشت کی بو تھی۔ کبھی وہ بھی ہنستے کھیلتے اور جیتے جاگتے تھے۔ مشکل سے آنسو پیئے اور معصوم بچے کو کندھے پر رکھ کر دکان کی طرف گیا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے

آنکھوں کے سامنے ایسا اندھیرا تھا کہ لاکھوں سورج مل کر بھی اسے اجالے میں تبدیل نہ کر سکتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ لیکن سوچتا تھا کہ دشمن نے ایک قطرۂ اشک بھی دیکھ لیا تو آنکھیں پھوڑ دے گا۔ دکان کے قریب چند غنڈے دکھائی دیئے۔ میں نے فوراً ننھے کو چادر میں چھپا لیا مگر خونخوار درندوں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ لپکے اور جھپٹ کر اسے چھین لیا۔ ننھا چیخا "اباّ اباّ" میں نے موذیوں کی بڑی خوشامد کی ان کے پاؤں چھوئے واسطے دیئے مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ الٹا ڈنڈے مار مار کر مجھے لہولہان کر دیا۔ پھر انہوں نے آپس میں کچھ اشارے کئے اور ایک نے ننھے کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ ننھا بلبلا اٹھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا پھر ایک بھیڑیا آگے بڑھا اس نے چھری کے ساتھ میرے نظر نور کا بازو کاٹ لیا۔ دوسرے ملعون نے اس کی ناک الگ کر دی تیسرے نے ٹانگ پر وار کیا وہ آہستہ آہستہ اس کے اعضاء کاٹتے اور وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتے رہے۔ اس طرح ظالموں کی سختیاں سہتے ہوئے معصوم اور بے گناہ بچے نے اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد کر دی............ اپنا جگر گوشہ کٹوا کر دکان پر آیا۔ غنڈوں نے ساری کتابیں پھاڑ کر بازار میں پھینک دی تھیں۔ قرآن مجید کے اوراق زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں شدید بے چارگی کے عالم میں کھڑا تھا کہ بلوائیوں کی ایک اور ٹولی آئی اور میرے سامنے دکان پر پٹرول پھینک کر آگ لگا دی۔ اس پارٹی میں میرا ایک ہندو دوست بھی تھا جس سے میری بڑی بے تکلفی اور برسوں کے تعلقات تھے۔ جونہی میری اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں وہ مسکرایا میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اس نے لاٹھی کی ایک ضرب سے سلام کا جواب دیا۔ جب میں اس ضرب سے کراہا تو میرے "دوست" نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ (سعید الدین)

ظلم کی انتہا ہو گئی

حصار میں سکھ درندے معصوم بچوں کو نہایت بے دردی سے قتل کرتے تھے بعض بچوں کو گلا گھونٹ کر مارا گیا، کئی بچے اس طرح شہید کئے گئے کہ سکھ غنڈے بچے کی ایک ٹانگ پاؤں سے دبا کر دوسری زور سے کھینچتے اور ننھے معصوم کے دو ٹکڑے کر دیتے۔ ایک جگہ سات بچوں کی لاشیں دکھائیں دیں۔ انہیں دیکھا بھالا تو معلوم ہوا کہ ظالموں نے بچوں کے نازک جسموں کو کسی تیز اوزار سے جا بجا چھیدا ہے۔ یقیناً یہ بچے تڑپ تڑپ کر مرے ہوں گے۔ (محمد شرف الدین)

☆

Snowhite

Steps ahead in Drycleaning - Always.

ہیڈ آفس: عبداللہ ہارون روڈ۔ ۵۱۱۷۱۱ , ۵۲۶۵۳۹

شاخیں: • سنو وہائٹ چیمبرس سینٹرل کمرشل ایریا۔ بہادر آباد۔ ۴۱۳۶۹۵

کراچی: • عثمان منزل، محمد بن قاسم روڈ (برنس روڈ)۔ ۲۱۳۳۳۶

• کلفٹن عقب میکسزم۔ ۵۷۳۲۹۸

• ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی برانچ۔ ۵۲۶۵۳۹

• گرومندر نیو ٹاؤن۔ ۴۱۱۳۰۲

• گارڈن روڈ نزد مبینو سینما۔ ۷۲۲۴۳۳

• پاریا اسٹریٹ کھارادر۔ ۲۰۴۱۷۵

• سنو وہائٹ کمپلیکس شارع فیصل / شہید ملت روڈ۔ ۴۴۶۶۸۲

• کلیٹن روڈ، جمشید روڈ۔ ۴۱۱۳۰۲

ملتان: • ملتان قاسم روڈ، ملتان کینٹ۔ ۷۲۷۸۰

لاہور: • لبرٹی مارکیٹ، بالمقابل لبرٹی پلازہ۔ ۸۷۴۹۳۳

• ڈیفنس، مسجد چوک۔

راولپنڈی: • مال روڈ، الاین پلازہ بالمقابل کنٹونمنٹ بورڈ آفس ۶۷۹۸۸

Snowhite

DRY CLEANING INDUSTRIES

Karachi - Multan - Lahore - Rawalpindi

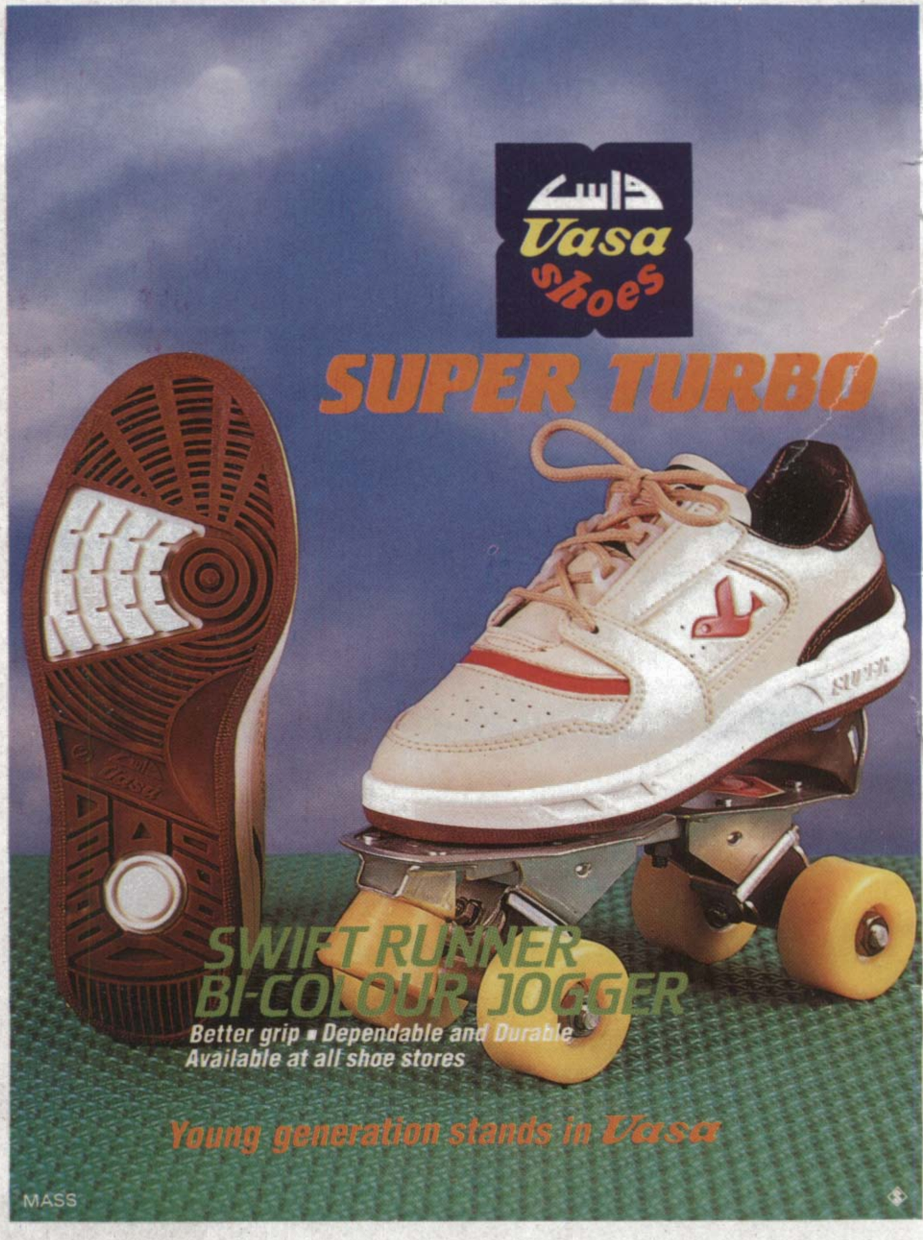

واسا
Vasa
shoes
SUPER TURBO
SWIFT RUNNER
BI-COLOUR JOGGER
Better grip ■ Dependable and Durable
Available at all shoe stores
Young generation stands in Vasa
MASS

میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا

متین الرحمٰن مرتضٰی

یہ پاکستان جس پر ہم کبھی فخر کرتے ہیں اور کبھی اس کے حالات سے پریشان اور مایوس ہوتے ہیں اور جو اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ہمیں بہت پیارا لگتا ہے اس لئے کہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ یہ ملک ہمیں بس یوں ہی بہت آسانی سے نہیں مل گیا تھا۔ اسے ہم مملکت خداداد یعنی خدا کا دیا ہوا ملک کہتے ہیں اور بلاشبہ یہ ملک ہے بھی اللہ کا انعام۔ مگر اللہ نے یہ انعام دینے سے پہلے اس قوم کو آزمایا ضرور تھا جسے یہ ملک دیا جا رہا تھا۔ یعنی ہمارے آباؤاجداد جنہوں نے ہمارے لئے اور ہم سے بعد آنے والے اور اس ملک میں پیدا ہونے والی تمام نسلوں کے لئے یہ ملک بنایا ایک بہت بڑی آزمائش سے گذرے تھے تب یہ ملک بنا تھا۔ انہیں یہ ملک بنانے کے لئے اپنے خون میں نہانا پڑا تھا آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑا تھا۔ تب ہی اس ملک میں آزادی کی صبح دیکھنا نصیب ہوئی تھی۔

میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جنہوں نے یہ ملک بنایا تھا۔ میں اس وقت محض سات سال کی عمر کا بچہ تھا البتہ میں نے اس نعرے کو سچ کا روپ دھاتے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا تھا کہ "بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان۔" میں نے اپنے ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ جس کی عمر پانچ سال تھی ہندوستان سے پاکستان کا سفر والدین کے بغیر کیا تھا۔ یہ سفر آگ و خون کے دریاؤں، دم توڑتی زندگی کی سسکیوں کی سرگوشیوں اور موت کی وادیوں میں سے گذر کر پورا ہوا تھا۔ آیئے آج میں آپ کو اپنے اس سفر کی کہانی سناؤں تاکہ آپ کو احساس ہو کہ اس ملک کو قائم رکھنے کے لئے آپ پر کتنی بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ اس ملک کو بنانے کے لئے آپ کے آباؤ اجداد نے کتنی کچھ قربانیاں دی تھیں۔

(۱)

ابا جان، امی جان اور ہم پانچ بہن بھائیوں پر مشتمل سات افراد کا گھرانہ، مشرقی پنجاب کی سکھ ریاست پٹیالہ کے تاریخی مقام بھٹنڈہ میں آباد تھا۔ ابا جان بھٹنڈہ میونسپلٹی میں داروغہ صفائی (سینیٹری انسپکٹر) کی حیثیت میں ملازم تھے۔ ہمارے محلے میں چند گھر سکھوں کے، دو چار ہندوؤں کے اور باقی سب مسلمانوں کے تھے۔ اس وجہ سے یہ مسلمانوں کا محلّہ کہلاتا تھا۔ جس مکان کی بالائی منزل میں ہم رہتے تھے وہ کرائے کا تھا۔ نچلی منزل میں مالک مکان رہتے تھے۔

یہ ۱۹۴۷ء کا اگست تھا۔ میری عمر کا ساتواں سال۔ موسم ابھی گرم ضرور تھا۔ مگر گرمی کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ رمضان گذر رہے تھے اور ہم بہن بھائیوں کو عید کا شدت سے انتظار تھا۔ اب کی عید کا موسم کچھ عجیب تھا۔ جیسے جیسے عید قریب آرہی تھی، ویسے ویسے نیچے گلی میں نعروں کا مقابلہ بڑھ رہا تھا۔ روز دو تین چھوٹے چھوٹے جلوس گلی سے گذرتے تھے۔ جنہیں ہم بہن بھائی گلی میں کھلنے والی کھڑکی سے بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتے تھے۔ جے ہند، پاکستان زندہ باد، ست سری اکال۔ اللہ اکبر کے نعرے ہم نے ان ہی دنوں سنے اور سیکھے۔

یہ روز کا تماشا تھا، دلچسپ تھا مگر عید کا انتظار ان سب سے زیادہ پر شور تھا۔ عید کی تیاری اگرچہ گھر میں ہورہی تھی، ہمارے نئے کپڑے بھی سلے تھے، جوتے بھی آگئے تھے مگر کچھ ایسی فضا تھی کہ عید کا انتظار شاید صرف ہم بچوں کو تھا۔ بڑے عید سے بے نیاز تھے۔ بڑے آپس میں بیٹھ کر کیا باتیں کرتے۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کی باتوں میں ایک ہی لفظ بار بار آتا تھا جو ہم نے نعروں سے سیکھ لیا تھا۔ پاکستان!

بالآخر چاند رات آگئی۔ ہم بچے عید کی صبح کے انتظار میں جلدی سو گئے۔ مگر آدھی رات کو نہ جانے کیسا اودھم مچا کہ ہم سب کی آنکھ کھل گئی۔ گلی میں سامنے والی مسجد میں، نچلی منزل کے صحن میں

بہت سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ لوگ اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے ہم حیران تھے کہ یہ آدھی رات کو کیا ہوا۔ لوگ اٹھ کر کیا باتیں کر رہے ہیں۔ سب باتیں تو سمجھ میں نہیں آئیں۔ بس اتنا پتا چلا کہ شہر میں لوگ سینما گھر میں فلم دیکھ رہے تھے کہ بم پھٹا۔ کچھ مرے کچھ زخمی ہوئے۔ لوگ ننگے پاؤں بھاگے، کچھ گرے، کچھ روندے گئے۔ مرنے اور زخمی ہونے والے اکثر مسلمان تھے۔

صبح کو عید تو ہوگئی مگر عید جیسی نہیں۔ ابا جان ہمیں ساتھ لے کر ہمیشہ کی طرح عید گاہ گئے۔ راستے سے کھلونے خریدنے کا پروگرام ہی نہیں اور بہت کچھ نہیں ہوا۔ دن بھر لوگ گلی میں جمع رہے۔ شام تک ہجوم بہت بڑھ گیا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ آکر ہمارے محلے اور گلی میں جمع ہو رہے تھے۔ گھروں سے چارپائیاں نکال کر گلیوں میں بچھا دی گئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے تھے۔ بہت سے کھڑے بھی تھے۔ دو تین دن کچھ ایسے ہی گذرے۔ محلے میں ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ صبح دوپہر شام ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ یہ دراصل شہروں میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے فسادات سے بے گھر ہونے والے مسلمان تھے جو ہمارے محلے میں آکر جمع ہوگئے تھے۔ روز بہت سا کھانا پکتا تھا۔ سب کھاتے تھے۔ پھر کھانا پکنا ختم ہوگیا۔ کیونکہ گھر میں جو کچھ تھا وہ ختم ہوگیا تھا کئی وقت کھانا کہیں اور سے آتا رہا۔ سب کو تھوڑا تھوڑا ملتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کھانا نہ گھر میں پکا نہ باہر سے آیا۔ بس ایک مٹھی کچے چاول چنوں یا دالوں کی مل گئی گڑ اور پانی سے کھالیا۔ اور بس۔

بڑے عجیب سے دن تھے۔ بچے بے پرواہ اور بے خوف، مگر بڑے گھبرائے گھبرائے اور خوفزدہ سے۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ محلے ہی میں گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گلی میں شور ہونے لگا۔ لوگ چیخ چیخ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ فائرنگ ہیرا سنگھ جی نے اپنی چھت سے کی ہے۔ تھوڑی دیر میں ابا جان، ان کے دوست سکندر شاہ جو پولیس میں تھے، کچھ دوسرے لوگ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی وردیاں پہنے ہوئے تیزی سے گلی سے اوپر آئے اور دوسری چھپ پر اوپر چلے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ پھر ہماری چھت سے بھی گولیاں چلنے لگیں۔ یہ وہ پہلا دن تھا کہ جب بڑوں کی طرح بچے بھی گھبرائے گھبرائے اور خوفزدہ رہنے لگے۔

گولیاں چلتے رہنا معمول ہوگیا۔ محلے میں ہجوم اور بڑھ گیا۔ نہ جانے کس نے اپنی بکری لا کر ہمارے صحن میں باندھ دی تھی۔ عصر کا وقت تھا۔ میں اور معین (چھوٹا بھائی) صحن میں کھیل رہے تھے۔ معین پڑوس کی چھت اور ہمارے صحن کے درمیان والی نیچی سے دیوار پر لٹک کر برابر کے مکان میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک گولی چلنے کی آوازیں شروع ہوئیں میں نے دیوار سے لٹکے ہوئے معین کو پیروں

سے پکڑ کر جلدی سے نیچے گھسیٹا اور جیسے ہی معین کے پیر زمین پر ٹکے، منڈیر کی اوپری تہہ والی اینٹ، پر گولی لگی اور اینٹ ٹوٹ کر آدھی پڑوس والوں کی چھپ پر اور آدھی ہمارے صحن میں گری۔ ابا جان صحن سے گذر رہے تھے۔ ایک گولی ان کے سر کے قریب سے گذر کر صحن میں کھڑی ہوئی بکری کے پیر میں لگی اور ایک گولی سے صحن میں پھرتی ہوئی مرغی کے چیتھڑے اڑ گئے۔ ابا جان ہم دونوں بھائیوں کو گھسیٹ کر فرش پر اوندھے لیٹ گئے۔

ہمارے گھر میں پانی بالکل نہیں رہا تھا۔ محلے کے بیشتر گھروں میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ محلے کی مسجد کے دستی نلکے کا کھارا پانی تھوڑا تھوڑا سب گھروں میں پہنچایا جاتا تھا جو ایک ایک گھونٹ پینے کو ملتا تھا۔ بچے یہ کھاری پانی پینے کو تیار نہ تھے۔ جو پی رہے تھے ان کے پیٹ خراب ہو رہے تھے ہمارے ہی گھر میں ایک چھوٹی بچی کی طبیعت دو تین روز سے خراب تھی بار بار پانی مانگتی تھی۔ مگر کھاری بد مزہ پانی اس سے پیا نہیں جا رہا تھا اور بالا آخر وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ یہ ان دنوں ہمارے گھر میں ہونے والی پہلی موت تھی۔ اس بچی کو دفنانا ایک مسئلہ بن گیا۔ میت کو کہاں غسل دیا جائے، کہاں جنازہ پڑھایا جائے کہاں دفنایا جائے۔ بچی کی لاش کو بستر کی چادر میں لپیٹ کر چھوٹے سے کھٹولے پر رکھا گیا اور کھٹولے کو چاروں پایوں سے رسی باندھ کر اسے برابر والے مکان کے صحن میں اتارا گیا جس طرح کنویں میں ڈول اتارا جاتا ہے اور پھر صحن میں اس کو دفنا دیا گیا۔

ایک دن اچانک گولیوں کی ایسی برسات شروع ہوئی کہ سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے دروازے چھلنی ہو گئے۔ ہم بچوں کو جلدی سے امی جان نے فرش پر لٹا دیا اور وہ ہمارے اوپر لیٹ گئیں۔ سب ہی ماؤں کی یہی کیفیت تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں بہت سے بچے اور عورتیں اوندھے پڑے تھے اور جس کے ہاتھ جو لگا وہ اس نے اپنے اوپر ڈال لیا تاکہ گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے دروازوں کو چھلنی کر کے اندر آنے والی گولیوں سے محفوظ رہ سکے۔ کھڑکیوں کے شیشے اور کھڑکیوں کے سامنے کی دیواری کارنر پر رکھے ہوئے چینی کے برتنوں کے ٹکڑوں سے کمرے میں موجود بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ خوف کے سبب اکثر بچوں کا پیشاب خطا ہو جانے، گرمی پسینے اور بارود کی بو سے کمرے میں حبس اور تعفن پھیلا ہوا تھا۔

گولیوں کی برسات تھمی تو زینے سے کسی کی آواز آئی کہ سب بچے اور عورتیں زینے کی طرف رینگ کر آئیں تاکہ نیچے اتر سکیں۔ ہم امی جان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئے تو وہاں کوئی صاحب لمبا سا چاقو ہاتھ میں لئے موجود تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو پکار کہا کہ کافروں کے ہاتھوں بے عزت ہونے سے بہتر ہے کہ خود اپنے آپ کو ختم کر لیا جائے۔ کسی عورت نے ان کے ہاتھ سے چاقو چھین کر تسلی

دی۔ خودکشی کا مشورہ پانے والی بیوی بیچاری بڑی خوف زدہ تھی اور رو رہی تھی۔
جیسے تیسے ہم گلی میں اس طرح پہنچے کہ ہمارے پیروں میں جوتے اور امی جان کے سر پر دوپٹہ تک نہ تھا۔ ہم بچوں اور عورتوں کو محلے کے ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ اس روز رات کے تیسرے پہر میں محلے میں جمع سب مسلمان قافلے کی صورت میں نکلے۔ یہ ہمارے سفر پاکستان...... یعنی سفر آزادی کا آغاز تھا۔

(۲)

جب سفر شروع ہوا تو رات ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ البتہ چاند مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ قافلہ شہر سے نکل کر باہر ویرانے میں پہنچا تو نہ جانے کس بات پر بھگدڑ سی مچ گئی۔ اور اسی افراتفری میں میرا اور میرے چھوٹے بھائی معین کا ساتھ اپنے والدین سے چھوٹ گیا۔ قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ قافلے کا ایک حصہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا اور دوسرے حصے نے ایک قریبی گاؤں کا رخ کیا جو مسلمانوں کا تھا۔ ہم دونوں بھائی قافلے کے اس حصے کے ساتھ ہو گئے جس کا رخ گاؤں کی طرف تھا۔ والدین میرے بھائی اور بہن کے ساتھ اس قافلے میں رہے جو اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔
ہم دونوں بھائی قافلے کے جس حصے کے ساتھ تھے اس میں مرد کم اور بچے عورتیں زیادہ تھیں۔ سب نہتے تھے۔ اس قافلے میں دیکھے بھالے چہرے تو بہت تھے مگر اچھی طرح پہچانے جانے اور قریبی تعلق والے لوگوں کی تلاش تھی۔ اسی تلاش میں ابا جان کے ایک دوست سلطان چچا مل گئے جو ریلوے میں ملازم تھے اور ہمارے محلے دار تھے۔ ان کے ساتھ چچی اور امین اللہ (سلطان چچا کی بیوی اور بیٹا) بھی تھے۔ یہ امین اللہ ہمارے ہم جماعت اور دوست بھی تھے۔ سلطان چچا نے ہم دونوں بھائیوں کو اکیلا دیکھ کر ہمارے ہاتھ تھام لئے۔
چاند پیلا ہو کر آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ اور رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ ہم جہاں سے گذر رہے تھے وہ ناہموار میدانی علاقہ تھا جو سرکنڈوں کی چھوٹی بڑی جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں کٹی ہوئی تھیں اور کٹے ہوئے سرکنڈوں کے گٹھے زمین پر کھڑے یا پڑے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں سرکنڈے کی ان جھاڑیوں سے گذرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہاتھوں اور چہروں پر خراشیں آ رہی تھیں۔
اچانک کسی موٹر کی آواز نے ایک بار پھر قافلے میں بھگدڑ پیدا کر دی۔ لوگ جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ سلطان چچا نے ہم لڑکوں کو زمین پر لٹا کر کٹے ہوئے سرکنڈوں کے گٹھے کھول کر ہم پر اس طرح پھیلا دیئے کہ ہم ان کے نیچے چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز غائب ہو گئی تو ہمیں سرکنڈوں کے ڈھیروں سے نکالا گیا۔ جسم کے تمام حصے سرکنڈوں کی پھانسوں کی چبھن سے جل رہے تھے۔ اور کہیں کہیں سے

خون بھی رس رہا تھا۔
صبح قریب ہوئی تو اندھیرا کچھ کم ہوا اور پتہ چلا کہ ہم جھاڑیوں والے علاقے کو چھوڑ کر اب کسی نہر کے کنارے چل رہے تھے۔ اچانک پیچھے سے چچی کے چیخنے کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو تھک کر پیچھے رہ جانے والی چچی چار پانچ سکھوں کے گھیرے میں تھیں۔ چچی نے بچنے کے لئے نہر میں چھلانگ لگادی تھی اور ایک سکھ بالوں سے پکڑ کر انہیں نہر سے باہر کھینچ رہا تھا۔ سلطان چچا تیزی سے پیچھے پلٹے اور ایک بے دھیان کھڑے سکھ سے گنڈاسا چھین کر انھوں نے بالوں سے چچی کو پکڑ کر کھینچنے والے سکھ پر حملہ کر دیا۔ دوسرے سکھ ان پر جھپٹے۔ کچھ مسلمان ہمارے قافلے سے چچا کو بچانے کے لئے بڑھے۔ اور دو بدو لڑائی ہونے لگی۔ قافلے کے بچے اور عورتیں خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگے اور سب بکھر گئے۔
صبح کا اجلا اچھی طرح پھیل گیا تو بکھر جانے والے پھر اکٹھے ہو گئے۔ مگر ان میں سلطان چچا، چچی اور امین اللہ کہیں دکھائی نہ دیئے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی غائب تھے۔ سفر پھر شروع ہوا۔ سورج چڑھ آیا تو ہم سب ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ یہ شاید وہی گاؤں تھا جہاں پہنچنے کے لئے سب قافلے والے چلے تھے۔ جب ہم لوگ گاؤں میں داخل ہونے والی گلی کی نکڑ پر پہنچے تو اچانک ننگی پنڈلیوں تک لمبے پیلے چغے پہنے ہوئے سکھوں کا جتھا خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں لئے گاؤں کی گلی سے باہر نکلا۔ ان کی بغلوں میں ننگی کرپانیں لٹک رہی تھی۔ ان کے کپڑوں اور ہاتھوں پر خون کے دھبے تھے۔ ان ننگی خون آلود تلواروں والے سکھوں کو دیکھ کر بچے اور عورتیں سب بری طرح سہم گئے۔ جس مسلمان گاؤں میں ہم پناہ لینے پہنچے تھے وہاں کوئی مسلمان ہمارے استقبال کے لئے زندہ نہیں بچا تھا۔
ہمیں سکھوں نے گھیرے میں لے کر گاؤں سے کچھ دور ہٹا دیا۔ گھیرے کے اندر ایک سکھ پاگلوں کی طرح ڈھول پیٹ رہا تھا کبھی کبھی سنکھ بھی بجایا جا رہا تھا۔ ہم سب خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے اور کس بات کا انتظار ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں گاؤں سے دھواں اٹھنے لگا۔ ہم پر راکھ برسنے لگی اور فضا میں بڑی خراب بدبو پھیلنے لگی۔ جن بڑے بوڑھوں کو پتہ چل گیا کہ یہ گاؤں میں شہید کئے جانے والے مسلمانوں کی جلتی ہوئی لاشوں کی بو ہے۔ گوشت کے جلنے کی بدلو ہے تو وہ بے تحاشا رونے لگے۔
پاگلوں کی طرح پیٹے جانے والے ڈھول کی ہیبت ناک آواز، دھوئیں آگ اور جلتی لاشوں کی بو، برستی راکھ اور بھوکے سے بلکتے قافلے کے بچوں کے رونے کی آواز اور سکھوں کے خوفناک نعروں سے ایسا خوف پھیل رہا تھا کہ بدن لرز رہے تھے اور ہوش اڑ رہے تھے۔ اچانک ایک لمبے تڑنگے اور بڈھے سکھ نے قافلے کی ایک نوعمر ماں کی گود میں شیر خوار بچے کی پیٹ میں تلوار بھونکی اور بچے کو تلوار کی نوک پر فضا میں بلند

کر دیا۔

ننھی سی جان سے خون کا فوارہ ابلا اور اس معصوم کا خون ہر طرف بکھر گیا۔ بچے کی ماں بری طرح چیخ کر اپنے بچے کو چھیننے اور سنبھالنے کے لئے جھپٹی مگر پلک جھپکتے میں کسی دوسرے سکھ کی تلوار نے ایک ہی جھٹکے میں اس بدنصیب ماں کا سر تن سے جدا کر کے اسے دکھوں سے آزاد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام سکھ پاگل ہو کر ناچنے لگے۔ ہر طرف بجلی کی سی لہراتی چمکتی تلواریں اور ان سے کٹتے ہوئے انسانی جسم دکھائی دیئے۔ قافلے والے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ ہم بچے اتنے چھوٹے قد والے تھے کہ تلواروں کی زد میں نہیں آئے۔ یا پھر شاید گرتی لاشیں ہمیں بچا گئیں۔ البتہ خون میں نہا ضرور گئے۔ میں یہ خوفناک منظر دیکھنے کے لئے ایک دو منٹ سے زیادہ ہوش میں نہیں رہا۔ کوئی مجھ پر گرا اور پھر مجھے کچھ پتہ نہ رہا کہ میں کہاں ہوں اور کیا ہو رہا ہے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرا سر ایک لاش کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میرے منہ، ناک اور آنکھوں میں گرم ریت سے جلن ہو رہی تھی اور دماغ بری طرح جھنجھنا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے ریت میں دھنسا ہوا سر اور چہرہ لاش کے نیچے سے نکالا۔ مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا اور پے در پے چھینکیں آ رہی تھیں۔ چھینکوں کا سلسلہ رکا اور آنکھوں میں جلن کچھ کم ہوئی تو مجھے چھوٹے بھائی معین کی تلاش اور فکر ہوئی۔ قریب ہی میں مجھے معین نظر آیا۔ اس کے اوپر بھی ایک لاش پڑی تھی۔ اور وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ میں نے بڑی کوشش اور قریب ہی ایک زخمی کی مدد سے معین کو لاش کے نیچے سے نکالا۔ اب جو ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو پتہ چلا کہ جس جگہ سکھوں کے گھیرے میں ہمارا قافلہ کھڑا تھا وہاں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کچھ لوگ زندہ تھے مگر ہم دونوں بھائیوں کو چھوڑ کر سب ہی بری طرح زخمی تھے۔ اور اٹھنے یا کھڑے ہونے کے لائق نہیں تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج بالکل سر پر تھا۔ کوئی سکھ یا چلتا پھرتا انسان دور تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔

معین بھی ہوش میں آ گئے۔ ہمیں کھڑا اور چلتا پھرتا دیکھ کر کئی پیاسے زخمیوں نے پانی مانگا۔ پانی کہاں سے لایا جائے۔ اور کیسے پلایا جائے یہ مشکل ایک زخمی نے یہ سمجھا کر حل کر دی کہ چند قدم کے فاصلے پر کھیتوں کو پانی دینے والا نالہ ہے۔ اس پانی میں اپنی قمیص کے دامن بھگو کر پیاسوں کے منہ میں نچوڑ دو۔ ہم دونوں بھائی بہت دیر سے اس خدمت میں مصروف رہے۔ کئی زخمیوں نے پانی پی کر ہمارے سامنے دم توڑ دیا۔

اسی مصروفیت میں دن ڈھل گیا۔ پھر اچانک کسی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ کسی بیل گاڑی کی آواز تھی۔ ایک زخمی نے ہمیں سمجھایا کہ چپ کر کے لاشوں کے ساتھ لیٹ جاؤ۔ بیل گاڑی پر چار پانچ سکھ

آ ئے تھے۔ جنھوں نے لاشیں اٹھا کر بیل گاڑی میں لادنا شروع کیں۔ خوف کے مارے ہمارا برا حال تھا۔ بیل گاڑی کے دوبارہ چلنے کی آواز نے تھوڑا سا اطمینان پیدا کیا۔ قریب پڑے ہوئے زخمی نے پوچھا کیا وہ چلے گئے؟ ہم نے اٹھ کر دیکھا تو بیل گاڑی تھوڑی دور جا کر رک گئی۔ اور وہاں بیل گاڑی سے لاشیں اتار کر ایک طرف پھینکی جانے لگیں۔ یہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم نے سوچا سکھوں کے ہاتھوں مر کر وہاں پہنچنے سے بہتر ہے کہ آنکھ بچا کر خود ہی وہاں پھینکی جانے والی لاشوں میں جا چھپیں تا کہ مارے نہ جاسکیں۔

جیسے تیسے لاشوں میں تو جا گھسے مگر تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ لاش پر لا کر مٹی ڈالی جارہی ہے۔ اب زندہ مٹی میں دفن ہونے کے خوف سے ہمارا برا حال تھا۔ مگر پھیلتے ہوئے اندھیروں نے ہماری مدد کی اور ہم لاشوں سے نکل کر کچھ دور نظر آنے والے کھیتوں میں جا گھسے۔ یہ باجرے کے کھیت تھے جن میں ہمیں کئی دن تک چھپے رہنا پڑا۔

پاکستان کیوں بنایا؟

(ا) ایران میں کون رہتا ہے؟ ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے .... انگلستان میں کون رہتا ہے؟ انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے .... فرانس میں کون رہتا ہے؟ فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے یہ کون سا ملک ہے؟ یہ پاکستان ہے .... اس میں پاکستانی قوم رہتی ہے؟ نہیں .... اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی .... اس میں پنجابی قوم رہتی ہے .... اس میں سندھی قوم رہتی ہے .... اس میں یہ قوم رہتی ہے .... اس میں وہ قوم رہتی ہے۔ لیکن .... پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں .... سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں .... بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں .... پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟ غلطی ہو گئی معاف کر دیں .... آئندہ نہیں بنائیں گے۔ (ابن انشاء)

مرسلہ کرن امیر خان۔ کراچی

خادم ہوں وطن کا

شاہنواز فاروقی

مدّت سے تمنّا تھی مری روح و بدن کی
خدمت کروں جی جاں سے میں اپنے وطن کی

پر میری سمجھ میں کبھی آتا نہ یہ قصّہ
کس طور میں لوں ملک کی تعمیر میں حصّہ؟

دل کہتا کبھی مجھ سے سیاست میں ہے خدمت
ملتی ہے اسی راہ سے بندے کو قیادت

اور کہتا کبھی چھوڑ سیاست میں ہے الجھن
بس باندھ کمر اور تو ایدھی کی طرح بن

پھر یہ بھی خیال آتا مرے ذہن میں اکثر
یہ سب تو بڑی عمر کے لوگوں کے ہیں چکّر

حل مجھ سے ہوا جب نہ یہ پیچیدہ معمّہ
اکتا کے بہت، خدمتِ استاد میں پہنچا

سُن کر کہا استاد نے میری یہ کہانی
سمجھے ہیں غلط آپ نے خدمت کے معانی

کرتے ہیں جو حاصل میاں تعلیم لگن سے
وہ لوگ بھی سو فیصدی خادم ہیں وطن کے

رکھتے ہیں صفائی جو یہاں روح و بدن کی
وہ لوگ بھی مصروف ہیں خدمت میں وطن کی

ہے جھوٹ سے نفرت جنہیں اور سچ سے محبت
اک طرح سے کرتے ہیں وہ سب ملک کی خدمت

اور وہ جو فقط سوچتے ہیں بابِ وطن میں
شامل ہیں وہ سب لوگ بھی خدمت کے چلن میں

تقریر بڑی دیر تلک کرکے زبانی
پھیلا دیئے استاد نے خدمت کے معانی

یہ سوچ کے اب حال عجب ہے مرے من کا
میں شوق سے پڑھتا ہوں سو خادم ہوں وطن کا

ٹوٹا ہوا پُل

طاہر مسعود

اس نے اپنے آپ کو آگے کی جانب گھسیٹا۔
خون کی ایک لکیر آنکھوں سے بہہ کر اس کی داڑھی میں جذب ہو گئی تھی۔ اس نے بے چارگی سے اپنے سر کو بند دروازے پر پٹخا۔ دروازے کی کراہ ابھری اور ویسے ہی خاموشی میں دفن ہو گئی۔ کہیں دور سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی کبھی زور کا دھماکہ ہوتا اور بے شمار روحیں آسمان کی جانب اڑ

جاتیں۔

تب اسے یاد آیا کہ جب وہ گاؤں میں تھا تو شہر سے آنے والے شکاری پرندوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے تو ایسا ہی دھماکہ بلند ہوتا تھا، جس سے گھبرا کر وہ گھنی فصلوں میں چھپ جاتا تھا۔ پھر جب شام ڈھل جاتی اور سائے بڑھنے لگتے تو وہ گھر لوٹ آتا تھا جہاں رات گئے ننگی زمین پر سوتے ہوئے اس کی ماں اسے لوک گیت سناتی تھی اور کبھی بوڑھا دادو دیئے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں میں ہندو زمینداروں اور مارواڑیوں کے ظلم کی کہانیاں بیان کرتا۔ جسے سن کر اس کی معصوم پلکیں بھیگ جاتی تھیں اور وہ بہت اداس ہو جاتا تھا کیوں کہ اسے اپنے دیش کی پگڈنڈیوں بانسوں کے جھنڈ میں بنی ہوئی جھونپڑیوں اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسانوں سے بے پناہ محبت تھی۔

اس کا دادو بتاتا تھا کہ تقسیم سے پہلے گاؤں کی مسجد میں کبھی اذان کی آواز نہیں گونجی تھی بس ہر وقت مندر میں گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں...... اور گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کی جب شادیاں ہوتی تھیں تو ان کی ڈولی پہلی رات ہندو زمیندار کی دہلیز پر اترتی تھی لیکن جب ان کا دیش آزاد ہو گیا تو وہ سارے ظالم مارواڑی اور زمیندار دریا کے اس پار چلے گئے اور اس کے بعد سے ہی گاؤں کے مؤذن کی پرسوز اذانیں سبزہ زاروں میں سفر کرنے لگی تھیں۔ کسان تندہی سے محنت کرنے لگے تھے تاکہ دھرتیاں سونا اگلتی رہیں اور ملاحوں کی درد بھری تانیں گونجتی رہیں۔ دادو یہ کہانیاں سناتے سناتے ہانپنے لگتا تھا کیونکہ بڑھاپے نے اسے موت سے قریب تر کر دیا تھا۔ شروع میں اس کی سمجھ میں یہ باتیں بالکل نہیں آتی تھیں۔ بس اس کے ذہن کی دیواروں پر بے رحم زمینداروں کی ہیبت ناک تصویریں بنتی بگڑتی رہتی تھیں۔ تب وہ بڑی معصومیت سے پوچھتا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کرتے تھے دادو؟"

"اس لئے بیٹے کہ وہ ہندو تھے۔ دادو جواب دیتا۔"

"دادو! کیا ہندو انسان نہیں ہوتا؟"

"وہ انسان ہوتا ہے بیٹے، مگر وہ خدا کو نہیں مانتا، نماز نہیں پڑھتا صرف پوجا کرتا ہے۔"

"نماز نہیں پڑھنے اور صرف پوجا کرنے سے کیا ہوتا ہے دادو؟"

بہت کچھ ہوتا ہے بیٹے، لیکن اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تم سو جاؤ!

یہ کہہ کر دادو اسے اپنے سینے میں چھپا لیتا اور وہ بہت سی باتیں جاننے کی خواہش لئے نیند کی وادیوں میں بھٹکنے لگتا۔

وہ اکثر سوچتا کہ اگر وہ اس لمحے ہوتا۔ تو اس کے دیش کے باسیوں پر ظلم ڈھانے والوں کو سزا دیتا۔ شہر سے آنے والے شکاریوں کی بندوقوں سے انہیں پرندوں کی طرح اڑا دیتا۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار دادو سے بھی کیا تھا۔

"دادو اگر میں اس وقت ہوتا تو ان ہندوؤں کو گولیوں سے اڑا دیتا۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے بیٹے۔"

"کیوں دادو! مجھے کون روک سکتا تھا۔"

"ان ہندوؤں کے پیچھے انگریزوں کی طاقت تھی بیٹے۔ انگریز ہم مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لئے ہندو مارواڑیوں کو یہاں بھیجتا تھا، تاکہ اس کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں۔"

دادو! کیا انگریز خدا سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے؟"

"نہیں بیٹے خدا سے بڑا کوئی بھی نہیں، انگریز دراصل سمندر پار سے آئے تھے جنہوں نے ہماری دھرتی پر اپنی قوت کے زور سے قبضہ کر رکھا لیکن پھر خدا کی مدد آئی اور ہم نے انہیں مار بھگایا۔ اللہ کی مدد بہت بڑی چیز ہے بیٹے۔"

یہ سن کر وہ بہت خوش ہو جاتا اور اپنی کتاب میں لکھی ہوئی حمد زور، زور سے پڑھ کر دادو کو سنانے لگتا۔

ایک رات جب آسمان پر چاند چلتے چلتے بہت تھک گیا تھا اور پدما کی لہریں بہتے بہتے ٹھہر گئی تھیں، بانس کے لمبے لمبے پراسرار درختوں کے نیچے وہ ہمیشہ کی طرح دادو سے قصے سن رہا تھا۔ وہ کہانیاں جو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک سنتا چلا آ رہا تھا لیکن اس پرانی کہانی کو سنتے سنتے اچانک اس نے ایک نیا سوال کر دیا۔

"دادو! کیا وہ لوگ دوبارہ نہیں آ سکتے۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا بیٹے۔" دادو کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں اور اس کی سانس زور، زور سے چلنے لگی تھی۔

"لیکن اگر فرض کر لو دادو وہ زبردستی آ گئے تو کیا ہو گا؟"

"ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے بیٹے۔ اس دھرتی کے باسی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اب ہم آزاد ہیں اور برسوں کی غلامی کے بعد حاصل ہونی والی آزادی کو اتنی جلدی چھین لینا آسان کام نہیں ہوتا۔"

"لیکن پھر بھی دادو اگر ایسا ہو گیا تو......" وہ اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا۔

"تو، تو...... تو۔" دادو کی آنکھیں اندھیرے میں چمک اٹھیں اور اس کے بوڑھے بدن میں زندگی کی

نئی رمق دوڑ گئی۔ "تو...... نور! تمہیں اس کے لئے لڑنا ہوگا۔ اس دھرتی کے لئے اس دھرتی پر گونجنے والی اذانوں کے لئے...... چاہے تمہیں اپنا خون ہی کیوں نہ دینا پڑے۔"

تب اس سمے اس نے بانس کے درختوں کے جھنڈ سے باہر دیکھا جہاں فصلیں جھوم رہیں تھیں۔ اور پدما کی لہریں آہستہ آہستہ بہہ رہی تھیں۔

وہ اکثر شام کو اپنے اسکول کے کام سے فارغ ہو کر پدما کے سینے پر اپنی کشتی کو کھیلتا ہوا دور تک نکل جاتا تھا، جہاں سورج کی آخری کرنیں دریا کی موجوں سے لپٹ کر اسے دوسری صبح تک کے لئے الوداع کہتی تھیں اور پرندے قطار باندھے اپنے اپنے گھونسلوں کی جانب اڑتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جب وہ واپس لوٹتا تو اس کی کشتی زندہ مچھلیوں سے بھری ہوتی تھی۔ پھر جب اسے دریا سے مچھلیاں پکڑتے ہوئے ڈھیر سارا عرصہ ہو گیا اور اسکول کے تمام امتحانات اس نے پاس کر لئے تو اس کا تانگہ شہر جانے کے لئے دھول سے اٹے ہوئے رستے پر دوڑ رہا تھا۔

کمرے سے باہر سڑک پر کسی کے دوڑنے کی آواز آئی تھوڑی دیر کے بعد ہی گولی چلی اور بھاگنے والے کی کرب ناک چیخ رات کے گھمبیر اندھیروں میں گم ہو گئی۔ جیسے وہ شہر میں آنے کے بعد گم ہو گیا تھا۔ فیکٹری کی دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں اور شور مچاتی ہوئی بسوں کے ہجوم میں اس نے اپنے بے شمار دوست پیدا کئے جس میں راکیش بھی شامل تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں وہ جب اس سے گفتگو کرنا چاہتا اس کے ذہن میں دادو کی شکل ابھرتی اور ساتھ ہی بے رحم زمینداروں کے ظلم کی کہانیاں بھی......!

جب ملک میں الیکشن کے ہنگامے شروع ہوئے تو دادو کی بیماری کی اطلاع آئی۔ اس کے گاؤں پہنچنے پر صرف چند آنسو بھرے چہرے اس کے منتظر تھے۔ اس روز وہ شام تک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ دادو کی قبر پر پھول مرجھا چکے تھے۔ فصلیں اداسی سے سر جھکائے کھڑی تھیں اور ملاحوں کی تانیں سوز سے عاری تھیں۔ وہ واپس لوٹا تو دادو کے مرنے کا غم شہر کے شور نے کم کر دیا تھا۔ البتہ اب اسے یہاں بڑی اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ اب لڑکوں کے درمیان گفتگو بلند آواز کے بجائے سرگوشیوں میں ہوتی تھی۔ ایسی سرگوشیاں جس کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ شاید وہ کوئی اداس سی دوپہر تھی۔ وہ کالج کے لان میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کہو نور یہاں کیسے بیٹھے ہو۔"

اس نے نگاہ اٹھائی راکیش کھڑا تھا

"یوں ہی بیٹھا ہوں، تم سناؤ، بہت مصروف رہنے لگے ہو۔"

"نور تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ دیش پر مغربی حصے کی فوج اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی ہے اور تم اطمینان سے

بیٹھے ہو۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ راکیش کی آنکھیں کئی راتوں سے مسلسل جاگنے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"راکیش تم کس مغربی حصے کی بات کر رہے ہو۔ ہم ایک وجود ہیں، ایک جسم ہیں اور جسموں کے بھی کہیں حصے ہوتے ہیں......"

راکیش نے زور کا قہقہہ لگایا۔ پاگلوں کی طرح قہقہہ لگاتا رہا۔

"نور! تم واقعی بہت معصوم ہو، جن لوگوں نے تمہیں پچیس سال تک لوٹا جو تمہارے کھیتوں سے اُگنے والے اناجوں سے اپنی کوٹھیاں تعمیر کرتے رہے جنہوں نے کبھی تمہیں اپنی حکومت میں شریک نہیں کیا، صرف تمہارے دیش کے لوگوں کو بھوکا ننگا رکھ کر خود حکومتیں بناتے رہے اور آج بھی جو تمہیں تمہارے جائز اقتدار سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور جن کے فوجی بیرکوں میں بندوقیں سنبھالے بیٹھے ہیں انہیں...... انہیں تم اپنے جسم کا حصہ سمجھتے ہو، اگر یہ تمہارے جسم کا حصہ ہیں تو اس زخم آلود حصے کو کاٹ پھینکو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا زہر تمہارے پورے بدن میں پھیل جائے......"

راکیش کا ایک ایک لفظ اس کے بدن میں بندوق کی گولی بن کر اترتا رہا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور ایسا محسوس ہوا جیسے ان آندھیوں کے شور میں مؤذن کی پرسوز اذانیں اس سے بچھڑ کر دور ہوتی جارہی ہیں۔

وہ لان میں یوں بیٹھا رہا جیسے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہو اس کا ذہن مغموم راستوں پر بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بڑبڑانے لگا۔

"دادو ہندو مارواڑی پھر شکل بدل کر آ گئے۔ تم کہتے تھے اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ لیکن دادو...... میرے دیش کی دھرتی پر ایک بار پھر جھوٹے لوگ قابض ہونا چاہتے ہیں انہوں نے بیرکوں میں اسلحے چھپا رکھے ہیں، وہ یہاں گولیاں چلائیں گے، خون بہائیں گے، راکیش ٹھیک کہتا ہے، وہ کہتا ہے...... وہ کہتا ہے...... وہ......"

اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

"نورے"...... دادو زور سے پکارتا ہے۔

"نورے راکیش جھوٹ بولتا ہے، میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو تجھے خون دینا پڑے گا۔ نورے تیرے دیش کے خلاف سازشیں تیار کی گئی ہیں۔ تیرے معصوم بھائیوں کو بے وقوف بنایا گیا ہے۔ سب بکواس ہے نورے تیرے دیش پر کسی نے ظلم نہیں کیا۔ ظلم تو اب ہو گا نورے...... دریا پار

ہندو مارواڑی ایک بار پھر اپنے محل میں تیری بہنوں کی ڈولیاں اترنے کے خواب دیکھ رہے ہیں...... ایسا نہیں ہونا چاہئے، چاہے اس کے لئے تجھے خون ہی کیوں نہ دینا پڑے...... چاہے...... چاہے......"

وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا...... سورج کی چمک کالے بادلوں کے پیچھے چھپ چکی تھی۔ اس نے نیند سے بیدار ہونے میں بہت دیر کر دی...... کالج کا احاطہ اور شہر کی گلیاں لمبے لمبے بالوں والے وحشیوں سے بھری ہوئی تھیں وہ اپنے ہاتھوں میں سیاہ پرچم لئے بے گناہ انسانوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ بنگال کا حسن تعصب کی تند و تیز آندھیوں میں کہیں چھپ گیا تھا۔ خون کے بادل منڈلا رہے تھے اور سڑکیں نعروں سے روندی جا رہی تھیں۔"

"جئے بنگلہ"

"جالو جالو آگن جالو۔"

تب اس نے انتہائی کرب سے سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کھیتیاں اناج اگلنا بند کر دیں اور دریا کی لہریں کناروں پر صرف لاش پھینکنے لگیں۔

اسے اس سوچ کی سزا ملی۔

اور آسمان مارٹر گن اور توپ کے دھماکوں سے لرزنے لگے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی بلبلاتی ہوئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اس وقت اس نے اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں سے روسی ساخت کی بندوقیں چھیننے کی کوشش کی تھی کہ۔

وحشی نہ بنو، ہم سب ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔ ہتھیار پھینک دو۔" مگر بندوقوں سے گولیاں اور تیزی سے نکلنے لگیں اور سارا شہر جلنے لگا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیختا رہا۔ اپنے کپڑے پھاڑتا رہا۔

"ہتھیار پھینک دو، ہتھیار پھینک دو۔"

ہم سب ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔

تب کہیں راکیش نے رائفل کا بٹ اس کے سر پر دے مارا تھا اور اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ جہاں اس کی ماں اسے لوک گیت سنانے کے لئے منتظر کھڑی تھی مگر گیت نے ماں کے ہونٹوں پر دم توڑ دیا۔ کوٹھری سے باہر کا فرش فوجی بوٹوں سے گونج اٹھا وہ اپنے زخمی وجود کے ساتھ گزری ہوئی زخمی باتیں سوچ رہا تھا کوئی زوردار سی ٹھوکر دروازے پر پڑی۔ کمزور دروازہ لڑکھڑایا، سنبھلا اور پھر دھڑام سے اس کے بے جان جسم پر گر پڑا۔ اس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور ساتھ ہی آنے والے کا حیوانی قہقہہ بلند ہوا۔

"غداروں کی یہی سزا ہوا کرتی ہے نور السلام۔" فوجی بوٹ سے اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھی

تھیں۔"

تم میرے دوست ہو۔ مگر دیش سے بغاوت ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

اس کے جواب میں اس کی لرزتی ہوئی آواز کمرے کی خاموش فضاء میں یوں تھرتھرائی تھی جیسے اندھیرے گھپ راستوں پر اچانک بے شمار ٹیوب لائٹس جل اٹھی ہیں۔

خدا اور دیش سے غداری میں نہیں تم لوگ کر رہے ہو۔ عبدالقادر، میری آنکھیں تمہاری ٹھوکروں سے اندھی تو ہو جائیں گی لیکن ذرا تم بتانا کہ تمہاری کھیتیاں ویران ہوئی ہیں کہ نہیں۔ تمہارے شہر اجڑے ہیں کہ نہیں اور یہ تم سب نادان لوگوں......"

ہماری آزادی کے لئے یہ قیمت مہنگی نہیں ہے نور۔

آزادی نہیں غلامی کہو تمہارے ہاتھوں میں جنہوں نے رائفلیں تھمائی ہیں وہ اپنے اسلحوں کے استعمال کا معاوضہ وصول کرنا خوب جانتے ہیں۔"

وہ کچھ اور بولنا چاہتا تھا لیکن اس کی سانس پھولنے لگی اور اس کے حواس پر غنودگی چھاتی چلی گئی جب اس کی آنکھیں کھلیں تو ایک مہیب ویرانی چاروں طرف ناچ رہی تھی۔ کبھی کبھی دور سے اِکا دُکا فائروں کی آواز خاموشی کے سینے کو چیرتی ہوئی گزر جاتی۔

وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا سڑک پر آ گیا اس کا پاؤں بار بار کسی شے سے ٹکراتا۔ ایک مرتبہ اس نے جھک کر اسے پکڑنے کی کوشش کی تو کسی عورت کے سر کے بال مٹھیوں میں آ گئے۔ اس کے کمزور اور نحیف بدن میں خوف اور دکھ کی ایک لہر کے ساتھ ہی بائیں بازو میں تکلیف اٹھی اس نے شدت کرب سے آنکھیں موند لیں۔ اسے ایسا لگا جیسے دادو چپ چاپ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ ٹپک رہے ہیں اور وہ اپنی کپکپاتی ہوئی انگلی سے اس جانب سے اشارہ کرتا ہے جہاں پدما کی سطح پر بادبانی کشتیوں کے بجائے انسانی جسم تیر رہے تھے، کھیتوں میں فصلوں کو فوجی ٹرکوں نے روند دیا تھا اور بانسوں کے جھنڈ میں بنی ہوئی جھونپڑیوں کی جگہ مہیب گڈھے منہ کھولے ہوئے تھے۔

آنے والی صبح بہت غمگین تھی۔

اس نے فٹ پاتھ کے کنارے پڑے پڑے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ بے پناہ جمے ہوئے خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں ادھ کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ خوبصورت عالی شان مکان اب جلے ہوئے کھنڈرات میں بدل چکے تھے جن پر گدھ اور کوّے منڈلا منڈلا کر بیٹھتے اور للچاتی ہوئی نظروں سے مردہ انسانوں کو دیکھنے لگتے۔ ایک کتا بھی ان ہی لاشوں میں کچھ سونگھتا پھر رہا ہے نہ فیکٹریوں

کی چمنیوں نے دھواں اگلا اور نہ ہی لوگوں کا ہجوم جاگا بس دور سے اجنبی ملٹری کی گاڑیوں اور ٹرکوں کے آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان گاڑیوں میں بڑی داڑھیاں اور سروں پر پگڑی باندھے ہوئے فوجی بیٹھے تھے ان کے پیچھے لمبے لمبے بالوں والے وحشی نوجوانوں کا ایک بڑا گروہ رقص کرتا ہوا آیا اور بچی کھچی دکانوں پر ٹوٹ پڑا۔ وحشی درندوں کے جانے کے بعد سورج خاموشی سے نکلا اور افسردگی سے اپنا سفر طے کرنے لگا اس نے آخری بار اپنے بازو کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر ہمیشہ کے لئے گر پڑا۔ اس کے قریب ہی مردہ جسموں کے درمیان سویا ہوا بچہ جاگ اٹھا۔ تھوڑی دیر تک تو اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کو حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر رونے لگا۔

"ماں تمی کو تھائی، ماں تمی کو تھائی......!!!"

نیک کام

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو دیہاتی شہر میں آئے یہاں ان کی نظر ایک خوب صورت عمارت پر پڑی۔ پہلا دیہاتی بولا، "یار دیکھو تو اتنی خوبصورت عمارت دھوپ میں کھڑی ہوئی ہے۔" دوسرا دیہاتی بولا "ہاں یار، کیوں نہ ہم اس عمارت کو دھکا لگا کر سائے میں لے جائیں۔"

دونوں دیہاتیوں نے دھکا لگانا شروع کیا بالاخر دوپہر سے شام ہو گئی اور دھوپ ڈھل گئی تو ایک دیہاتی دوسرے دیہاتی سے مخاطب ہو کر بولا، "مبارک ہو ہم عمارت کو سائے میں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

دوسری دفعہ کا ذکر ہے کہ اللہ نے ایک قوم کو خوبصورت سا گھر عطا کیا۔ صبح بھی کچھ اچھی نہیں تھی لیکن جب دوپہر ہوئی وہ گھر دھوپ میں جلنے لگا۔ اس قوم نے اسے دھکا لگانا شروع کیا کہ سائے میں لے آئے۔ بہت زور لگانے سے آدھا مکان ٹوٹ کر اندھیرے میں جا گرا۔ باقی آدھا بچا ہے جسے ابھی تک دھکا دیا جا رہا ہے۔ رات کے سایوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر یہ قوم خوش ہوتی ہے کہ منزل قریب آرہی ہے۔

ناظمہ حسن خان۔ کراچی

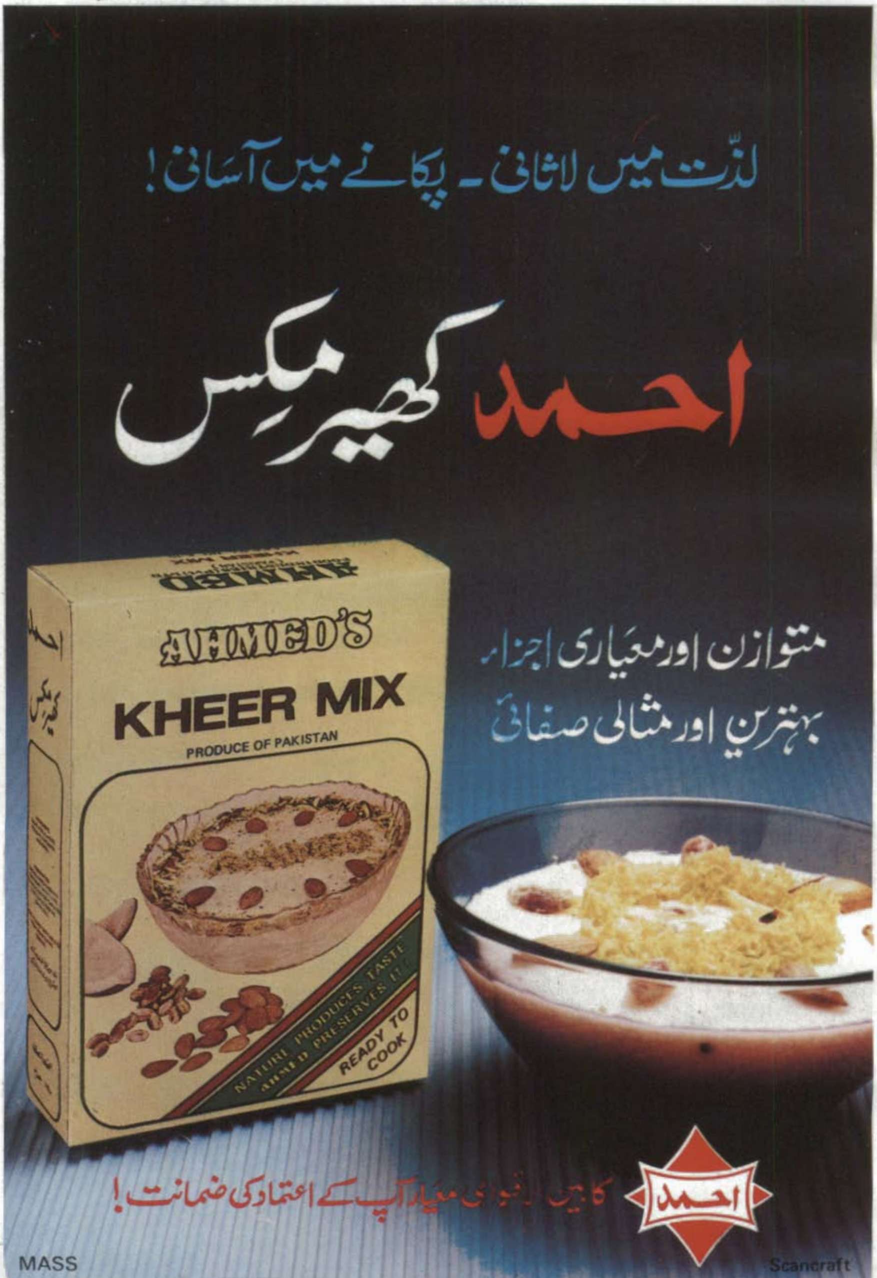

لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی!
احمد کھیر مکس
متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی
AHMED'S
KHEER MIX
PRODUCE OF PAKISTAN
READY TO COOK
احمد
احمد کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت!
MASS
Scancraft

باریک بین پاکستانی آرٹسٹ بمقابلہ امریکی آرٹسٹ

چاول کے دانے پر
کلمۂ طیبہ
لکھتے ہوئے ساری
توجّہ ایک نکتے پر
مرکوز

چاول اور دال کے
دانوں پر آیات اور
کلمات کی خطاطی

رائی کے دو دانوں اور چاول
کے ایک دانے پر لکھنے کا عمل،
انتہائی حساس لینس کے ذریعے
لیا گیا کلوز اپ

چنے کی دال کے ایک حصے پر
مصوّری کے چار حسین شاہکار

خُردبین آنکھیں   باریک بین آرٹسٹ

امریکی آرٹسٹ ڈیوڈ اسیون
چاول کے دانے پر مصوّری کرتے ہوئے

دو انگلیوں کے
درمیان
چاول پر بنا ہوا
مجسمۂ آزادی

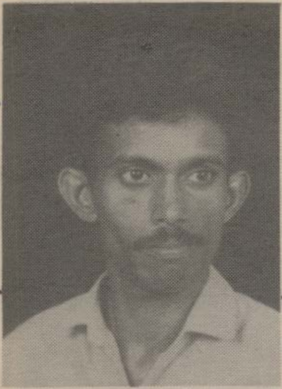

ظفر عالم

خرد بین آنکھیں
باریک بین آرٹسٹ

تعارف سین۔میم

امریکہ کا کثیر الاشاعت ہفت روزہ "نیشنل انکوائرر" دیکھتے ہوئے ہماری نظر ایک ایسی تصویر پر پڑی جس میں ایک امریکی آرٹسٹ چاول کے دانے پر مجسمۂ آزادی کو پینٹ کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہماری حیرت میں اضافہ کا باعث بنی اور ہم نے دل ہی دل میں اس آرٹسٹ کو داد بھی دے ڈالی۔ اسی طرح کے ایک باریک بین آرٹسٹ کو ہم اس سے قبل ٹی وی کے پروگرام "یو آ سکڈ فار اٹ" میں بھی دیکھ چکے تھے۔ اب تو ہم واقعی امریکیوں سے بہت مرعوب ہوگئے تھے۔ مگر امریکیوں کا یہ رعب ہم پر بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکا۔ ہمارے ایک دوست نے عین اس وقت ہم پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیئے جب اس نے ایک خوبصورت سا بکس ہماری آنکھوں کے سامنے کھولا اور کہا کہ یہ سب کچھ میں نے بنایا ہے۔

پہلی نظر میں تو ہم کچھ بھی سمجھ نہ سکے مگر پھر جب دیدے پھاڑ کر اور آنکھوں کو بہت قریب لے جا کر دیکھا تو یقین نہیں آیا کہ ظفر عالم صاحب یہ

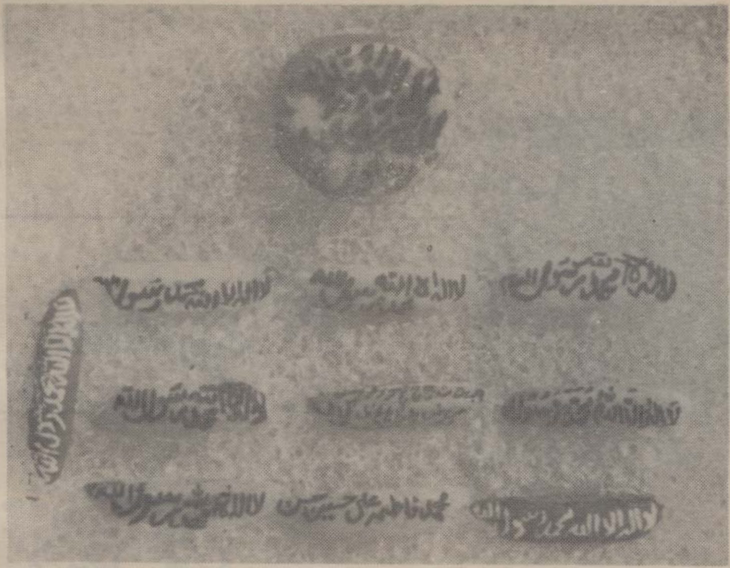

چاول اور چنے کی دال پر خطاطی کے چند نمونے

سب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ چاول کے دانوں پر خطاطی، چنے کی دال پر مصوّری اور حد تو یہ ہے کہ رائی کے دانوں پر بھی خوبصورت نقش و نگار بنا کر انہوں نے بہت سوں کو اپنا معترف بنالیا ہے۔ ظفر کا تعلق پاکستان کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی اورینٹ، سے ہے، یہاں پر یہ کمرشل آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یونہی بیٹھے بیٹھے انہیں باریک ترین مصوّری کی سوجھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ باریک بین مصوّر بن گئے۔ ظفر نے اب تک کئی انعامات اور ایوارڈز حاصل کئے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو سے ان کے کئی پروگرام نشر ہو چکے ہیں۔

ہماری موجودہ وزیر اعظم کی والدہ اور کئی وزراء ان کی صلاحیتوں کو سراہ چکے ہیں بلکہ ابھی پچھلے دنوں وفاقی وزیر مواصلات نے ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر انہیں ٹیلی فون کا ایک کنکشن بھی دیا ہے...... ظفر اب اس بات کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں کہ وہ باریک سے باریک چیز پر نسبتاً بہتر صاف اور واضح مصوّری کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے ان کی روز و شب مشقوں کا سلسلہ جاری ہے ہم ان کی بیش بہا کامیابیوں کے لئے دعاگو ہیں۔

اللہ میاں سے ایک دُعا

محمود میاں

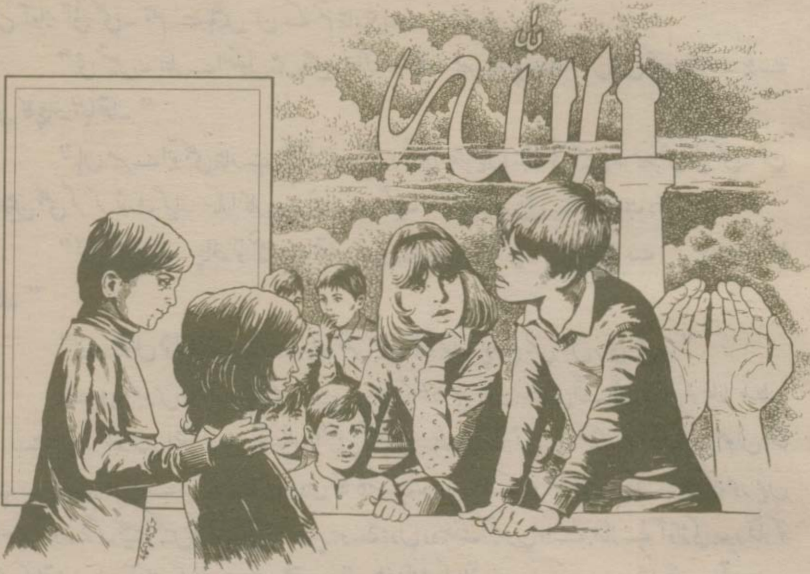

شہر میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا، دور دور تک آگ لگ گئی اور بہت سے معصوم انسان مارے گئے ...... تو یہ اس کے بعد کی بات ہے۔

چار سے آٹھ برس تک کی عمر کے بچّے اس پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ میں دفتر سے جلد واپس آنے کی سزا بھگت رہا تھا۔ محلے کے بہت سے بچّے دھائیں دھائیں کی آوازیں نکال کے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے انہیں باہر بھگایا تو وہ لاؤنج میں چلے گئے۔ ان کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

کسی بڑے بچے نے ایک زور دار دھماکہ کیا تو سب بچے نے ایک لمبی سی اووئی ئی ئی ...... کی آواز نکالی اور پھر پوچھا "یہ کیا تھا؟" وہ بولا "یہ جمبوجیٹ کی بیلی لینڈنگ تھی میں پہیئے نکالنا بھول گیا

تھا۔"

"جی نہیں جہاز کی آواز ایسی نہیں ہوتی" ایک قدرے چھوٹی بچی نے کہا "جہاز کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے اوپر والے کمرے کی چھت گر پڑی ہو۔ ہمارے اسکول میں بھی آواز آئی تھی۔ سب بچے ڈر کے رونے لگے تھے۔"

"جی نہیں جھوٹ۔" دو تین اور بچے ایک ساتھ بولے۔ "تمہارے اسکول میں نہیں ہمارے اسکول میں آواز آئی تھی۔ ہم سے باتیں سن کے تم بتا رہی ہو...... جھوٹی......"

"جی نہیں۔ ہمارے اسکول میں بھی دھماکہ ہوا تھا۔ میرے ابّی کے آفس میں بھی ہوا تھا۔ بڑے زور کا پٹاخہ بجا تھا۔"

"ہاں میرے ابو بھی بتا رہے تھے کہ ان کے دفتر کی کھڑکیاں بجنے لگی تھیں۔ میز بھی ہلی تھی۔ ان کا پین بھی گر کر ٹوٹ گیا۔ سارا کارپیٹ خراب ہو گیا۔" ایک اور بچی نے شہادت دی۔

"کوئی نہیں جی۔ پٹاخہ تو نہیں بجا تھا۔ بس زمین ہل رہی تھی۔ چپکے چپکے سے...... بڑا مزہ آ رہا تھا۔"

"اور دھواں تو اتنا نکل رہا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پوری بس جل رہی تھی۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ بچے کچھ کنفیوژن کا شکار ہیں اور بہت سی الگ الگ باتوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ لہٰذا میں اٹھ کر باہر آ گیا اور انہیں تفصیل سے بتایا کہ آج جو دھماکہ ہوا ہے اور دھواں اٹھا ہے یہ تخریب کاری ہے۔ گندے آدمیوں کا کام ہے۔ وہ دھماکے جو شہر میں ہر جگہ سنے گئے اور یوں محسوس ہوئے کہ جیسے کہیں قریب ہی چھت پر ہوئے ہوں وہ جٹ انجنوں والے جہاز نے آواز کی حدِ رفتار کو عبور کیا تھا...... اور آواز کے بغیر جو زمین ہلتی ہے تو یہ چیز زلزلہ کہلاتی ہے۔ یہ سب سے خطرناک ہوتی ہے۔ عمارتیں گر جاتی ہیں، زمین پھٹ جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ بتا کے واپس کمرے میں چلا آیا۔

....

کچھ دیر تک باہر خاموشی چھائی رہی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بچے زلزلے کے ذکر سے یوں سہم جائیں گے۔ بالآخر بڑے بچے نے دھیمے سے لہجے میں خاموشی کو توڑا۔

"ہماری مس بتا رہی تھیں کہ جب زلزلہ آتا ہے ناں تو سارا شہر تباہ ہو جاتا ہے۔ سب لوگ مر جاتے ہیں۔"

"کیوں مر جاتے ہیں؟ کون مار دیتا ہے ان کو؟!!" پانچ سالہ بچی نے پریشانی سے پوچھا۔

"ابھی انکل نے بتایا تو تھا کہ زمین پھٹ جاتی ہے اور مکان گر جاتے ہیں" ایک اور بچے نے جواب

دیا۔

"زمین کیسے پھٹ جاتی ہے ؟"

"بس پھٹ جاتی ہے...... اور پھر اس میں سے بڑی بڑی بلائیں نکلتی ہیں جو آدمیوں کو کھا جاتی ہیں اور مکانوں کو گرا دیتی ہیں۔"

"ہاں بہت بڑی بڑی بلائیں نکلتی ہیں۔ کنگ کانگ سے بھی بڑی سو سو منزلوں جتنی اونچی"

"ڈینو سارز اور ایلی گیٹرز نکلنے سے...... یوں کر کے ایک بار دم ہلاتے ہیں تو دس ہزار مکان گر جاتے ہیں۔ پتہ ہے ؟!"

چار سال کی بچی سہم کے رونے لگی۔

بڑا بچہ اسے چپ کرانے لگا "...... دیکھو اگر زلزلہ آیا تو ہم بھاگ کے دوسرے شہر چلے جائیں گے۔"

"جی نہیں دوسرے شہر کیسے جاؤ گے ؟ زمین تو پھٹ جائے گی۔ سڑک بھی ٹوٹ جائے گی۔ بڑی تیزی سے۔"

"اور جناب ڈینو سارز تو یوں یوں کر کے بڑی جلدی جلدی سب کو کھا جائیں گے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" بچے پریشان ہو گئے۔

"میں ان کو گولی مار دوں گا۔" ساڑھے چار سالہ بچہ سینہ تان کر بولا۔

"میں ان پر ڈز ڈز ڈز راکٹ پھینکوں گا۔" چھ سالہ بچے نے اعلان کیا۔

"میں ان کو ایٹم بم سے اڑا دوں گی۔"

"میں نائٹ رائڈر والی کار سے ان کو ٹکریں ماروں گا۔"

"میں ان کو آگ لگا دوں گا۔"

"میں ان کی دم کاٹ دوں گی۔"

....

باہر پھر خاموشی چھا گئی۔ میں جانتا تھا کہ بچے خوف زدہ ہیں۔ ورنہ وہ چپ رہنے والے نہ تھے۔ میں نے سوچا باہر چل کر انہیں صحیح طریقہ بتایا ہوں اور سمجھاتا ہوں کہ جیسا تم سوچتے ہو ایسے نہیں بلکہ زلزلہ آئے تو باہر نکل کر کھلے میدان میں پہنچنا چاہئے اور ......

"سنو سنو سب بچے سنو......" باہر پانچ سالہ بچی نے کھڑے ہو کر غیر معمولی طور پر بلند آواز میں اعلان کیا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ میں ٹھٹک کر راستے میں ہی رک گیا۔

"ایک آئیڈیا آیا ہے ...... میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا ہے ...... بولو نہیں ...... سب بچے سنو۔ ہم گولی نہیں ماریں گے اور ڈینو سارز کو آگ بھی نہیں لگائیں گے۔ ہم پتہ ہے کیا کریں گے" ......

سب بچے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں بھی وہیں رکا رہا...... "...... ہم یہ کریں گے کہ ہم اچھے بچے بن جائیں گے۔ اللہ میاں اچھے بچوں کی بات مانتا ہے۔ ہم اس سے وعدہ کریں گے اور دعا کریں کہ اللہ میاں ان سب بلاؤں کو چھوٹا چھوٹا بنا دے ...... بالکل چھوٹا چھوٹا سا...... کھلونوں جتنا چھوٹا...... بس اللہ میاں انہیں چھوٹا بنا دے گا۔ ہمارے کھلونوں جتنا چھوٹا......"

سب بچوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے نعرہ لگایا

"ہُرّے"

"میں تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

پس انداز

امام بخاریؒ ایک بار پانی کے جہاز میں سفر کر رہے تھے ان کے پاس ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ سفر میں ایک شخص سے ان کی ملاقات ہوئی۔ امام بخاریؒ نے باتوں باتوں میں اس سے اشرفیوں کا ذکر کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر ایک دن اس شخص نے اچانک شور مچانا شروع کر دیا اور آہ وبکا کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا۔ وہ بولا۔ "میرے پاس ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی تھی مگر آج وہ میرے سامان میں نہیں ہے۔" لوگوں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "فکر نہ کرو ہم ابھی تمہاری تھیلی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔" جہاز والوں کی تلاشی ہونے لگی۔ امام بخاریؒ نے یہ دیکھا تو تھیلی سمندر میں پھینک دی۔ ان کی تلاشی بھی لی گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے کسی مسافر کے سامان سے تھیلی نہیں نکلی۔ لوگوں نے اس شخص کو بہت شرمندہ کیا۔

سفر ختم ہو گیا اور جہاز کے تمام مسافر اتر گئے تو وہ شخص امام بخاریؒ سے ملا اور کہنے لگا۔ "کہیئے، آپ نے مجھ سے اشرفیوں کی جس تھیلی کا ذکر کیا تھا، وہ کہاں ہے؟" امام نے کہا۔ "میں نے اسے سمندر میں پھینک دیا تھا۔" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔ "اتنی بڑی رقم برباد کرنے کے لئے آپ آمادہ کیسے ہوئے؟" امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ۔ "میری پوری زندگی حدیثوں کی تدوین اور ترتیب میں گزر گئی، اب میری ثقاہت، دیانت اور پاکیزگی ضرب المثل بن گئی ہے، جو دولت میں نے عمر عزیز کے گراں قدر لمحات گنوا کر حاصل کی تھی، اسے بچانے کے لئے اپنے آپ پر چوری کا شبہ کیسے ہونے دیتا؟"

"بچہ مسلم لیگ" کے ساتھ قائداعظم کا گروپ فوٹو

پاکستان بنانے میں بچوں کا حصہ

ادارہ

تحریک پاکستان میں جہاں بڑوں نے حصہ لیا وہاں بچوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ بظاہر کھیل کود میں مصروف رہنا بچوں کی فطرت میں شامل ہے لیکن یہ قائداعظم کی قیادت کا جادو تھا جس نے بچوں کی فطرت تبدیل کر دی تھی۔

بچے بھی اپنے بڑوں کی طرح ہر وقت پاکستان کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ انہوں نے "بچہ مسلم لیگ" بھی قائم کر لی تھی۔ قائداعظم کے ساتھ "بچہ مسلم لیگ" کے اراکین کا گروپ فوٹو ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کی زینت بن چکا ہے۔

قائد اعظم بچوں کو بہت چاہتے تھے۔ وہ ان کی معصوم باتوں سے بعض اوقات بڑے کام لیتے تھے۔ اس سلسلے میں بچوں کے کردار اور قائد اعظم کے حوالے سے چند واقعات نذر قارئین ہیں۔

۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان منظور کی گئی۔ گاندھی جی تقریباً ایک سال تک یہی کہتے رہے کہ وہ پاکستان کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ ۱۹۴۱ء میں جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس سے قائد اعظم واپس جا رہے تھے تو راستے میں واقع ایک قصبہ سے گزر ہوا۔ وہاں مسلمانوں نے والہانہ انداز میں استقبال کیا اور پرجوش نعرے لگائے۔ ایک آٹھ برس کا لڑکا جس کے تن پر صرف ایک لنگی تھی بہت زور سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا رہا تھا۔ قائد اعظم کی نظر پڑی تو اپنی گاڑی رکوائی اور اس لڑکے کو قریب لانے کے لئے کہا۔ کچھ لوگ اسے قائد کے پاس لے آئے۔ قائد نے پوچھا۔ "تم پاکستان کا کیا مطلب سمجھتے ہو؟" لڑکا پہلے تو گھبرایا لیکن قائد اعظم کی شفقت اور دوسرے لوگوں کی جانب سے حوصلہ بڑھانے پر اس نے جواب دیا:

"پاکستان کا مطلب آپ بہتر جانتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی حکومت وہ پاکستان اور جہاں ہندوؤں کی حکومت وہ ہندوستان۔"

قائد اعظم کے ہمراہ صحافیوں کا قافلہ بھی سفر کر رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہاں موجود صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"جاؤ مسٹر گاندھی کو بتادو کہ مسلمانوں کا آٹھ برس کا بچہ بھی پاکستان کا مطلب سمجھتا ہے۔ اگر وہ اب بھی نہیں سمجھ سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے خوب ہیں لیکن اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔" جب اخبار میں یہ خبر چھپی تو گاندھی جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

دوسرا واقعہ دہلی کا ہے۔ ایک بڑے جلسے میں شرکت کے بعد قائد اعظم جب پنڈال سے واپس جا رہے تھے تو ایک غریب شخص بڑھا اور چند منٹ کے لئے مجمع سے الگ رہ کر بات کرنے کی اجازت چاہی۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ غریب شخص نے انہیں بتایا کہ وہ دہلی سے چند میل دور ایک دیہات میں رہتا ہے۔ اس کی بیٹی نے رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھا ہے اور اپنے ہاتھ سے آپ کو دینا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ جائیں اور قائد اعظم کو بلا لائیں! اس جملے میں اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ قائد فوراً تیار ہو گئے۔ اس کے گھر پہنچے۔ ایک ۱۳ سالہ لڑکی نے پردے کی آڑ سے انہیں رومال دیا۔ قائد اعظم رومال پر پاکستان کا نقشہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور لڑکی کو یقین دلایا کہ یہ رومال تحریک پاکستان کے بہت کام آئے گا۔

کچھ عرصہ بعد جب شملہ کانفرنس میں کانگریس نے لارڈ ویول کے ذریعہ قائد اعظم کو یہ پیشکش کی کہ

اگر وہ پاکستان کا مطالبہ چھوڑ دیں تو کانگریس انہیں بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہے یہاں تک کہ قائد اعظم کو متحدہ ہندوستان کا گورنر جنرل تک بنانے پر رضامند ہے تو قائد نے دوسرے دن جواب دینے کو کہا۔ ویول بہت خوش ہوا کہ پانی مرتا نظر آتا ہے لیکن دوسرے دن ان کے ہوش اڑ گئے جب قائد نے ویول کو جواب میں وہی رومال دیا اور کہا کہ پاکستان کا مطالبہ صرف مسٹر جناح کا نہیں بلکہ دس کروڑ مسلمانوں کا مطالبہ ہے جو ان کے خون میں رچ بس گیا ہے اور اب تو دیہات کی لڑکیاں بھی فرصت کے اوقات میں رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھتی رہتی ہیں تم مجھ سے پاکستان کا سودا کرنا چاہتے ہو۔ یہ سودا تمہارے سر سے جس قدر جلد نکل جائے بہتر ہے۔

قوم کے افراد عموماً لیڈروں کے اقوال و اعمال کے مطابق چلتے اور ان کی مثالیں دیتے ہیں لیکن قائد اعظم نے تحریک پاکستان کے دوران بچوں کی باتوں اور ان کے کام کی مثالیں دے کر مسٹر گاندھی اور لارڈ ویول جیسے لوگوں کا منہ بند کر دیا۔ ایسی مثالیں دنیا کی تاریخ میں کم ہوں گی۔

تیسرا واقعہ بمبئی کا ہے۔ ایک ۱۲ سالہ لڑکا سڑک پر جارہا تھا ٹھوکر لگی، گر پڑا، سر سے خون بہنے لگا۔ لڑکا خون دیکھ کر رونے لگا کسی نے کہا۔ "مسلمان کا لڑکا ہو کر روتا ہے؟" لڑکے نے جواب دیا۔ "چوٹ لگنے کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں۔ روتا اس بات پر ہوں کہ جو خون پاکستان کے لئے بچا کر رکھا تھا وہ سڑک پر بیکار ضائع ہو گیا۔"

جب قائد اعظم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے کہا "جس قوم کے پاس ایسے بچے موجود ہیں اسے پاکستان حاصل کرنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" سچ تو یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں بچوں کا کردار ہماری تاریخ کا حسین ترین باب ہے۔

(اقتباس ...... دل کی دھڑکن)

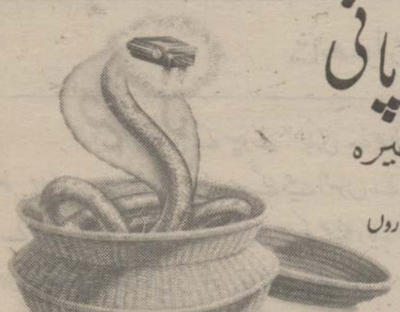
بجلی کا ڈسا مانگے نہ پانی
بجلی کے ننگے تار اور پلگ وغیرہ
سانپ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں۔ بجلی کے تاروں
اور سوئچ بورڈ وغیرہ کو کھلونا نہ جانیئے۔ ان سب
سے دُور رہیئے۔ بجلی کے سامان کو احتیاط سے
استعمال کیجئے۔

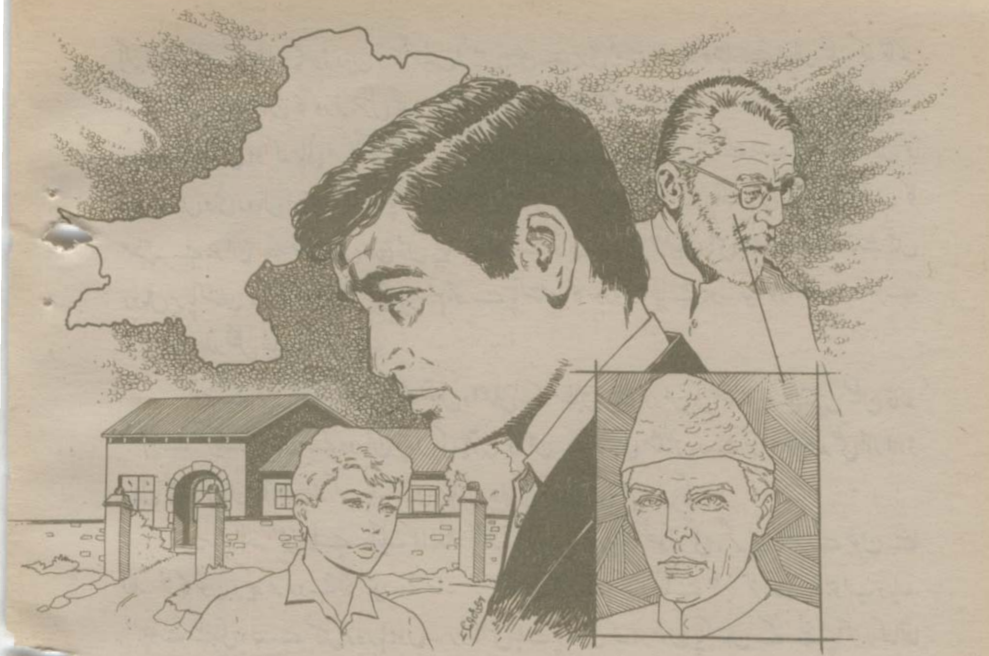

ایک گھر نہیں بنا سکے

شاھنواز فاروقی

"آ گئے برہمن کے سپوت" ابّا جی نے بھائی جان کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا اور پھر اس طرح اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے جیسے انہوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ ابّا کے فقرے پر پاس بیٹھی ہوئی امّی نے میری جانب دیکھ کر ناگواری سے سر کو جھٹکا دیا۔ مجھے جماہی آ گئی۔ برسوں سے ہمارے گھر میں یہی ہو رہا تھا یعنی بھائی جان کی آمد، ابا کا تبصرہ اور امی کا سر کو جھٹکنا۔

ہمارا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ ابا، امی، بھائی جان اور میں۔ بھائی جان مجھ سے پانچ برس بڑے تھے۔ بلا کے ذہین اور محنتی۔ قائداعظم کے مخالف اور پاکستان کے بارے میں غیر جانب دار سے۔

اس کے برعکس ابا قائد اعظم کے زبردست پرستار اور پاکستان پر بلاوجہ بھی جان دینے کے لئے ہر وقت تیار۔ ابا کے بقول انہوں نے تحریک پاکستان میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ محلے کے لوگ ابا کو قائد اعظم کہہ کر پکارتے تھے۔ ابا قائد اعظم سے خاصے ملتے جلتے تھے۔ دبلے پتلے، ایماندار، اصول کے پابند اور نظم و ضبط کے قائل۔ ابا کی اصول پسندی اور نظم و ضبط دوسروں اور خاص طور پر ان کے خاندان کے لئے اکثر تکلیف دہ بن جاتا۔ یہ ابا کی اصول پسندی اور ایمانداری ہی تھی جس کی وجہ سے ان کے جنرل اسٹور سے صرف گزر اوقات ہی ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتے تو اس سے خاصا منافع کما سکتے تھے کیونکہ بہت عرصے تک ابا کا اسٹور علاقے کا واحد اسٹور رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ بھائی جان کے دوستوں کی صحبت کا اثر تھا یا ابا کی ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ کہ بھائی جان قائد اعظم کے مخالف ہوتے چلے گئے تھے۔ ابا قائد اعظم کی جتنی تعریف کرتے بھائی جان اس سے زیادہ ان کی برائی کرتے۔ اسکول کے زمانے تک تو بھائی جان ابا کے پیچھے ہی قائد اعظم کو برا بھلا کہتے تھے مگر کالج کے بعد وہ ابا کے سامنے بیٹھ کر، زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ ابا انہیں بحث و مباحثہ سے روکتے نہیں تھے۔ وہ کہتے قائد اعظم نے اپنا مقدمہ دلیل کی بنیاد پر جیتا ہے چنانچہ ہمیں بھی دلیل کے ذریعہ ہی اپنی بات منوانی چاہئے۔ ابا بھائی جان کی بحث کا ہر گز برا نہ مانتے اور انہیں دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر بھائی جان قائل ہونے کے بجائے اور مخالف ہو جاتے۔ بھائی جان کے موقف کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان قائد اعظم نے نہیں بلکہ انگریزوں نے بنایا ہے یا ان کی سازش سے خود بخود بن گیا۔ یعنی ایک صبح لوگ بیدار ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قائد اعظم کا اول تو کوئی کردار نہیں اور اگر ہے تو ایک معمولی سے ذریعہ کا۔ چنانچہ ان کی جدوجہد اور ساحرانہ قیادت کا افسانہ ڈھونگ ہے۔

"پاکستان قائد اعظم نے نہیں انگریزوں نے بنایا ہے" بھائی جان اکثر کہتے۔

"بنایا کیا تھالی میں رکھ کر مسلمانوں کو پیش کر دیا کہ لیجئے نوش فرمائیے۔" ابا جل کر کہتے۔

"خیر مسلمان اب اس قابل بھی نہیں تھے۔" بھائی جان ابا کو اور جلانے کے لئے کہتے۔ "بیٹا جی دنیا میں اتنا بڑا احسان کوئی کسی پر نہیں کر سکتا اور پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ صرف ایک دیوار بنانا بھی جان کا عذاب ہوتا ہے۔ یہ تو پھر لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کا ملک ہے، تمہیں کیا معلوم کہ ملک بنانا کیا ہوتا ہے؟۔ اس کے دکھ کیسے ہوتے ہیں؟ تم کبھی خود کچھ بناؤ گے، تو معلوم ہو گا" ابا کہتے۔

"خدا نہ کرے کہ کوئی ایسی چیز بنے جو بنائے تو کوئی اور اور نام ہو جائے میرا" بھائی جان طنز سے بجھے ہوئے لہجے میں کہتے۔

"اگر تمہیں اس ملک سے اتنی ہی چڑ ہے تو تم یہاں سے کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے" ابا غصہ ہو کر کہتے۔

مسلم کا کوئی وطن نہیں ہے
اس کا مقام ہر کہیں ہے

بھائی جان علامہ اقبال کے شعر سے غلط دلیل لاتے۔

"او ہو تو آپ خود کو مسلم بھی سمجھتے ہیں" ابا بھنویں چڑھا کر پوچھتے۔

"کیوں؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟" بھائی جان سوال کرتے اور پھر گفتگو پنکچر ہو جاتی۔ یا اس غبارے کی طرح ڈولتی ڈگمگاتی ادھر ادھر پھرنے لگتی جسے ہوا بھر کر باندھے بغیر چھوڑ دیا گیا ہو۔

ایک دن حد ہو گئی۔ ہوا یوں کہ لاہور سے ہمارے یہاں کچھ مہمان آئے۔ ابا نے بھائی جان سے کہا کہ انہیں کراچی گھما لاؤ۔ شام کو وہ سب سیر کر کے گھر لوٹے تو ابا ان سے سیر کے بارے میں پوچھنے لگے۔ بھائی جان پاس ہی بیٹھے اپنے جوتے اتار رہے تھے۔ یکایک گفتگو کے درمیان میں زور سے بولے۔

"اور آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کی قبر نے پچاسوں ایکڑ رقبہ گھیر رکھا ہے، اتنی جگہ میں تو ہزاروں فلیٹ بن سکتے ہیں اور ان میں لاکھوں بے گھر لوگ رہ سکتے ہیں" بھائی جان کا اشارہ قائداعظم کے مزار کی طرف تھا۔ یہ سنتے ہی ابا کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔

"کمینے ...... ذلیل جس آدمی نے تجھے، تیرے باپ کو، تیری پوری قوم کو گھر بنا کے دیا، عزت سے روٹی کمانے کے قابل بنایا، انہیں آزادی دلائی، تو اس کے بارے میں یہ کہتا ہے۔؟"

میں نے ابا کو زندگی میں پہلی بار کمینے اور ذلیل جیسے الفاظ استعمال کرتے دیکھا تھا۔ مہمانوں سمیت ہم سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔ امی نے ابا کے چیخنے کی آواز سنی تو "خدا خیر...... خدا خیر" کہتی ہوئیں باورچی خانے سے ہماری جانب دوڑیں۔

بھائی جان زنّاٹے کے ساتھ کھڑے ہوئے اور چپّل پہن کر گھر سے باہر چلے گئے۔

اس دن کے بعد ابا اور بھائی جان کے درمیان بول چال تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ وقت زندگی پر اپنے نقش چھوڑتا ہوا گزرتا رہا۔ بھائی جان نے سی ایس ایس کا امتحان دیا اور پورے ملک میں دوسری پوزیشن لی۔ انہیں فوراً ہی کسٹم میں ایک اچھے عہدہ پر ملازمت مل گئی۔ ابا اب بوڑھے ہو چکے تھے مگر وہ ہم نوجوانوں سے زیادہ کام کرتے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اپنی نسل کے دیگر بزرگوں کی طرح کبھی بھی اپنی اولاد یا کسی اور نوجوان کو اپنی محنت اور پھرتی سے متاثر یا شرمندہ نہیں کرتے تھے۔ ابا کے پاس بہت سے لوگوں کے برعکس علم بھی تھا اور ظرف بھی۔

پھر ایک امیر خاندان میں بھائی جان کی شادی ہو گئی۔ بھابی شکل و صورت کی جتنی اچھی تھیں عادتوں کی اتنی ہی مختلف نکلیں۔ انھوں نے دو ہی مہینوں میں ہمارے گھر میں اتنی برائیاں تلاش کر کے رکھ دیں کے ہمیں اپنا گھر کوئی بڑا سا کوڑے دان نظر آنے لگا۔ ہمارے گھر میں برائیاں تلاش کرنے کے لئے وہ اپنے والد صاحب کے گھر کی ایک ایک چیز، ایک ایک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتیں۔ میں بھابی کے ہر قصہ پر دل ہی دل میں ہنستا اور اس دن کا انتظار کرتا جب بھیا ہم لوگوں سے علیحدہ ہوں۔

اور وہ دن بھی آہی گیا۔ بھیا ہم سے علیحدہ ہو کر ایک اچھے سے کرائے کے مکان میں چلے گئے۔ خدا کا شکر کہ بھابی کی بہت کوششوں کے باوجود وہ سسرال میں رہنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ چند ہی ماہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ بھائی جان نے ایک ہزار گز کا پلاٹ خرید لیا ہے اور عنقریب اس پر ایک گھر تعمیر کرانے والے ہیں۔

علیحدگی کے کچھ دنوں بعد تک تو بھائی جان ہمارے یہاں نہ آئے مگر پھر آنا جانا ہو گیا۔ وہ ایک آدھ مہینے میں ہمارے یہاں آجاتے اور ہم بھی کبھی کبھار ان کے یہاں چلے جاتے۔

بھائی جان نے ایک اچھے انجینئر سے گھر کا نقشہ بنوانا شروع کر دیا تھا۔ جب نقشہ تیار ہو گیا تو بھائی جان کو تو وہ بہت پسند آیا مگر بھابھی کو ذرا بھی نہ بھایا۔ چنانچہ انجینئر صاحب نے دوسرے نقشے پر کام شروع کر دیا۔ لیکن اچانک انجینئر صاحب کو امریکہ کا گرین کارڈ مل گیا اور وہ فوراً ہی امریکہ چلے گئے اور مکان کا نقشہ ادھورا رہ گیا۔ چنانچہ بھائی جان نے دوسرے انجینئر سے نقشہ بنوانا شروع کر دیا۔

اس بار نقشہ بنا تو بھابھی کو بھی پسند آگیا۔ چنانچہ گھر کی بنیادیں بھروانے کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ ابھی بنیادوں کو بھروانے کا کام آدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے بھائی جان پر پلاٹ کے اوپر ناجائز قبضہ کا مقدمہ درج کروا کے عدالت کے ذریعے اس کام کو رکوا دیا۔ وہ کمپنی دراصل بھائی جان کے پلاٹ اور اس کے برابر والے پلاٹ پر ایک پلازہ بنانا چاہتی تھی۔ اس نے پہلے بھائی جان سے اس پلاٹ کو خریدنے کی کوشش کی مگر چونکہ پلاٹ بھیا کی سسرال سے بے حد قریب تھا اس لئے بھابی اسے کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ ہوئیں۔ بھائی جان اب تک خاصے امیر اور بارسوخ ہو گئے تھے، مگر کمپنی والے ان سے زیادہ بارسوخ اور مالدار تھے۔ بھیا کمپنی سے مقدمہ جیت گئے مگر اس جیت نے چار سال کھا لئے۔

بھائی جان کے گھر پر پھر کام شروع ہو گیا۔ گھر چوتھائی مکمل ہو چکا تھا کہ اجرت وغیرہ کے معاملے پر ٹھیکے دار کا گھر کی تعمیر میں لگے ہوئے مزدوروں سے جھگڑا ہو گیا۔ نتیجتاً مزدوروں نے بھیا کو آکر بتا دیا کہ گھر کی تعمیر میں ملاوٹ کا مال استعمال ہو رہا ہے۔ چنانچہ تعمیر رک گئی۔ بھیا نے ٹھیکے دار پر

جعل سازی کا مقدمہ کر کے اسے جیل بھجوا دیا۔ بھائی جان گھر کی تعمیر سے بہت بد دل ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ چوتھائی مکان ایک برس تک یونہی پڑا رہا۔

بھابی کے بہت ہمت بندھانے پر دوسرے ٹھیکیدار کی نگرانی میں دوبارہ گھر پر کام شروع ہوا۔ اس بار کام ٹھیک طریقے سے اور تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اس وقت تک بھائی جان کی اکلوتی اولاد سرمد آٹھ برس کا ہو چکا تھا۔ سرمد ذہانت میں اپنے ابو پر اور قائد اعظم سے محبت میں اپنے دادا پر گیا تھا۔ وہ ٹی وی پر قائد اعظم کی تصویر کو دیکھتا تو کھڑا ہو جاتا اور اسے سلوٹ کرتا۔ ایک دن وہ میرے ساتھ رکشہ میں قائد اعظم کے مزار کے سامنے سے گزرا تو مزار کو دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا ہے چاچو" ؟

"قائد اعظم" کا مزار" میں نے کہا۔

"مزار کیا ہوتا ہے" ؟

"پکی قبر"

"قبر کیا ہوتی ہے" ؟

"جس میں مرنے کے بعد آدمی کو دفن کیا جاتا ہے"

"تو کیا قائد اعظم مر گئے" سرمد نے پوچھا۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔

"ہاں بھئی بہت عرصہ ہوا۔ تمہیں تو معلوم ہے" میں نے جواب دیا۔

اچانک سرمد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنی زور سے کہ رکشہ والا رکشہ روک کر کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا کہ بچے کو کیا ہو گیا ہے؟

"قائد اعظم کیوں مر گئے...... کیوں مر گئے" سرمد نے روتے روتے کہا تو رکشہ والا آنکھیں پھاڑ کر سرمد کو دیکھنے لگا۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

سرمد کئی اعتبار سے عجوبہ بچہ تھا۔ قائد اعظم سے اس کی محبت پیدائشی بات تھی۔ ابا سرمد کو دیکھتے تو کہتے۔

"مثال تو غلط ہے مگر لگتا ہے کہ فرعون کے گھر میں موسیٰ پیدا ہو گئے ہیں" سرمد کو اپنے دادا سے بہت محبت تھی۔

بھائی جان کا مکان اسّی فیصد سے زیادہ مکمل ہو چکا تھا کہ ایک دن بھائی جان کو رشوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بھیا جیل چلے گئے۔ مقدمہ چلا اور الزام جھوٹا ثابت ہوا، مگر اس دوران ڈیڑھ برس اور

بیت گیا۔ اس دوران بھائی جان کے گھر کی تعمیر پھر رک گئی تھی۔

بھائی جان کا گھر اب ان کے لئے پریشانیوں کی پٹاری بن چکا تھا۔ انہوں نے جس دن سے گھر بنانے کا آغاز کیا تھا کوئی نہ کوئی مشکل ان کے پیچھے تھی۔

گزشتہ برسوں میں بھائی جان کی پریشانیوں نے بھائی جان اور بھابی کو ہم سے خاصا قریب کر دیا تھا۔ بھابی اب خاصی بدل گئی تھیں۔ وہ اب ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے یہاں آنے لگی تھیں۔ ابا نے جنرل اسٹور ملازموں پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایم اے کے بعد ملازمت کر لی تھی۔

بھائی جان رشوت کے کیس سے باعزت طور پر بری ہو کر آئے تو ہمارے یہاں ہی ٹھہرے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک بھابی نے گھر کی بات چھیڑ دی۔ بھائی جان بھڑک اٹھے۔

"بھاڑ میں گیا گھر۔ مجھے ایسا منحوس گھر نہ تو بنوانا ہے اور نہ اس میں رہنا ہے"۔

"غصہ نہیں کرتے بیٹے" ابا نے مدہم لہجے میں کہا۔

"اباجی دس برس سے زیادہ ہونے کو آئے، مگر یہ گھر ہے کہ مکمل ہی نہیں ہو رہا اور اوپر سے طرح طرح کی مصیبتوں نے ہمیں تاک لیا ہے"۔

ابا کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں، پھر بولے۔

"بات کرنے کی تو نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس موقع پر کرنے کی نہیں مگر ذرا غور کرو تم ان برسوں میں لاکھ کوششوں کے باوجود ایک گھر نہیں بنا سکے اور قائداعظم نے صرف سات برسوں میں کروڑوں لوگوں کو ایک ملک بنا کر دے دیا۔ لاکھوں میل کے رقبہ پر پھیلا ملک" یہ کہہ کر ابا خاموش ہو گئے بھائی جان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بہت دیر تک سب خاموش بیٹھے رہے، پھر اچانک سرمد بولا۔

"دادا چاچو کہہ رہے تھے کہ قائداعظم مر گئے ہیں کیا واقعی قائداعظم مر گئے ہیں"؟ ابا نے سرمد کو گود میں بٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگے۔ بھائی جان اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ان کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت دیر تک یونہی بے چینی کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ اس دوران کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ پھر سب خاموشی سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔

اگلے چار ماہ میں بھائی جان کا گھر مزید کسی مشکل کا سامنا کئے بغیر مکمل ہو گیا۔ بھائی جان نے ہم تینوں کو اپنے ساتھ چل کر رہنے پر اصرار شروع کر دیا۔ ایک روز ابا ان کی یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"بھئی اوروں کو تو تم جب چاہو لے جاؤ مگر میں تمہارے ساتھ اسی وقت رہوں گا جب تم قائد اعظم کو قائد اعظم مانو گے۔"

بھائی ابا کی بات سن کر دھیرے سے ہنسے اور پھر ابا کی جانب بڑھتے ہوئے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب سے بٹوہ نکالا اور پھر ابا کو کچھ دکھانے لگے۔ بھائی جان کی پیٹھ ہماری جانب تھی اس لئے ہمیں کچھ معلوم نہ ہوا۔ بھائی جان سامنے سے ہٹے تو ابا کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔ میں کچھ نہ سمجھنے کی حالت میں کھڑا تھا کہ سرمد میرے پاس آیا اور دھیرے سے بولا۔

"چاچو پتہ ہے ابو نے دادا کو کیا دکھایا ہے"؟

"نہیں بھئی مجھے کیا معلوم"

"قائد اعظم کی تصویر" سرمد نے آہستہ سے کہا

میں نے چونک کر بھائی جان کو دیکھا۔

ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ معلوم نہیں ندامت کی وجہ سے یا قائد اعظم کی تصویر کے احترام میں۔

عجیب اتفاق

مرسلہ: روبینہ منظور۔ مخدوم پور

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے بیلجیم کے شہر فلینڈر میں سمر فورڈ نامی ایک میجر پر بجلی گری۔ بجلی نے اسے فوجی ملازمت کے قابل نہ چھوڑا۔ اس واقعے کے چھ سال بعد سمر فورڈ، وانکوور کے مقام پر مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا، یہاں ایک بار پھر اس پر بجلی گری۔ اس بار اس کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا پورے دو سال تک علاج ہوتا رہا، اس طویل علاج کے بعد وہ تھوڑی بہت چہل قدمی کے قابل ہو گیا لیکن صرف چند روز بعد بجلی پھر اس پہ گر پڑی۔ اب کے سمر فورڈ بری طرح بیمار پڑا اور کسی کام کے لائق نہ رہا۔ کوئی دو سال بعد وہ بیماری ہی میں انتقال کر گیا۔

۱۹۳۴ء کی ایک طوفانی رات کا واقعہ ہے۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اچانک بجلی کڑکی اور زبردست جھماکے سے وانکوور کی ایک قبر پر گری۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ قبر میجر سمر فورڈ کی تھی؟

۳۰ جون ۱۹۷۶ء کو ایک انسٹھ سالہ شخص کریکمور اپنی کار میں گھر جا رہا تھا۔ سپر ہائی وے پر اس کی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا۔ کار بے قابو ہو کر ٹیلی[illegible] کے [illegible] سے [illegible] ٹکرائی۔ کریکمور کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی پچکی ہوئی کار کے قریب کھڑا ہوا ٹریفک [illegible] کو [illegible] تفصیلات بتا رہا تھا، اچانک وہی کھمبا ایک دھماکے سے اس پر آ گرا۔ کریکمور کی موت واقع ہوئی۔

لطف - لذّت - ذائقہ
ہوئیسٹ ®
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش - ہوئیسٹ کی تلاش
اور سب ٹھنڈا ٹھنڈا
450 GRAMS
HOEST ® DROPS
delicious
cool
refreshing
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

پرکٹی لڑکیوں سے کہنا ہے بال ہیں تو ہمارا گہنا ہے

پاکستانی بچی
اور
انگریز خاتون میں
لمبے بالوں کا
مقابلہ

برطانوی خاتون ایلن باؤن نے اپنے ۶ر فٹ ۳ر انچ لمبے بالوں کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت پائی۔ انہوں نے گزشتہ ۳۰ر سالوں میں کبھی اپنے بال نہیں کٹوائے۔ ایلن کی یہ تصویر امریکی رسالے نیشنل انکوائرز نے شائع کی۔

کراچی میں رہنے والی ۱۱ر سالہ بچی منیشرا نے ایلن کے لمبے بالوں سے مقابلے کی تیاری شروع کر دی ہے۔ ان کی عمر گو ابھی ۱۱ر سال ہے لیکن ان کے بال ابھی سے ٹخنوں کو چھونے لگے ہیں۔ تفصیلات سامنے کے صفحے پر پڑھیے۔

جب بھی
چاہا
بالوں کو
چادر کی
طرح سے
اوڑھ
لیا

منیشرا کی چھوٹی بہن بہار منیشرا کے لمبے بالوں کو سنوار رہی ہے

گو لڑکی ہوں میں
چھوٹی سی پر
بال ہیں
میرے
بڑے بڑے

لمبے بالوں
کا بین الاقوامی
ریکارڈ
قائم کرنا
میرا عزم ہے

گیسو دراز پاکستانی بچی

تعارف ...... ابن فضل کریم

اپنے دوست عبداللہ کا فیملی البم دیکھتے دیکھتے میں ایک تصویر پر ٹھہر گیا...... یہ تصویر اس کی دس سالہ بچی منیژہ کی تھی۔ تصویر میں منیژہ کے بال اس کے ٹخنوں کو چھو رہے تھے...... میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ منیژہ نے اپنے بالوں کے ساتھ کوئی وِگ لگا کر محض شرارت کے موڈ میں یہ تصویر بنوائی ہے۔ یہ تاثر شاید اس لئے بھی تھا کہ میں نے منیژہ کے بال کبھی کھلے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ منیژہ کی امی اس کے چٹیا کرنے کے بعد چٹیا کو بھی لٹکا نہیں رہنے دیتیں بلکہ اس کی دو تین تہیں بنا کر اس طرح کر دیتیں کہ کسی کو اس کے لمبے بالوں کا احساس تک نہ ہوتا۔

منیژہ کی تصویر نے میرے تجسس کو بیدار کیا تحقیق پر پتہ چلا کہ منیژہ کے بال واقعی بہت لمبے ہیں۔ یہ اس کے فطری بال ہیں جو ہنوز تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں۔ منیژہ کے لمبے اور خوبصورت بال اسے اپنی امی کی طرف سے ورثے میں بھی ملے ہیں۔ منیژہ کی امی نے بتایا کہ نہ صرف میرے بلکہ میری امی کے بال بھی لمبے ہیں۔ منیژہ کا ارادہ ہے کہ وہ لمبے بالوں کے بین الاقوامی مقابلے میں شریک ہو اور ورلڈ ریکارڈ قائم کرے۔ پاکستان کے نام کو بلند کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ نہ صرف بالوں کو بنانے سنوارنے میں احتیاط کرتی ہے بلکہ ان کی خدمت بھی کرتی ہے تاکہ یہ مسلسل بڑھتے رہیں۔ منیژہ اسکول کی ہونہار طالبہ ہے۔ ہر سال پہلی پوزیشن لینا معمولی بات ہے۔ منیژہ کی ایک چھوٹی سی پیاری سی بہن ہے "بہار جان"۔ مگر بہار کے بال تو اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ منیژہ کا بھائی معلوم ہوتی ہے۔ بہار کا کہنا ہے کہ وہ تھوڑی سی اور بڑی ہو جائے تو پھر وہ بھی منیژہ کی طرح بڑے بڑے بال رکھے گی۔

زندہ دلی

سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان کے نوے ہزار سے زیادہ فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے تھے۔ قیدیوں میں مشہور ادیب بریگیڈیر صدیق سالک مرحوم بھی شامل تھے۔ انہوں نے بھارتی قید کے حالات اپنی کتاب "ہمہ یاراں دوزخ" میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہم نے اپنے کیمپ میں واپس آنے کے بعد بھی کیمپ ۴۴ کے سینئر بلاک اور کیمپ ۸۸ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ سینئر بلاک میں جانے کے لئے کیمپ ۴۴ کے کیمپ کمانڈنٹ کی اجازت درکار تھی اور کیمپ ۸۸ تک رسائی پانے کے لئے دونوں کیمپوں کے کمان داروں کے علاوہ بریگیڈیئر ٹامس کی بھی رضامندی ضروری تھی۔ اتنی منازل کون طے کرے اور کیسے کرے؟ ہم نے رابطے کا ایک مختصر اور سہل طریقہ ایجاد کیا۔ وہ یہ کہ ہم نے اپنے کیمپ سے ایک رقعہ ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ باندھ کر "دیوار برلن" اور اس سے ملحقہ گارڈ کے خیموں کے پار پھینکا۔ پیغام کا متن یہ تھا۔ "ہیلو ہرکس وناکس! گذشتہ عید کے بعد سے آپ کی خیریت کی اطلاع نہیں ملی۔ مغربی محاذ بالکل خاموش ہے، اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔ ایسا ہی ایک میزائل پہلے بھی چھوڑا جا چکا ہے۔ اس کے سطح زمین پر اترنے کا علاقہ والی بال گراؤنڈ یا غسل خانہ ہے۔ اس سے ملتے جلتے میزائل کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر پیغام کا جواب آگیا۔ ایسے پیغامات کا تبادلہ دن میں دو تین بار ہوتا یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا لیکن تیسرے دن کسی میکانکی یا فنی خرابی کی وجہ سے یہ میزائل فیل ہو گیا۔ راستے میں پتھر سے لپٹا ہوا کاغذ اتر کر کہیں اور جا گرا اور دھاگے میں لپٹا ہوا پتھر سنتری کے ٹخنوں سے جا ٹکرایا۔ تفتیش شروع ہوئی اور پیغام رسانی کا یہ ذریعہ بھارتی حکام کے نوٹس میں آگیا لیکن وہ سزا کسے دیتے؟ پیغام دینے والے کا نام تو درج ہوتا نہیں تھا چنانچہ درمیانی چھت پر ایک سنتری متعین کر دیا گیا۔ لیکن ہم نے یہ مشغلہ چھوڑا نہیں۔ صرف طریقہ کار میں ذرا تبدیلی کر لی۔ اب ہم پتھر کا کام والی بال سے لیتے۔ ہم والی بال کی ہوا خارج کر کے اس میں رقعہ اور بعض اوقات پوری کتاب یا رسالہ ڈال کر کیمپ ۸۸ میں پھینکتے اور درمیانی چھت پر متعین پہرے دار سے کہتے۔ "سنو، ذرا ادھر کہنا کہ والی بال میں ہوا بھر دیں، ہمارے پاس پمپ نہیں ہے۔" پہرے دار پیغام پہنچا دیتا۔ کیمپ ۸۸ والے تحائف قبول کر لیتے اور شکریئے کی پرچی سمیت والی بال ہوا بھر کر واپس پھینک دیتے۔ جب ان کا ارادہ جوابی تحائف بھیجنے کا ہوتا تو وہ یہ چیزیں ہمارے خالی والی بال میں ٹھونس کر واپس پھینک دیتے اور سنتری سے کہتے۔ "انہیں کہو کہ ہمارا پمپ خراب ہے کوئی اور بندوبست کریں۔"

منیر احمد راشد

کھوٹا سِکّہ

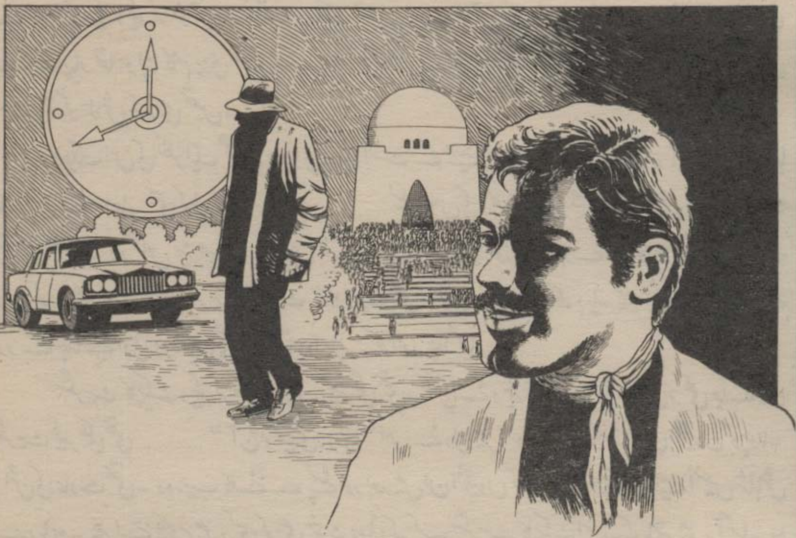

یہ ۱۴ اگست کی صبح کا قصہ ہے۔ وہ مزارِ قائد کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا جہاں جوتوں کی نگرانی کرنے والا ٹھیکیدار اور اس کے کارکن بڑی مستعدی سے لوگوں کے جوتے اُتروا رہے تھے۔ لوگ جوتے اُن کے حوالے کرتے اور واپسی کا ٹوکن وصول کر کے ہنستے باتیں کرتے مزار کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر عجیب سے جوش، پریشانی، خوشی اور خوف کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ لوگ قہقہے لگاتے لگاتے یکدم چونک کر یوں ادھر ادھر دیکھنے لگتے جیسے ابھی کچھ ہونے والا

ہے۔ حالات ہی ایسے تھے۔ آئے دن کے ہنگاموں، فائرنگ اور قتل و غارت گری نے ہر کسی کے دل میں خوف پیدا کر دیا تھا۔ بات اب لسانی اور گروہی فسادات سے بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ قصہ بھی فرسودہ ہو گیا تھا کہ لوگ کار یا موٹر سائیکل پر آتے اور فائرنگ کرتے ہوئے چلے جاتے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ دہشت پسند مسافروں سے لدی پھندی کسی بس کو کسی سنسان جگہ پر روکتے اور چاروں طرف سے اس پر گولیوں کی بارش کر دیتے اور ذرا سی دیر میں دن بھر کے تھکے ماندے غریب مزدوروں کا لہو بس کو رنگین کرتا ہو سڑک پر پھیل جاتا۔

بارونق سڑکوں اور بازاروں میں آئے دن بم کے دھماکے ہوتے رہتے تھے۔ خصوصاً ہر طرح کے کاروبار بہت متاثر تھے۔ اس کا دھندا بھی چوپٹ تھا۔ آج وہ ایک امید لے کر گھر سے چلا تھا۔ اور اتنے ہجوم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ ایک بہترین جیب تراش تھا۔ اسے اپنی لامبی فنکارانہ انگلیوں سے بہت پیار تھا جو اپنا کام بڑی مہارت سے کرتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کی ماہر نگاہیں کسی "موٹی آسامی" کو تلاش کر رہی تھیں۔

اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ اگست کے مہینے میں پینٹ کوٹ پہنے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ بھی کوئی کالا انگریز ہے.......... لیکن اس کی ابھری ہوئی جیبیں دراصل اس کی توجہ کا مرکز بنی تھیں۔ وہ شخص سیڑھیوں کے پاس آیا اور اپنے بوٹ اور موزے اتارے۔ موزوں کو جوتوں کے اندر رکھا۔ پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور وہ بھی جوتوں کے اندر رکھ دیا۔ جیسے سگریٹ کو مزار کے اندر لے جانا بے ادبی ہو۔ پھر وہ شخص ٹہلتا ہوا مزار کے اندر چلا گیا..........

سگریٹ کا پیکٹ دیکھ کر اُس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ جوتوں میں رکھی جانے والی سگریٹ غیر ملکی تھی.......... "آج تو عیاشی ہو گئی" اس نے دل میں سوچا اور بے اختیار اپنی انگلیوں کو چوما۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ وہ جیب کاٹنے سے پہلے اور بعد میں ان انگلیوں کو ضرور چومتا تھا۔ جیسے انہیں شاباش دے رہا ہو۔ پھر اتنے ہجوم میں کسی کو بھی خبر نہ ہوئی کہ کب سگریٹ کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ پیکٹ لے کر نیچے گھاس کے میدان میں آیا اور ایک نسبتاً کم آباد جگہ پر بیٹھ کر بڑے مزے سے اس کو کھولنے لگا۔ سیٹی میں وہ کوئی فلمی دھن بھی بجاتا جا رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی پیکٹ کھلا تو سیٹی کے ساتھ ساتھ اس کی سانس بھی رک گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں پھیل گئی تھی۔.......... اس پیکٹ میں ایک بم تھا۔ "ریموٹ کنٹرول بم۔" اس نے سوچا انگریزی فلموں میں ایسے ہی بم ہوتے ہیں۔ کوئی شخص کہیں دور بیٹھ کر ایک بٹن دباتا ہے اور بم زوردار دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ فلموں میں دیکھے ہوئے بیسیوں مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم

گئے۔ دھماکے ، دھماکے ، دھماکے .... وہ یکدم چونک کر بم کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ ابھی پھٹ جائے گا .... اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

"کیا وہ چیخ چیخ کر سب کو بتادے کہ یہاں بم ہے ؟" اس نے سوچا۔ ایسے تو لوگ بد حواس ہو کر بھاگیں گے اور ہجوم میں بہت لوگ کچلے جائیں گے۔ پھر یہ بات بھی تو تھی کہ لوگوں کے بھاگ جانے سے اس کا دھندا خراب ہوتا۔

آج پھر ایک دھماکہ ہو گا۔ بیسیوں انسان مریں گے۔ پھر ہنگامے ، کرفیو ، کاروبار بند........... نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ .... پھر اچانک ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا ، "کہیں یہ غیر ملکی تخریب کار تو نہیں ؟" اخباروں میں ہر روز ان کا تذکرہ ہوتا تھا مگر اس نے آج تک کسی تخریب کار کو نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں ممکن ہے یہ کالا انگریز میرے دیس کا دشمن ہو اور ہمارے لوگوں کو قتل کرنا چاہتا ہو........... نہیں .... میں اس کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس کے اندر یکدم حب الوطنی کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور مزار کے اندر کی طرف لپکا۔ جلد ہی اسے وہ کوٹ والا نظر آ گیا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔

"کیا وہ بٹن دبانے والا ہے ؟" یہ سوچ کر ہی اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ لیکن کوٹ والے نے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا اس میں کیلکولیٹر جیسا آلہ تھا۔" فلموں میں ایسے ہی آلے کا کوئی سرخ بٹن دبا کر بم بلاسٹ کیا جاتا ہے۔" اس نے پھر سوچا اور تیزی سے اس کوٹ والے کی جانب بڑھا۔ اس کے اعصاب بُری طرح تنے ہوئے تھے۔ وہ ہر لمحے دھماکے کا منتظر تھا۔ لیکن شاید کوٹ والے نے بھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا وہ اسے سی آئی اے والا سمجھا تھا اسی لئے اس نے وہ کیلکولیٹر نما آلہ دوبارہ جیب میں رکھ لیا ....

"یہ دیکھ کر ایک گہری سانس اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔ کوٹ والے نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور پھر یوں مزار کے عین اوپر لگے ہوئے سونے کے فانوس کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس نے اُسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا ہی نہ ہو........... پھر وہ دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے باہر کی جانب چلنے لگا۔ یہ بھی بلکہ اس کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ کیوں کہ یہ اسے کیلکولیٹر دوبارہ نکالنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنی انگلیوں کو چوما۔ اسی وقت کوٹ والے نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا .... اس کے اعصاب دوبارہ تن گئے اور رونگٹے کھڑے ہو گئے........... ہر لمحہ یوں لگ رہا تھا کہ اب دھماکہ ہوا .... چند لمحے صدیوں کے برابر ہو گئے تھے۔

کوٹ والے نے جیب سے ہاتھ نکالا۔ اس میں سگریٹ کا پیکٹ دبا ہوا تھا۔ ایک بار پھر اس نے گہری سانس خارج کی۔ کوٹ والے نے رک کر ایک سگریٹ سلگایا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لگاتا ہوا بے پرواہی سے آگے بڑھنے لگا۔ اب کوٹ والے سے اس کا فاصلہ ایک قدم کا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے پیچھے کے گیٹ کی جانب آ گئے تھے جہاں سے سڑک اسلامیہ کالج کی طرف جاتی ہے۔ کوٹ والا اپنے جوتوں کی پروا کئے بغیر ننگے پاؤں ہی سڑک پر آ گیا۔ تھا۔ وہ اب بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ پھر ایک کار اس کوٹ والے کے پاس آ کر رکی اور وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔

کار میں بیٹھتے ہی اس نے کیلکولیٹر نما آلہ نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کیا جیسے اس کی ناکامی پر طنز کر رہا ہو............ کار تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لاشعوری طور پر بڑے پیار سے اپنی انگلیوں کو چوما۔ بلاشبہ یہ پیار کے قابل تھیں۔ کیوں کہ انہوں نے بڑی صفائی سے وہ بم اس کوٹ والے کی جیب میں منتقل کر دیا تھا۔

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے ——————

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ہمارے قائداعظم

غ۔ع۔طاہر بیل

○ ...... قائداعظم والدہ محترمہ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ جب والدہ کا انتقال ہوا تو صدموں کے مارے ہفتوں بُری حالت رہی اور جب والد محترم کے رخصت ہونے کی خبر سنی تو بے ہوش ہوگئے۔

○ ...... محترمہ فاطمہ جناح بتاتی ہیں قائداعظم جب گورنر جنرل بنے تو ان کی میز پر کبھی دو سے زیادہ کھانے نظر نہ آئے۔ اکثر کہتے تھے، "جب میرے لاکھوں ہم وطن بھوکے رہ رہے ہیں تو مجھے طرح طرح کے کھانے کھانا کب زیب دیتا ہے۔"

○ ...... کم ایسا ہوا کہ بہن بھائی میں اختلاف ہوا ہو جب ہو جاتا تو بہن روٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی اور پھر تھوڑی دیر بعد بھائی کی آواز گونجتی "فاطمی، یہاں آؤ۔" لیکن جواب نہ پاکر کسی کے سامنے سر نہ جھکانے والے خود چل کر چھوٹی بہن کے پاس جاتے اور انہیں منا کر لے آتے۔ جناح مرحوم خود بہت لاغر اور نحیف تھے لیکن چونکہ آہنی عزم کے مالک تھے اس لئے جب بھی کسی ملازم کو چنتے تو وہ جسمانی لحاظ سے بہت صحت مند ہوتا۔

○ ...... مشہور تاجر حاجی عبدالکریم، قائداعظم کو اپنے مقدمے کی پیروی سپرد کرنا چاہتے تھے انہوں نے سارے مقدمے کے پانچ ہزار روپے پیش کئے۔ قائداعظم کی فیس ان دنوں پانچ سو روپیہ روزانہ تھی۔ تین دن میں وہ مقدمہ جیت گئے اور صرف پندرہ سو روپے رکھ کر باقی رقم اپنے موکل کو واپس کر دی۔ دیانتداری اور اصول پرستی کی اعلیٰ مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ان کے ہاں صبح ہی گیا۔ ملازم کو اطلاع کرنے کو کہا تو ملازم نے آکر کہا کہ اس وقت اندر جانے کی اجازت نہیں آپ یہیں ٹھہریں چونکہ مجھے ضروری کام تھا اس لئے خود اندر چلا گیا تو ایک کمرے سے مجھے بلک بلک

کر رونے کی آواز آئی۔ آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی اس لئے پریشان ہوا پردہ اٹھایا تو دیکھا سجدہ ریز ہیں۔بیقراری سے کچھ دعامانگ رہے ہیں میں دبے پاؤں واپس آگیا۔

○ ...... قائداعظم کو یہ تجویز پیش کی گئی کہ جمعہ کی نماز لندن کی کسی مسجد میں پڑھیں۔آپ نے ایسٹ اینڈ کے غریب مسلمانوں کی آباد کی ہوئی مسجد منتخب کی۔ جب وہاں پہنچے تو خطبہ ہو رہا تھا لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے اور اگلی صف میں جگہ خالی کر دی تو آپ فرمایا "میں دیر سے آیا ہوں اس لئے آخری صف ہی میرے لئے مناسب ہے۔"

○ ...... دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں کسی نے نعرہ لگایا "شاہِ پاکستان زندہ باد"۔ قائداعظم فوراً بولے "پاکستان میں کوئی بادشاہ نہ ہوگا۔ وہاں سب مسلمان برابر ہونگے۔"

○ ...... شہید ملت خان لیاقت علی فرماتے ہیں کہ بارہ برس قائداعظم کے ساتھ رہ کر میں نے چند باتیں جو سیکھیں وہ یہ ہیں اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہو جس پر عمل کرنے سے تم قاصر ہو اور تم سمجھتے ہو کہ کسی بات میں تم راستی پر ہو تو دشمن کے آگے نہ جھکو خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔

○ ...... مسلم لیگ کا اجلاس (۱۹۴۶ء) دہلی میں ہورہا تھا۔ سر فیروز خان نون نے اپنی تقریر انگریزی میں شروع کی تو ہر طرف سے شور ہوا! "اردو، اردو" اس سے مجبور ہو کر انہوں نے کچھ جملے اردو میں کہے اور پھر وہی انگریزی۔ پھر "اردو، اردو" کا شور بلند ہوا تو بولے "مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔" یہ سن کر قائداعظم کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح وصاف الفاظ میں فرمایا "سر فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔"

○ ...... ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جب ملک کو فیڈریشن کی پیشکش ہوئی تو قائداعظم نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اس پر برطانوی وزیراعظم لارڈ ریمزے میکڈانلڈ نے قائداعظم کو بلایا اور کہا کہ لارڈ کا خطاب مل سکتا ہے اور صوبے کی گورنری مل سکتی ہے اگر آپ فیڈریشن کی مخالفت ترک کر دیں۔ اس پر قائداعظم بغیر کوئی جواب دیئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ برطانوی وزیراعظم حیران ہوا اور دروازے تک الوداع کہنے آیا جب برطانوی وزیراعظم مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو قائداعظم نے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی وزیراعظم مارے خجالت کے پسینے سے شرابور ہوگیا اور بولا "آخر یہ کیوں"۔ آپ نے فرمایا "میں آپ سے کبھی نہ ملوں گا آپ کے خیال میں میں کوئی بکاؤ مال ہوں؟"

○ ...... مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا۔

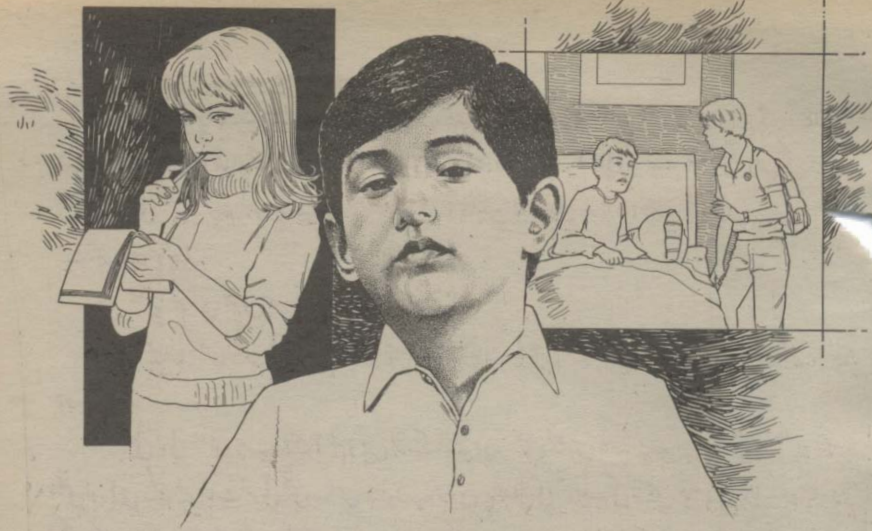

نیلی آنکھیں

محمد عمر احمد خاں

وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ بہت اچھی تھی بلکہ اس لئے اچھی لگتی تھی کہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ جیسا سمندر ہوتا ہے اور جیسا آسمان کا کلر ہوتا ہے نیلا، بالکل اسی طرح اس کی آنکھیں تھیں نیلی، نیلی۔

نیلی آنکھیں میری کمزوری تھیں۔ ہر وہ شخص مجھے اچھا لگتا جس کی آنکھیں نیلی ہوتیں۔ میرا دل چاہتا کہ دنیا کے وہ سب لوگ میرے دوست بن جائیں جن کی آنکھیں نیلی ہوں۔

اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور اس کا نام بھی اتفاق سے نیلی ہی تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ سات سمندر پار کے ملک برطانیہ سے آئی تھی۔ اس کے ابو کوئی بڑے افسر تھے جنہیں پاکستان بھیجا گیا تھا۔

نیلی جب نئی نئی کلاس میں آئی تو سب میں گھل مل گئی سب کو اس نے "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہا لیکن مجھے اس نے نظر انداز کر دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے رویئے سے بہت دکھ ہوا۔ میرا تو خیال یہ تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی ہاؤ ڈو یو ڈو کہے گی، مجھ سے بات کرے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔

ویک اینڈ پر جانے سے ایک دن پہلے جب کہ ہاف ٹائم ہو چکا تھا اور میں کلاس روم میں اکیلا بیٹھا حساب کا کام کر رہا تھا اچانک کوئی میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں نے کاپی پر سے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، وہ نیلی تھی۔ چند لمحوں تک تو مجھے یقین نہ آیا لیکن پھر یقین کرنا پڑا جب آنکھیں پٹ پٹا کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم کسی کھیل کود میں حصہ نہیں لیتے؟"

"کیوں نہیں لیکن آج کل میرے ٹیسٹ ہونے والے ہیں" ۔ میں نے نیلی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

نیلی بولی "اوہ بہت اچھے! تم ذہین لڑکے لگتے ہو۔ میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔" وہ انگریز تھی اور اسی لہجے میں بات کرتی تھی۔ اس نے جب میری پڑھائی کی تعریف کی تو میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر مجھے کام کرتا دیکھتی رہی پھر بولی:

"کیا تمہارا کام ختم نہیں ہوا؟"

"کیوں؟" حیرت سے میں نے پوچھا۔ وہ بولی۔

"میں بیڈمنٹن کھیلنا چاہتی ہوں اور مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے، کیا تم میرے ساتھ کھیلنا پسند کرو گے؟" مجھے نیلی کے اچانک مہربان رویے پر حیرت ہو رہی تھی چنانچہ کچھ دیر کے تامل کے بعد میں نے کہا۔

"تمہیں تھوڑی دیر میرا انتظار کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" کچھ ہی دیر بعد میرا کام ختم ہو گیا۔ میں نے کاپی اور کتاب بند کر کے بستے میں رکھیں اور نیلی سے کہا۔

"چلو"۔ اس دن میں نے نیلی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلا۔ کھیل کے اختتام پر نیلی بولی۔

"تم اچھے کھلاڑی ہو۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میری تمہارے ساتھ دوستی ہو گئی ہے۔" نیلی کے دو تعریفی جملوں سے مجھے خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں مجھے نیلی سے یہ پوچھنا بھی یاد نہ رہا کہ جب وہ کلاس میں آئی تھی تو اس نے مجھے ہاؤ ڈو یو ڈو کیوں نہیں کہا تھا۔ چھٹی ہوئی تو نیلی میرے پاس آئی اور بولی۔

"برائے مہربانی مجھے اپنی مشق بک دو۔ مشق نمبر ۱۱ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"مشق نمبر ۱۱ تو بالکل آسان ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔" کچھ سوالات اس کی سمجھ

میں آئے اور کچھ نہیں۔ بہرحال میں نے اسے اچھی طرح مطمئن کر دیا اور چلتے وقت اپنی حساب کی کاپی بھی اسے دے دی۔

نیلی کے ساتھ اب پکی دوستی ہو گئی تھی۔ اسکول میں ہر جگہ ہم ساتھ نظر آتے۔ پڑھتے لکھتے، کھیلتے کودتے۔

نیلی حساب میں بے حد کمزور تھی جبکہ میں حساب میں بہت تیز تھا۔ نیلی کی سمجھ میں جب کوئی سوال نہ آتا تو وہ بار بار مجھ سے اس سوال کا صحیح حل سمجھتی اور میں اسے حساب سمجھانے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتا۔

ایک روز جبکہ نیلی مجھ سے حساب کے سوالات سمجھ رہی تھی اور میں بڑی دیر سے اسے سوالات کے صحیح حل سمجھا رہا تھا اچانک کاپی پر سے سر اٹھا کر نیلی نے کہا۔

"میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں"۔

نیلی مسکرا کر بولی۔ "کیا میں تمہارے کسی قریبی رشتہ دار سے مشابہت رکھتی ہوں۔" نیلی کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں زور سے ہنسا اور ہنس کر میں نے نیلی کی بات کا جواب دیا۔ "اصل میں دنیا کا ہر وہ شخص میرا رشتہ دار ہے جس کی آنکھیں نیلی ہیں"۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں میرے ملک کے لوگ پسند آئیں گے کیونکہ وہاں تقریباً ہر ایک کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔"

"واقعی!"

"ہاں واقعی!"

"میری امی اور ابو کی آنکھیں بھی نیلی ہیں۔ تم ان سے مل کر یقیناً خوشی محسوس کرو گے۔" نیلی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں اس کے امی ابو سے ملا۔ وہ مجھے بہت اچھے لگے کیونکہ ان کی آنکھیں بھی نیلی تھیں اور ان کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا۔ وہ بڑی خوشدلی اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ ان سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

نیلی کو پاکستان اچھا لگا تھا۔ وہ کہتی کہ پاکستان بہت خوبصورت ملک ہے اور یہاں کے رہنے والے بھی بہت سادہ لوح، محنتی، ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں۔

سالانہ امتحانات نزدیک آگئے تھے میں اور نیلی پڑھائی میں خوب محنت کر رہے تھے۔ مجھے دوگنی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اس طرح سے کہ پہلے میں خود پڑھتا پھر نیلی کو پڑھاتا۔ ایک ایک سوال اسے

سمجھاتا۔ حساب میں تو نیلی اب بہت تیز ہو گئی تھی۔ الجبرا کے سوالات تو وہ منٹوں میں حل کر لیتی۔

امتحانات ختم ہوئے۔ نتیجہ آیا۔ کلاس میں ہمیشہ سے اول آنے والا لڑکا دوئم آیا تھا جبکہ برطانیہ سے آئی ہوئی انگریز لڑکی اوّل آ گئی تھی۔ نیلی آنکھوں نے مجھے اول سے دوئم کر دیا تھا۔

ہمیں اگلی جماعت میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن نیلی نے بتایا کہ وہ کل کی فلائٹ سے واپس اپنے ملک جا رہی ہے۔ نیلی کے واپس جانے کی خبر کا سن کر پوری کلاس اداس ہو گئی۔ سب سے زیادہ صدمہ تو مجھے ہوا۔ میں نے بڑے رنجیدہ لہجے میں نیلی سے کہا:

"تم اتنی جلدی پاکستان کیوں چھوڑ رہی ہو؟" میرا یہ سوال سن کر نیلی نے اپنے سر کے بالوں کو بڑی شان بے نیازی سے ایک طرف جھٹکا دیا پھر منہ بنا کر وہ بولی:

"اس لئے کہ مجھے پاکستان بالکل اچھا نہیں لگا۔ نہ ہی یہاں کے لوگ اچھے ہیں، تقریباً ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔" یہ جملے بولتی ہوئی نیلی مجھے پہلی والی نیلی سے بالکل مختلف لگی۔ پہلی والی نیلی تو پاکستان کی بڑی تعریف کیا کرتی تھی۔ اسے تو پاکستان کے لوگ بھی بہت اچھے لگتے تھے لیکن نہ جانے اب اسے کیا ہو گیا تھا۔

جب وہ اپنے ملک جانے لگی تو میں نے سوچا۔ یقیناً وہ میری دوستی کو یاد کرے گی اور یہ سوچ کر اطمینان تھا کہ کم سے کم ایک پاکستانی تو ایسا ہے جس کے متعلق اس کی رائے اچھی ہو گی۔ لیکن جاتے وقت اس نے جو جملے کہے ان سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "میں نے تم سے دوستی صرف اس لئے کی تھی کہ میں تم سے حساب سیکھنا چاہتی تھی ورنہ میں کبھی تم سے دوستی نہ کرتی کیونکہ کالے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں"۔

نیلی کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے اس نے میرے گال پر زور سے طمانچہ مار دیا ہو۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نیلی اتنی خود غرضی اور چاپلوسی سے کام لے گی۔ نیلی کے واپس برطانیہ چلے جانے کے بعد وہی نیلی آنکھوں والے لوگ جو مجھے پہلے بہت اچھے لگتے اب بہت برے لگنے لگے۔ نیلی آنکھوں سے مجھے اب نفرت ہو چلی تھی۔

ایک روز جب میں کلاس میں آیا تو پتہ چلا کہ ایک نیا انگریز لڑکا ہماری کلاس میں داخل ہوا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ وہ نیلی کا خالہ زاد بھائی تھا اور برطانیہ سے ہی آیا تھا اور اتفاق سے .... اس کی آنکھیں بھی نیلی تھیں۔ اسے دیکھ کر نفرت کی ایک شدید لہر میرے اندر پھوٹ پڑی۔ میرا دل چاہا کہ نیلی کے اس خالہ زاد بھائی کو اٹھا کر کلاس سے باہر پھینک دوں۔

نیلی کی طرح ٹام نے بھی بہت جلد کلاس کے تمام بچوں سے دوستی کر لی۔ وہ بہت ہنس مکھ اور

خوش مزاج لگتا تھا لیکن اس کی نیلی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی نیلی کی طرح خود غرض ہو گا۔

ٹام نے میری طرف دوستی کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس نے دوستی نہ کرنے کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو میں نے کہہ دیا کہ مجھے نیلی آنکھوں والے انگریزوں سے نفرت ہے۔

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ نیلی آنکھوں والے انگریز خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ میرے وطن سے اور میرے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں"۔

"لیکن میرے دوست میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے تو پاکستانی بہت اچھے لگتے ہیں"۔ ٹام نے یقین دلانا چاہا لیکن میں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ نگاہیں پھیرتے وقت مجھے ان آنسوؤں پر بھی ترس نہ آیا جو کہ ٹام کی آنکھوں میں میرے نفرت انگیز رویئے کی وجہ سے اُمڈ آئے تھے۔

ٹام جتنا میرے قریب آنا چاہتا میں اتنا ہی اس سے نفرت کا اظہار کرتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے رویئے سے دل برداشتہ ہو کر مجھ سے دوستی کا خیال اپنے دل سے نکال دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ میری ہر نفرت کا جواب اپنی بے پناہ محبت سے دیتا۔

اکثر جب میں کرکٹ کا میچ کھیل رہا ہوتا تو رنز بنانے کے دوران وہ میری وکٹ بچانے کے خاطر خود کو رن آؤٹ کرا لیتا۔ اسکول میں پریکٹس میچ کے دوران وہ تمام لڑکوں کو تیز گیندیں کراتا لیکن جب میں کھیلنے آتا تو وہ اپنی اسپیڈ کم کر دیتا اور مجھے آہستہ گیندیں کراتا۔ میں اس کی آہستہ گیندوں پر زوردار چھکے چوکے لگاتا اور اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتتا۔

ٹام بھی حساب میں بے حد کمزور تھا۔ مس جب کاپیاں چیک کرتیں تو سب سے زیادہ ڈانٹ ٹام کو سننا پڑتی۔ وہ سر جھکائے مس کی ڈانٹ سنتا پھر کہتا "معاف کیجئے گا مس آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" وہ مجھ سے سوالات سمجھنا چاہتا لیکن میں ٹکا سا جواب دے کر کلاس سے باہر چلا جاتا۔ ٹام کلاس کے لڑکے اور لڑکیوں سے سوالات پوچھتا۔ وہ اسے سمجھاتے لیکن کوئی بھی اسے صحیح طور پر سمجھا نہ پاتا۔ ٹام بے بس صورت بنا کر میری طرف دیکھتا اور اس کی بے بسی دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوتی۔ اسے بے عزت ہوتا دیکھ کر مجھے ایک انجانی سی تسکین ملتی۔ یوں لگتا جیسے میں اس سے نہیں بلکہ نیلی اور اس کے ہم وطنوں سے انتقام لے رہا ہوں۔ میرے نفرت انگیز رویئے کی وجہ سے ٹام کی نیلی آنکھوں میں جب آنسو تیرنے لگتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نہیں رو رہا بلکہ نیلی رو رہی ہو۔

کبھی کبھی مجھے اپنے رویئے پر بے پناہ شرمندگی ہوتی اور میرا دل کرتا کہ میں ٹام سے اپنے بُرے رویئے کی معافی مانگ لوں۔ لیکن ایک دم میری نگاہوں کے سامنے نیلی کا چہرہ آجاتا اور میرے دل سے اچھائی کا جذبہ نہ جانے کہاں گم ہو جاتا۔

ایک صبح جب میں سو کر اٹھا تو بہت تیز بخار میں میرا جسم جل رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھنے لگا تو چکر سا آگیا اور میں نیچے گر گیا۔ امی دوڑی ہوئی آئیں۔ انہوں نے سہارا دے کر مجھے دوبارہ بستر پر لٹایا اور ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ ڈاکٹر نے آکر مجھے دیکھا۔ تھرمامیٹر منہ میں لگا کر میرا بخار چیک کیا۔ انجکشن لگایا، دوائیں لکھ کر دیں اور آرام کی ہدایت دے کر چلا گیا۔ اس دن میں اسکول بھی نہ جاسکا۔ چھٹی کی درخواست بھجوا دی اور بستر پر ہی لیٹا رہا۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد امی میرے لئے سوپ بنانے کچن میں چلی گئیں۔ میں آنکھوں پر ایک ہاتھ رکھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ بستر پر لیٹا ہوا تھا اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی بڑی آہستگی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا ہو۔ آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اور گردن گھما کر میں نے دیکھا۔ وہ ٹام تھا۔ بستہ اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا۔ میری بیماری کا سن کر وہ یقیناً اسکول سے سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف کرلیا۔

ٹام کی بھرائی ہوئی دھیمی آواز سنائی دی وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو کیونکہ میری آنکھیں نیلی ہیں، لیکن تمام نیلی آنکھیں خود غرض نہیں ہوتیں میرے دوست! تم مجھے آزما سکتے ہو۔"

میں نے گردن گھما کر ٹام کی طرف دیکھا۔ اس کے گال آنسوؤں میں بھیگ رہے تھے دوبارہ جب وہ بولا تو تب بھی وہ رو ہی رہا تھا۔ "تم مجھ سے جتنی نفرت کرو گے میں تم سے اتنی ہی محبت کرتا رہوں گا اور یہ ثابت کردوں گا کہ تمام نیلی آنکھوں والے خود غرض نہیں ہوتے" ٹام رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں خودغرضی نہیں تھی بلکہ خلوص و محبت کی پرچھائیاں روشن نظر آرہی تھیں۔ میری بیماری پر تڑپ اٹھنے کا جذبہ اس کی نیلی آنکھوں سے عیاں تھا۔ بے اختیار اپنی کم ظرفی پر میں شرمندہ ہو گیا۔

مجھے ٹام کے ساتھ اپنا بُرا سلوک یاد آنے لگا۔ میری ہی وجہ سے کئی دفعہ کلاس میں اسے ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ مجھ سے دوستی کی خاطر اس نے میرے لئے کتنی ہی قربانیاں دیں تھیں۔ اس کے باوجود میں نے اس کی ہر محبت کا جواب اپنی کم ظرف نفرت سے دیا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد آ گیا جب ایک روز چھٹی میں سڑک پار کرتے ہوئے ٹام نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اگر اس دن وہ مجھے اپنی طرف نہ کھینچتا تو تیز رفتار گاڑی مجھے سائڈ مارتی ہوئی گزر جاتی۔

ٹام کے ساتھ اپنے بُرے سلوک کو یاد کر کے میری آنکھیں شرمندگی کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے میں نے ٹام سے کہا۔

"مجھے معاف کر دو ٹام۔ مجھے معاف کر دو پلیز!" بستہ اپنے کندھے سے اتار کر اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میرے سرہانے کے قریب آ کر بڑی محبت سے ٹام نے میرے بھی آنسو پونچھ ڈالے۔ میں نے ٹام کی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں میرے لئے معافی، اپنائیت اور دوستی کا جذبہ نظر آرہا تھا۔

بے اختیار میں نے اپنے دونوں ہاتھ دوستی کے لئے ٹام کی طرف بڑھا دیئے جنہیں اس نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے گلابی ہاتھوں میں تھام لیا۔

ٹام کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ تھما دینے کے بعد مجھے پتہ چل گیا تھا کہ جس طرح ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح تمام نیلی آنکھوں والے لوگ بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وہ مجھ سے اور میرے وطن کے لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔

تاریخ جو خون سے لکھی گئی

"قائد اعظمؒ نے فرمایا کہ

"خدائے عظیم و برتر کی قسم جب تک دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنِ تنہا لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت ہے اور جسم میں خون کا ایک قطرہ موجود ہے۔"

مرسلہ ...... غلام عباس

میرا وطن

شبیر بیگ ناز

چاند تاروں سے خوشرنگ میرا وطن
جو بھی دیکھے رہے دنگ، میرا وطن
اس کی ندیاں ہیں گیتوں کی شہزادیاں
اس کے دریا ہیں سنگیت کے کارواں
نام سے اس کے میرا دھڑکتا ہے دل
واسطے اس کے جیتا ہے مرتا ہے دل
اس کی صبحوں میں صبح ازل کا سماں
اس کی شاموں سے لے رنگ سارا جہاں
ماں کی ممتا سی گرمی سے معمور ہے
اس کا دامن محبت سے بھرپور ہے
اسکے آنچل میں سردی بھی گرمی بھی ہے
ہے خزاں بھی بہاروں کی نرمی بھی ہے
سب رتیں خاص اللہ کا انعام ہیں
اللہ تعالیٰ کی چاہت کا پیغام ہیں
ہے تو چھوٹا سا یہ خطہ سر زمیں
اس کی زیبائی ڈھونڈے سے ملتی نہیں
میرے جذبوں میں اس کی لگن موجزن
میری آشاؤں میں ناز اس کی پھبن

منزل پاکستان

طاہر مسعود

اس شمارے کے ساتھ تحفتہً دیئے گئے کھیل 'منزلِ پاکستان' کھیلنے سے پہلے اس مضمون کو ضرور پڑھ لیجئے

قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا۔ "پاکستان تو اسی دن قائم ہو گیا تھا جس دن ہندوستان میں پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔"

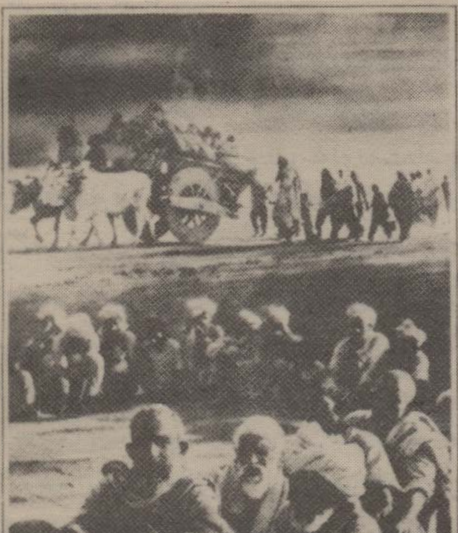

پاکستان ہندوستان اور بنگلہ دیش میں آج لگ بھگ ۴۰ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ لیکن آج سے بارہ صدی قبل اس علاقے میں ایک شخص بھی مسلمان نہیں تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ان بارہ صدیوں میں مسلمان اتنی تیزی سے دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر پر اس طرح چھا گئے کہ انہوں نے آٹھ سو سال تک حکمرانی کی۔ برصغیر میں اسلام دو طریقوں سے پھیلا۔ ایک تو صوفیاء کرام نے اسلام کی تبلیغ کی اور دوسرے مسلمان حملہ آوروں نے اس خطے میں دین کا چراغ جلایا۔

(اس مضمون میں ہم آپ کو صرف مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کے متعلق بتائیں گے)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سب سے پہلا حکمران محمد بن قاسم تھا جس نے اپنے چچا حجاج بن یوسف

کی ہدایت پر سندھ پر حملہ کر کے راجہ داہر کو شکست دی۔ راجہ داہر ایک گمراہ بادشاہ تھا جس نے اپنی بہن سے شادی کر رکھی تھی۔ محمد بن قاسم نے سندھ کے عوام کے ساتھ نہایت شفقت و محبت کا سلوک کیا جس کی وجہ سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ محمد بن قاسم جب سندھ سے رخصت ہو رہا تھا تو یہاں کے لوگ رو رہے تھے۔ انہوں نے عقیدت میں محمد بن قاسم کا مجسمہ بنا رکھا تھا۔ محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں سندھ آیا تھا۔ اس کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد امیر ناصر الدین سبکتگین نے ہندوستانی راجہ جے پال کو شکست دی اور کابل سے پشاور تک کا علاقہ فتح کر کے اسلامی حکومت قائم کی۔ راجہ جے پال نے اس جنگ میں سارے ہندوستانی راجوں مہاراجوں سے فوجی مدد مانگی تھی لیکن سبکتگین نے ایسی زبردست جنگی چال چلی کہ جے پال کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ سبکتگین کا ایک بے حد لائق اور بہادر بیٹا تھا محمود غزنوی...... اس کو فتوحات کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کئے لیکن ہر بار وہ یہاں کے راجاؤں کو شکست دے کر مندروں سے سونے جواہرات سمیٹ کر چلا گیا۔ اس نے ہندوستان پر مستقل حکومت نہیں کی۔

محمود غزنوی کے ہندوستان سے جانے کے بعد راجپوتوں نے سر اٹھایا اور لاہور پر حملہ کر کے اس حکمران کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی جسے محمود غزنوی مقرر کر کے گیا تھا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ اس عرصے میں ایک ایسا مرد مجاہد اٹھا جس نے ہندوؤں کے زبردست راجہ پرتھوی راج کے دانت کھٹے کئے اور ہندوستان میں اسلامی نظام حکومت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس کا نام محمد غوری تھا۔ محمد غوری نے ہندوستان سے جاتے ہوئے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ایبک دراصل محمد غوری کا غلام تھا۔ آپ ذرا غور کیجئے مسلمان بادشاہ اپنے غلاموں کو بھی بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا۔ اس نے خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی۔ کیونکہ اس کے بعد آنے والے بادشاہ بھی غلام تھے۔ ایبک نے صرف چار سال حکومت کی۔ (اس کا مزار بھی لاہور میں انار کلی بازار کی پچھلی طرف ہے) ایبک کے بعد شمس الدین التمش نے حکومت سنبھالی۔ وہ بہت خدا ترس قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس کے زمانے میں منگولوں نے تباہی مچا رکھی تھی۔ التمش نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں مار بھگایا۔ جب ۱۲۳۶ء میں التمش چل بسا تو اس کی بہادر بیٹی رضیہ سلطانہ نے تاج و تخت سنبھالا۔

رضیہ سلطانہ آج بھی ہمارے قصے کہانیوں کا موضوع ہے کیونکہ وہ ہندوستان کی پہلی تاجدار خاتون تھی جو دہلی کے تخت پر کسی سہارے کے بغیر تخت نشین ہوئی۔ ۱۲۴۶ء میں امیروں نے ایک درویش صفت شخص کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ بادشاہ اتنا نیک تھا کہ سرکاری خزانے کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا تھا۔ اس کا نام ناصر الدین محمود تھا۔ یہ اس قدر درویشانہ طبیعت رکھتا تھا کہ دربار میں جاتے ہوئے

شاہی لباس پہنتا اور تنہائی میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اسے بادشاہت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر غیاث الدین بلبن کو سونپ رکھا تھا۔ بلبن ہی ناصر کے بعد تخت نشین ہوا۔ بلبن کی زندگی بھی عجیب و غریب طریقے سے گزری تھی۔ وہ ترک امیر زادہ تھا۔ چنگیز خان کی فوج کے خلاف لڑنے میں گرفتار ہو گیا اور بغداد میں غلام کی حیثیت سے بکا۔ ایک بزرگ نے اسے خرید لیا۔ بلبن دہلی آیا۔ شروع میں معمولی سپاہی تھا بلکہ بہشتی اور فراش کا بھی کام کیا۔ اور یوں ترقی کرتے کرتے اس بلند ترین منصب تک پہنچا۔ بلبن نمازی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اس نے ملک کا نظم درست کیا اور انصاف قائم کیا۔ لیکن وہ بڑا سخت گیر بادشاہ تھا۔ سلطان بلبن نے اپنا جانشین اپنے بیٹے خان شیر کو بنایا تھا۔ بدقسمتی سے وہ منگولوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔ بلبن کو شہزادے کی موت کا اتنا دکھ ہوا کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا تھا۔ بلبن کا ایک اور بیٹا بغرا خان تھا لیکن اسے سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا بلبن کی موت کے بعد بغرا خان کا بیٹا کیقباد تخت پر بیٹھا۔ کیقباد انتہائی عیاش اور راہ راست سے بھٹکا ہوا شہزادہ تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حکومت ملی تو جامے سے باہر ہو گیا اور اپنی عیاشی سے سلطنت کو برباد کرنے لگا۔ باپ نے سمجھایا بجھایا لیکن باز نہ آیا۔ یہاں تک کہ اپنی بُری عادتوں کی وجہ سے فالج کے مرض میں مبتلا ہوا اور اسی حالت میں قتل ہوا۔

خاندان غلاماں کے بعد ہندوستان پر خلجی خاندان نے حکومت کی۔ جلال الدین خلجی اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ رحم دل، سادہ اور متحمل مزاج تھا۔ اس نے بڑھاپے میں حکومت سنبھالی تھی۔ مشہور ہے جب اسے پہلی بار شاہی محل میں لے جایا گیا تو وہ پرانے بادشاہوں کو یاد کر کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا جانشین علاؤ الدین خلجی ہوا جس کا مزاج بالکل مختلف تھا۔ جلال الدین خلجی کو جنگ و جدال سے نفرت تھی تو علاؤ الدین خلجی نے اپنے دشمنوں اور باغیوں کو وہ عبرتناک سزائیں دیں کہ سن کر جھرجھری آ جاتی ہے۔ لیکن اس کی اسی سختی کی وجہ سے سلطنت میں امن و امان قائم ہوا۔ اس نے گجرات، مالوہ اور دکن وغیرہ فتح کئے۔ اس سے پہلے اتنے وسیع رقبے پر کسی مسلمان بادشاہ کی حکومت نہیں رہی تھی۔

علاؤ الدین خلجی کے بعد حکومت اندرونی سازشوں کا شکار رہی۔ آگے چل کر غیاث الدین تغلق نے حکومت کو مضبوط کیا...... لیکن غیاث الدین تغلق کا جانشین محمد بن تغلق تخت پر بیٹھا تو اس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ملک کے کئی صوبے آزاد ہو گئے۔

محمد بن تغلق باصلاحیت بادشاہ تھا لیکن اس کے ظلم اور ناسمجھی کی وجہ سے سلطنت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ اس کے بعد فیروز تغلق بادشاہ ہوا جو اپنے نیک کاموں کی وجہ سے ملک کی تاریخ میں ممتاز

ہے۔ لیکن اس وقت تک حکومت دہلی کمزور ہو چکی تھی۔ اس دوران ملک پر تیمور بادشاہ کے حملوں کی وجہ سے بڑی تباہی مچی اور حکومت دہلی کا رہاسہا اقتدار بھی جاتا رہا۔ تغلق خاندان کا آخری بادشاہ محمد تغلق ۱۴۱۳ء میں مرا۔ جس کے بعد سادات خاندان برسراقتدار آیا۔اس خاندان نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی لیکن اس زمانے میں دہلی کی بادشاہت بہت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس خاندان کے آخری بادشاہ بڑے نااہل تھے۔ چنانچہ بہلول لودھی نے ۱۴۵۱ء میں دہلی پر قبضہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ بہلول لودھی نے اردگرد کے علاقوں کو فتح کیا...... اس کی وفات کے بعد سکندر لودھی نے تاج و تخت سنبھالا اور آگرہ شہر کی بنیاد رکھ کر اسے دارالخلافہ بنایا۔ اس کا بہت سارا وقت تو ہندو راجاؤں سے لڑتے بھڑتے گزرا۔

ہندوستان و پاکستان کی تاریخ کا سب سے پرامن اور شاندار زمانہ مغل دور کا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے آباؤ اجداد میں چنگیز خان ، ہلاکو خان اور تیمور جیسے ظالم و جابر بادشاہوں کے نام آتے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لیکن جب اسلامی ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے نہ صرف نظم ونسق کو درست کیا بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی علم وادب کی تاریخ میں شاندار اضافہ کیا۔

مغلیہ خاندان کی بنیاد سلطان ظہیرالدین بابر نے رکھی۔ اس نے ترکستان کے شہر فرغانہ سے آ کر کابل میں اپنی حکومت قائم کی۔ پھر ہندوستان کے امیروں کی دعوت پر یہاں آیا اور ۱۵۳۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کمزور تھی اور بہت سے صوبیدار خود مختار ہو گئے تھے۔ انہی میں ایک صوبیدار رانا سانگا تھا۔ بابر نے جب رانا سانگا کو للکارا تو رانا سانگا کی حمایت میں سارے ہندو راجا نکل آئے۔ ۱۵۲۹ء میں بابر کا مقابلہ رانا سانگا سے ہوا۔ رانا سانگا پونے دو لاکھ فوج کے ساتھ میدان میں آیا۔ بابر کی فوجوں کو پہلے تو شکست ہوئی جس سے اس کی فوج میں بددلی پھیل گئی لیکن پھر بابر نے ایک تقریر کی جس میں اس نے کہا کہ اگر ہم ہار گئے تو دنیا بھر کے مسلمان بادشاہ ہم سے نفرت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو کھو بیٹھے۔ جوانمردی کا تقاضہ ہے کہ ہم شہادت کے لئے تیار ہو جائیں۔

بابر کی اس تقریر سے فوج میں بڑا جوش پیدا ہوا اور سب نے "الجہاد" "الجہاد" کا نعرہ لگایا۔ اور دشمن پر ٹوٹ پڑے رانا سانگا کی فوجیں شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور بابر غازی قرار پایا۔ بابر صرف ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا اس کی لکھی ہوئی کتاب "تزک بابری" ایک بے نظیر کتاب ہے۔ وہ "خط بابری" کا موجد بھی تھا۔ اس نے اس طرزِ تحریر میں

کلام مجید کے کئی نسخے لکھے تھے اور مکہ معظمہ بھجوائے تھے۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی تیس سال کا نوجوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل۔ شیر شاہ سوری نے اسے شکست دے کر ایران کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال تک حکومت کی لیکن اس نے اپنی شاندار پالیسیوں اور رفاہ عامہ کے کاموں سے ملک کو خوشحال بنا دیا۔ مورّخین لکھتے ہیں کہ اگر اسے موت نہ آتی تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا اسلام شاہ سوری تخت پر بیٹھا لیکن ۱۵۵۴ء میں اس کے انتقال کے بعد ہمایوں دربار دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔

ہمایوں کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین محمد اکبر نے حکومت سنبھالی۔ اکبر یوں تو ان پڑھ تھا لیکن بلا کا ذہین اور باصلاحیت تھا۔ اس کے زمانے سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر نے جب حکومت سنبھالی تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو صوبے خود مختار ہو گئے تھے انہیں حکومت دہلی کے تابع کیا۔ اکبر نے ہندوستان کے تقریباً تمام ہی اہم علاقے فتح کر لئے اور انہیں مغل سلطنت کے دائرے میں شامل کر لیا۔ جب اس کی سلطنت بہت پھیل گئی تو اس نے اسے چلانے کے لئے ایک نظام مرتب کیا۔ — یہ نظام اتنا کامیاب تھا کہ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی اسی نظام کو قائم رکھا۔ پھر اکبر نے اپنے دربار میں اپنے وقت کے ذہین ترین اور انتہائی عالم فاضل لوگوں کو جمع کیا۔ جن میں آپ نے "نورتن" کے نام سنے ہی ہوں گے۔ اس کے دور میں علوم و فنون کو بھی بہت ترقی ملی۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن وہ اہل علم کی قدر کرتا تھا اور مشہور کتابوں کو پڑھوا کر سنتا تھا۔ اکبر پر مسلمان علماء نے اس وقت سب سے زیادہ اعتراضات کئے جب اس نے اپنا ایک مذہب "دین الٰہی" ایجاد کیا۔

"دین الٰہی" ایجاد کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اکبر کے دربار اور خود اس کے نورتنوں میں ہندو شامل تھے۔ خود اس کی بیوی جودھا بائی ہندو تھی۔ لہٰذا اکبر کسی ایسے مذہب کی تلاش میں تھا جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے اور ان کے درمیان اختلافات ختم ہو جائیں۔

اکبر کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر نے وسیع و عریض سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے باپ کے دور کے وہ سارے قوانین جو اسلام اور شریعت کے خلاف تھے، منسوخ کر دیئے۔ اور جب تک حکومت کی بڑی حد تک اسلامی شریعت کی پابندی کی۔ وہ بے حد انصاف پرور بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے محل کے باہر ایک زنجیر لٹکا دی تھی اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ رعایا میں سے جس کسی کے ساتھ بھی کوئی ظلم ہو یا جسے انصاف درکار ہو وہ اس زنجیر کو کھینچے...... جہانگیر اپنی اس "زنجیر عدل" کی وجہ سے آج بھی یاد کیا

جاتا ہے۔

جہانگیر نے وفات پائی تو اس کا ہونہار بیٹا شہزادہ شاہجہان تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں اسلام اور اسلامی طور طریقوں پر اور زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر تک کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے درباری سجدہ برقرار تھا یعنی جو بھی دربار میں آتا بادشاہ کے احترام میں اسے پہلے سجدہ کرتا تھا...... شاہجہان نے اس رسم کو ختم کرا دیا۔ بلاشبہ وہ روزے نماز کا پابند اور نیک بادشاہ تھا۔ اس نے تاج محل جیسا ساتواں عجوبہ عالم مقبرہ، لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور مقبرہ جہانگیر تعمیر کرایا۔

اورنگ زیب شاہجہان کا سب سے لائق، بہادر اور اسلامی ذہن رکھنے والا بیٹا تھا جس نے تقریباً ۵۲ سال تک حکومت کی۔ حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے شراب اور جوئے پر پابندی لگا دی، بچوں کی خرید و فروخت کے خلاف سخت احکامات جاری کئے۔ گانے بجانے والوں کو اپنے دربار سے ہٹا دیا۔ بادشاہ کی دعوتوں اور فضول خرچیوں کو ختم کرا دیا۔ اس نے رعایا پر سے ٹیکسوں کا بوجھ کم کر دیا۔ اس نے اسلامی قوانین کے متعلق ایک جامع کتاب عالموں سے مرتب کرائی جو آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے اور "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے مشہور ہے۔ اورنگ زیب خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں، مسکینوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

اورنگ زیب کے بعد ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس کے جانشین اس لائق نہ تھے کہ سلطنت کا نظم و نسق چلا سکتے۔ مسلمانوں میں شیعہ و سنی کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ پھر دوسری قوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ان میں ایک طرف مرہٹے تھے اور دوسری طرف انگریز۔ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی صوبے خود مختار ہونے لگے۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور اپنی سازشوں سے انہوں نے مسلمانوں سے آہستہ آہستہ اقتدار چھیننا شروع کیا۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان، نواب سراج الدولہ کو اقتدار سے بد دخل کیا اور پھر سلطنت دہلی جو سکڑ کر چھوٹی ہو گئی تھی اس پر قبضہ کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ بالآخر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف مسلمان آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں نظر بند کر دیا گیا اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ان کی جائیدادیں لوٹ لی گئیں جن مجاہدوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا انہیں پھانسی دی گئی اور کئی روز تک ان کی

لاشیں درختوں سے لٹکی رہیں۔ مسلمانوں کو اس تباہی سے سر سید احمد خان نے نکالا۔ جنہوں نے علی گڑھ کالج قائم کر کے دوبارہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنایا۔ پھر اس تعلیم یافتہ طبقے نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان حاصل کیا۔

ماڈرن کوّا

مرسلہ :۔ وجاہت حسین۔ لاہور

رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک روزہ خور کوّا پیاسا تھا۔ اس بے چارے کو کسی نے پانی نہ دیا کہ کہیں سنتری بادشاہ نہ دیکھ لے۔ آخر بے چارہ اس باغ میں گیا جہاں ایک گھڑے میں اس کے بزرگ نے کنکر ڈال کر پانی پیا تھا مگر وہ یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوا کہ کسی نالائق نے وہ کنکر نکال کر پھینک دیئے تھے۔ سو یہ کوّا سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ وہ اڑا اور جب واپس آیا تو ایک سٹرا (STRAW) اس کی چونچ میں تھا اس نے سٹرا کو گھڑے میں ڈالا اور دوسرا سرا منہ میں لے کر پانی غٹاغٹ پی گیا اور اس کے بعد ڈسکو دیوانے کہتا ہوا اُڑ گیا۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

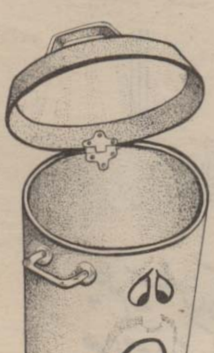

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

شعلۂ آزادی

کیف بنارسی

چشمِ روشن پاکستان — دل کی دھڑکن پاکستان
صحرا صحرا اِس کی دھوم — گلشن گلشن پاکستان
اپنی ہستی کا حاصِل — اپنا مامن پاکستان

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

منزل کو سَر کرنا ہے مشکل سے کیا ڈرنا ہے
آزادی کے شعلہ کو دل میں روشن کرنا ہے
پاکستان کی اُلفت میں اپنا جینا مرنا ہے

لے کے رہیں گے پاکستان
بَٹ کے رہے گا ہندوستان

کس نے شب خوں مارا ہے؟ شیروں کو للکارا ہے
بچّہ بچّہ مومن کا! شعلہ ہے انگارا ہے
قوم کی خاطِر مر جائیں بس یہ قومی نعرہ ہے

لے کے رہیں گے پاکستان
بَٹ کے رہے گا ہندوستان

ہند کے سارے صوبوں میں اِسلامی لشکر تیّار
کثرت ہے دشمن کی فوج وحدت ہے اپنی تلوار
نام خُدا کا لیتے ہیں! ہو جائے گا بیڑہ پار

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

ایس ایم شاہد

کُتّے میرے وطن کے

پیارے بچو! ترقی یافتہ ملکوں میں لوگ کتوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے ہیں اور انھیں اپنا بہترین دوست کہتے ہیں۔ مگر تمہارا یہ ملک ترقی یافتہ نہیں، ترقی پزیر ہے۔ یہاں تم کتوں پر پتھر اٹھا لیتے ہو۔ اور تمہیں کوئی بھی منع نہیں کرتا کیونکہ ہمارے ہاں جنگلی جانوروں کو مارنا بہادری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ جوانی میں ہم خود شکار کے بڑے شوقین تھے۔ لیکن کتوں کے شکار کے نہیں۔ بلکہ کتوں کو ہم شکار پر اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ کتوں اور انسانوں میں ایک چیز یہ بھی تو مشترک ہے کہ دونوں شکار کے شوقین ہیں۔ یوں تو اور بھی کئی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً کتے بھی آپس میں لڑتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر بھونکتے ہیں۔ ہم بھی بات بڑھ جائے تو خوب چیختے چلاتے ہیں۔ وہ ہڈی پر جھگڑتے ہیں۔ ہم زمین، جائداد، روپیہ پیسہ پر لڑائی جھگڑے کرتے ہیں۔ اور ہاں ہم سیاسی اختلاف پر بھی تو دنگا فساد کرتے ہیں۔ اب یہ ہمیں معلوم نہیں کہ کتوں میں بھی سیاسی اختلاف ہوتا ہے کہ نہیں۔ یقیناً نہیں ہوتا ہوگا۔ اور یہ اچھا ہی ہے ورنہ انسانوں اور کتوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا؟

پیارے بچو! کراچی میں گلشن اقبال کے جس بلاک میں میں رہتا ہوں وہاں بہت سے کتے بھی رہتے ہیں۔ خونخوار حیوانوں میں کتا ہی وہ بیوقوف مخلوق ہے جسے انسانوں کے ساتھ یا ان کے آس پاس رہنا اچھا لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر کی بلدیہ تھوڑے دنوں کے بعد انھیں مار مار کر کتا گاڑی میں بھر کر لے جاتی ہے۔ کتوں کی اتنی ناقدری کے بعد بھی یہ انسانوں ہی میں گھسے رہنا پسند کرتے ہیں۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ حالانکہ شیر، بھیڑیے، لومڑ، نیل گائے، اود بلاؤ وغیرہ کتنے سمجھ دار ہیں۔ جنگل سے اس وقت تک نہیں نکلتے جب تک کوئی شکاری انھی پکڑ کر چڑیا گھر والوں کے حوالے نہ کر دے۔ ہاں تو میں کیا کہ رہا تھا بھلا۔ بھول ہی گیا۔ ان کتوں کی وجہ سے یاد داشت بھی خراب ہو گئی ہے۔ ہاں یاد آگیا میں کہ رہا تھا کہ چند برس پہلے گلشن اقبال کا یہ خطہ تقریباً ویرانہ تھا جہاں کہیں کہیں بلوچوں اور سندھیوں کے چھوٹے چھوٹے گوٹھ آباد تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہاں مہاجر بھی رہتے ہیں، پٹھان اور پنجابی بھی۔ کہیں کہیں سندھی اور بلوچ بھی نظر آتے ہیں۔ ایک منٹ ذرا ٹھہرو۔ میں کہنا کیا چاہ رہا ہوں وہ بات ہی ذہن سے نکل گئی۔ اصل میں جب سے ہم سندھی، بلوچ، مہاجر، پنجابی، پٹھان، کے حوالے سے گفتگو کرنے لگے ہیں۔ بات ہمیشہ بے ربط سی ہو جاتی ہے۔ ذہن الجھ جاتا ہے۔ آخر کتوں پر بات کرتے ہوئے ذہن کیوں نہیں الجھتا۔ کیونکہ ان میں اس طرح کا فرق بھی تو نہیں ہوتا۔ دیکھو نا جو بری باتیں حیوانوں تک میں نہیں پائی جاتیں وہ ہم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ کتا کبھی نہ پنجابی اور سندھی ہوتا ہے، نہ مہاجر اور پٹھان۔ وہ تو صرف کتا ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی صرف انسان ہوں صرف مسلمان ہوں صرف پاکستانی ہوں۔ جب سندھ میں رہ کر کوئی کتا سندھی اور مہاجر کتا نہیں ہو جاتا۔ یا پنجاب سرحد اور بلوچستان میں پیدا ہونے سے کوئی کتا پنجابی، سرحدی اور بلوچستانی کتا نہیں ہوتا تو آخر ہم لوگ ان باتوں کو اپنے بیچ کیوں لاتے ہیں؟ دوسرے سے ان پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایسا تو کتے بھی نہیں کرتے۔ تو پھر ہم کیوں کرتے ہیں؟ ہمیں اس بات پر کبھی تنہائی میں ٹھنڈے دل سے ضرور سوچنا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی گلشن اقبال کی کہ یہاں جتنے لوگ رہتے ہیں ان کے متعلق تو یہ علم ہے کہ یہ کہاں سے آئے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ آوارہ کتے کہاں سے آئے۔ گلشن اقبال کی اسکیم ۲۴ میں جہاں انسان بڑے بڑے بنگلوں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہتے ہیں، وہاں یہ کتے کوڑے کے ڈھیروں پر، دوکانوں کے آس پاس اور سڑکوں پر مڑگشتیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی تھک کر بنگلوں کی اونچی دیواروں کے سائے میں آکر سو جاتے ہیں۔

ہم نے ان کتوں سے کبھی بھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی کیونکہ سنا ہے آوارہ کتوں کو بے تکلفی پسند نہیں۔ کیونکہ! سچ پوچھئے تو ہمیں ان کا ہمارے بنگلے کی آس پاس مڑگشتیاں کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہمیں دیکھ بھال کر گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ہمارے

گیٹ کے باہر چار چھ کتے کھڑے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے استقبال کے خیال ہی سے کھڑے ہوں اور چونکہ ہماری طبیعت میں گوشہ نشینی بہت ہے اسی لئے ہم گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ انتظار سے مایوس ہو کر کتے اپنی اپنی راہ کو لگ گئے ہیں ہم گیٹ کے باہر قدم نکالتے ہیں۔

لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی کتا راہ میں ٹکرا ہی جاتا ہے۔ وہ ہمیں دیکھ کر دم ہلانے لگتا ہے اور ہم کنکھیوں سے اس کی ہلتی ہوئی دم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پیارے بچو! کیا تمہیں پتہ ہے کتے کی ہلتی ہوئی دم ہمیشہ امن کا جھنڈا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے اے پیارے راہگیر! ہم تجھے تنگ کرنے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتے۔ جا سیدھے اپنے گھر کو جا۔ بیکار میں ادھر ادھر مت دیکھ۔ پتھر مت اٹھا، سنبھل کر قدم اٹھا۔ جا ہم نے تجھے معاف کیا۔ چند روز قبل کی بات ہے، ان آوارہ کتوں میں ہمیں ایک کتا بالکل مختلف نظر آیا۔ یہ ایک سفید رنگ کا کتا تھا جس نے ہماری جھڑکیوں کا جواب ہمیشہ دم ہلا کر دیا۔ وہ اکثر بلا وجہ ہمارے پیروں میں آکر لوٹنے لگتا ہے۔ ہم اسے ڈانٹ پھٹکار کر بھگانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اسکی دم مارے محبت کے بے قابو ہوئی جاتی ہے۔ ہمارا دل بھی پسیج جاتا ہے۔ ہم کبھی کبھی روٹی کا ایک ٹکڑا اسکی طرف پھینک دیتے ہیں مگر سفید رنگ کا یہ کتا بالکل گدھا ہے۔ روٹی کے ٹکڑے تک پہنچنے میں اتنی دیر لگاتا ہے کہ دوسرے آوارہ کتے لپک کر ٹکڑے کو منہ میں دبا لیتے ہیں اور ہمارا یہ بے وقوف کتا سٹپٹا کر رہ جاتا ہے۔ اور اکثر کئی کئی دنوں کے لئے روپوش ہو جاتا ہے اور پھر نہایت زخمی حالت میں ہمارے دروازے پر آکر کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے بعد میں محلے کے بچوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی یہ حالت اسکے دوستوں نے، جو در حقیقت اس کے دشمن ہیں۔ بنائی ہے اور اسے گھیر گھار کر بھنبھوڑا ہے۔ کبھی کبھی ہم نے یہ بھی دیکھا کہ محلے کے بچے اسکے گلے میں رسی باندھ کر اسے گھسیٹے پھر رہے ہیں، پھر بھی اسکی دم رکنے کا نام نہیں لیتی ہے۔

بچو، ہم بھی انسان ہیں۔ دیگر قیمتی چیزوں کے علاوہ ایک درد مند دل بھی رکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہمیں اس کتے سے انسیت سی ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ چلو اسے پال لیتے ہیں۔ ویسے بھی گلشن اقبال میں چوریاں بہت ہونے لگی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے علاقے کے دوسرے لوگوں نے اپنے گھروں کی حفاظت کی خاطر کتے پال لئے ہیں.......

مگر ہم نے اپنی اس خواہش کا اظہار جب اپنے بچوں سے کیا تو وہ بولے، ابو، یہ کتا تو بالکل گدھا ہے۔ بلکہ شریف حد تک گدھا ہے۔ بھلا شریفوں سے بھی کہیں چور ڈاکو ڈرتے ہیں؟ آپ ایسا کریں کہ جو کتا زیادہ اسے بھنبھوڑتا ہے آپ اسے پال لیں۔ وہ ہماری حفاظت بہتر طور پر کر سکے گا! سن کر ہم نے اپنا سر جھکالیا۔ ہمیں یہ سوچ کر بے حد رونا آیا کہ افسوس نیک اور بھلے انسانوں کی طرح اب شریف اور بے ضرر کتے بھی مفید نہیں رہے۔

بنگالی دوست کے نام ایک خط

قرۃ العین سلیم

اے رشنا۔ شاید یاد دلانے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی تمہیں "اے رشنا" کہہ کر کون مخاطب کیا کرتا تھا۔ دیکھو کتنے عرصے بعد تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ جب اتنی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ پہلے تم جدا ہوئیں پھر ہمارے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان جدا ہوا اور اب بھیّا مر گئے۔ رشنا، ہمارے بھائی صاحب نہیں رہے۔ تم کو کیا سب بتاؤں یہاں بلا سبب نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے؟ بس بالکل اسی طرح مر گئے جیسے بابا نہیں رہے تھے۔ ہم پڑھا کرتے تھے نا تاریخ خود کو دھرتی ہے مگر اس نے بہت جلد خود کو دہرایا ہے۔ یہ شہر اور یہ

صوبہ بھی ویسے ہی نعروں میں بٹ گیا جو ہم نے بچپن میں ڈھاکہ میں سنے تھے۔ سنا ہے اب ڈھاکہ کے لوگ پاکستان کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی نفرت اور تعصب سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔ اب وہ اردو بھی شوق سے بولتے ہیں یہ سب کچھ ہے تو بہت اچھا۔ لیکن کتنی دیر میں اور کتنی تباہی کے بعد! کیا محبت کے لئے نفرت کے سمندر سے گزرنا ضروری ہوتا ہے رشنا۔؟

تمہیں یاد ہے جب ڈھاکہ ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا تھا، جئے بنگلہ کے روز نعرے لگتے اور لوگ روز مرتے اور میں کبھی تو وحشت زدہ ہو کر رونے لگتی کبھی بے حس ہو کر ادھر ادھر تکا کرتی کہ اب کیا ہو گا؟ ایسے میں بھیا کی چمکدار سیاہ آنکھیں جیسے دل کا بھید جان لیتیں اور وہ مجھے خود سے لپٹا کر خود بھی رونے لگتے۔ انہیں پاکستان سے محبت تھی اور وہ اپنے وطن کو مصیبت میں گھرا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ پاکستان توڑنے کے نعروں کو سن کر دہل جایا کرتے تھے۔ پاکستان تو ایک شاعر کا خواب تھا لیکن خواب ایسے بھی ٹوٹتے ہیں۔ مگر پاکستان محض خواب تو نہیں تھا۔ بابا جیسے ہزاروں لوگوں نے اسے اپنے خون سے رنگ دیا تھا رنگ اتنی جلدی تو نہیں مٹا کرتے اور پھر خون کا رنگ؟............ شاید نفرت کا خون محبت کے خون پر غالب آگیا۔

اس سب کے باوجود کہ پاکستان بابا کو کتنا پیارا تھا۔ بابا اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان آئے تھے اور کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتے تھے اور جب ہم پوچھتے تو کہا کرتے۔ بیٹا ہم تو بہت چھوٹے، معمولی اور کمزور ہیں۔ ہجرت کے بعد حضورؐ بھی مکہ کو یاد کیا کرتے تھے۔ ہماری روایت میں تو ہجرت کی بڑی اہمیت ہے۔ مگر یادیں دل میں زخم بھی بنا دیتی ہیں۔ تو مشرقی پاکستان کی یادوں نے میرے دل میں بھی زخم بنا دیئے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ میں نے وہاں جنم لیا۔ وہاں تعلیم حاصل کی۔ اسے اپنی ہی زمین اپنا ملک سمجھا تو اب وہ میرا نہیں رہا۔ میری وہ ساری دوست تم، چمپا، انیتا، روشی یہ سب کتنی دور ہو گئیں۔
رشنا۔ ہم میں کیا تعلق تھا، کیا ہو گیا۔ تمہیں یاد ہے ہم دونوں بھیا سے کہا کرتے۔ بھیا، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان میں اتنا فاصلہ کیوں ہے، نہ ہوتا۔ بھیا ہنستے اور کہتے تو کیا ہوا۔ بس دلوں میں فاصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ مگر دھیرے دھیرے یہ فاصلہ بڑھتا گیا۔ ایک ہزار میل سے بھی زیادہ۔ تب، جب لوگ ایک دوسرے سے یوں دور ہو رہے تھے کہ یہ بنگالی ہے اور یہ غیر بنگالی۔ پر ہمارے دل تو ساتھ دھڑک رہے تھے۔ پھر ایسا کیوں ہو گیا؟

تم سے ملے کتنا عرصہ ہو گیا۔ تمہیں دیکھے بنا۔ مگر تم ایسے یاد ہو، تم اور سارا مشرقی پاکستان، جیسے غیر محسوس طریقے پر انسان سانس لینا یاد رکھتا ہے۔ دیکھو مجھ سے کیا لکھا گیا، مشرقی پاکستان! مگر یہ لکھنے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔

ابھی کچھ پہلے خبر ملی ڈھاکہ میں زبردست سیلاب آیا ہے اور سینکڑوں لوگ مر گئے۔ اس دن بھیا نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''پگلی دیکھو دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے مصیبتیں تو ہر ملک پر آتی ہیں۔ یاد ہے جب ہم مشرقی پاکستان میں تھے اور یونہی سیلاب آ جایا کرتا۔ سینکڑوں لوگ مر جاتے۔ پورے پورے خاندان۔ کبھی صرف ایک فرد بچتا اور ہم سمجھتے تھے اب کبھی کوئی کیا گیت گائے گا مگر پھر بھی ملاح گایا کرتے اور عام لوگ بھی ماجھی رے۔ ماجھی رے۔ تو دیکھو انسان کیسے زندہ رہنے کا حوصلہ کرتا ہے۔ انسان کیسے نا امیدی سے امید کی کرن پیدا کرتا ہے۔''

رشنا! مجھے ناریل کے وہ جھنڈ اب تک یاد ہیں جو دور تک پھیلے تھے۔ مجھے کپاس کے لہراتے وہ کھیت بھی یاد ہیں جب چھٹیوں میں تمہارے گاؤں جایا کرتے اور جاتے ہی سیدھے ان میں چھپ جاتے۔ آنکھ مچولی کھیلا کرتے۔ کھیت یہاں بھی ہیں اسی طرح لہراتے سبز۔ بس ہمارا بچپن نہ رہا۔ اس نسل کا بچپن چھن بھی جلدی جاتا ہے جسے اتنی نفرتوں سے گزرنا پڑے۔ وہ نسل جذباتی طور پر کمزور بھی ہو جاتی ہے جیسے ہم ہو گئے۔ مگر بھیا تو بہت مضبوط تھے۔ بس دوبارہ وہی سب سہنے کی ہمت ان میں نہیں تھی شاید اسی لئے اب وہ خاموش بہت ہو گئے تھے۔

ویسے ہی جیسے ان دنوں تمہارے بابو ہو گئے تھے اور پھر جب بنگلہ دیش بننے کا اعلان ہوا انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور جو تمہارے گھر کے برابر میں بابو عبدالشکور رہتے تھے ہاں وہی جن کے گھر کے ہر کمرے میں قائد اعظم کی تصویر لگی تھی وہ کتنا روئے تھے۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر۔

رشنا۔ وہ بہت معصوم لوگ تھے اور نازک بھی۔ جلدی سے مر گئے یہاں ہم روز بڑھتی ہوئی نفرتیں دیکھ رہے ہیں اور زندہ ہیں۔

ہاں میں نے انہیں نازک کہا ہے۔ کمزور نہیں۔ ایسا ہوتا تو بابا دفتر سے آتے ہوئے جب مکتی بانہی کے غنڈوں کے درمیان پھنس گئے تھے اور انہوں نے بس اتنا مطالبہ کیا کہو بنگلہ دیش زندہ باد، تو بابا ہر نیاز خم کھا کر یہی کہتے اسلام زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ قائد اعظم زندہ باد۔ جب لوگ بابا کی لاش لائے اور میں دہشت زدہ ہو کر تم سے لپٹ گئی اور کہا اے رشنا۔ بابا مر گئے! تو بھیا نے بابا کے ماتھے کو چوم کر کہا تھا۔ بابا مرے نہیں بابا تو امر ہو گئے۔

مجھے یاد ہے جب سب کچھ چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔ تو تمہاری اماں نے کتنے روتے ہوئے ہمیں رخصت کیا تھا اور تمہارے ابا کتنے خاموش تھے۔ انہوں نے کچھ نہیں کیا بس بھیا کو زور سے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ اس وقت ان کی آنکھیں خشک ہونے کے باوجود اتنی سرخ تھیں۔ اس وقت تو میں چھوٹی تھی لیکن اب سمجھ میں آتا ہے۔ اب بھیا کو بھی جب بہت رونا آتا اور وہ برداشت کرتے تو ان کی آنکھیں ایسی ہی خشک

مگر سرخ ہو جایا کرتیں۔

پھر دوسری ہجرت پر کراچی نے ہمیں پناہ دی۔ ہم نے کب مشرقی پاکستان ، مغربی پاکستان کو الگ سمجھا تھا جو کراچی ہمیں اجنبی لگتا۔ ہم نے تو اس سے بھی ایسی ہی محبت محسوس کی اور سچ یہ ہے کہ اس نے خود ہم سے محبت کی۔ ہمیں اپنے اندر بسایا۔ رشنا! ہم شکر گزار تھے مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ ویسے ہی نعرے ، وہی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت، حقارت۔ تم کہاں کے ہو اور ہم کہاں کے ہیں ، پھر وہی تقسیم ، پتا نہیں لوگوں کی یاداشت اتنی کمزور کیوں ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ابھی یہ کل تو ہوا تھا۔ کس کو کیا مل گیا۔ پھر آج سوچ کا وہی انداز کیوں ہے ؟

مجھے معلوم ہے بھیا ہر لمحے یہی سوچنے لگتے تھے مگر بھیا مایوس نہیں تھے۔ بھیا جس یقین سے ہمیں حوصلہ دیا کرتے یہی یقین ان کا حوصلہ بھی تھا۔ بھیا ابا کی دوسری تصویر تھے۔

پتا نہیں یہ بھائی ، بہنوں سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں ؟ کرتے ہیں تو چھوڑ کر کیوں جاتے ہیں۔ مگر بھیا مجھے اکیلا چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتے ہونگے۔ انہیں تو لالو کھیت میں شرپسند کی گولی نے کھا لیا تھا۔ ہمارے بھیا جنہیں خدا کی چھوٹی چھوٹی مخلوق سے پیار تھا، انہیں مار دیا گیا اور ہماری دنیا اندھیری ہو گئی۔ تمہیں تو یاد ہو گا۔ بھیا ہمیں خوش کرنے کو کتنے جگنو پکڑ لیتے اور اپنے کرتے کے دامن میں بھر لاتے۔ ہم انہیں پکڑ کر اپنے پاس کہیں بند کرنا چاہتے تو بھیا کہتے۔ "نہیں دیکھو ان میں سے کتنے جگنو ہونگے جن کے بچے ان کا انتظار کر رہے ہونگے۔ وہ بھوکے مر جائیں گے اور یہ اداسی سے۔ اگر بابا کو کوئی اپنے پاس رکھ لے اور ہمارے پاس نہ آنے دے اور یہ جگنو جو میں نے ابھی اڑایا یہ تو ضرور کسی چھوٹی سے جگنی کا بھیا ہے۔ اگر گھر نہ پہنچا تو کتنے افسوس کی بات ہے اور ہم جگنوؤں کو اپنے گھر کی سمت اڑتا دیکھ کر خوش ہوا کرتے۔ رشنا۔ بھیا آج بھی ویسے ہی تھے۔ مگر اب میں روز ان کا انتظار کرتی ہوں وہ نہیں آتے کہاں رہ گئے ؟

میں دیر تک دروازے پر کھڑی رہتی ہوں۔ ایسے میں روز جب اسکول کی چھٹی ہوتی ہے ، بچے دھوپ سے تپتے ہوئے سرخ چہرے لئے اسکول سے نکلتے ہیں، مگر یہ بچے نعرے لگاتے ہیں بھانت بھانت کے۔ بچوں کا کیا ہے ؟ جب بڑے ہی یہ نعرہ بھول گئے ہیں "پاکستان زندہ باد" میں سوچتی ہوں انہیں روکوں اور صرف یہی ایک نعرہ سکھاؤں کیونکہ یہی تو آخری امید ہیں۔

خدا حافظ...... تمہاری دوست

سائرہ

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران اے قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان

مشہور آرٹسٹ **اقبال مہدی** کی قائد اعظم سے محبت کے ۴ حسین عکس

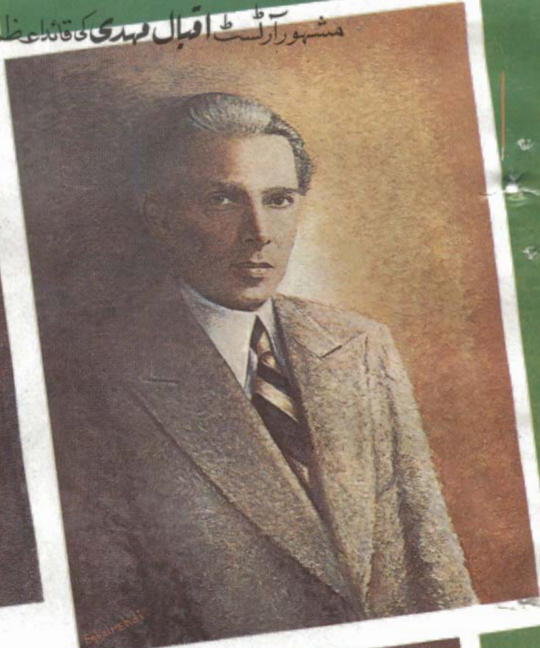

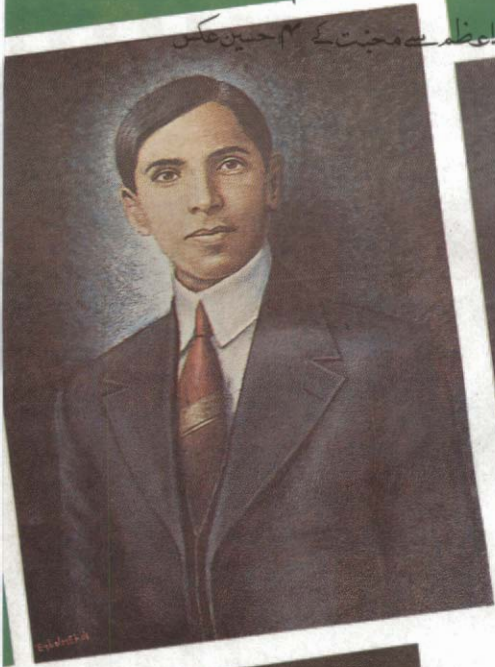

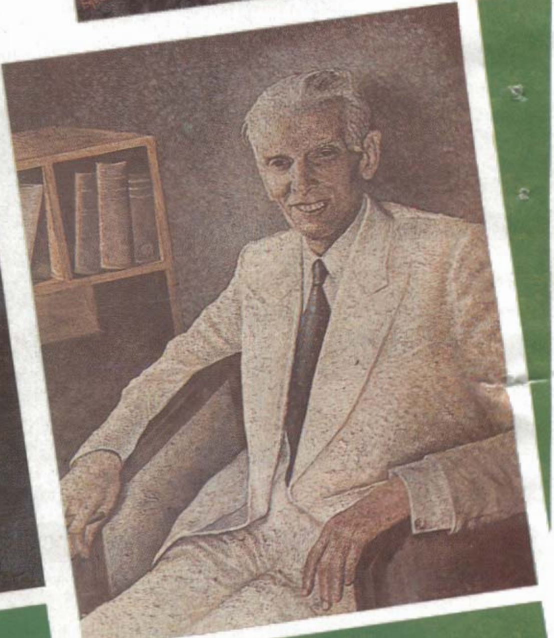

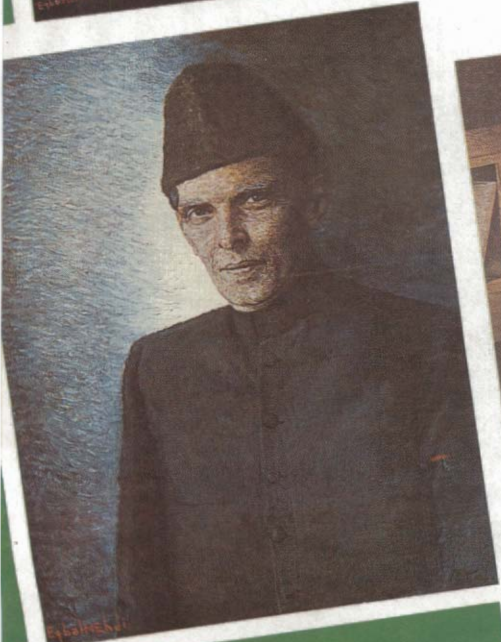

Montgomery
tea time
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

گمنام ہیرو

بشریٰ اشفاق

یوں تو پاکستان کی تاریخ بے شمار واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن کچھ واقعات ایسے ہیں جن کے ہیرو گمنام ہیں۔وطن کے ان گمنام محسنوں کے واقعات آپ کو صرف وہی لوگ سنا سکتے ہیں جو اس کے چشم دید گواہ رہے ہوں۔ ایسی ہی ایک سچی کہانی آج ہم آپ کو سناتے ہیں۔ یہ ایک بہادر سپاہی کا واقعہ ہے جو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں لاہور کے محاذ پر پیش آیا۔ یہ تو آپ نے یقیناً پڑھا ہو گا کہ بھارت نے ۱۹۶۵ء میں بغیر کسی وجہ کے رات کی تاریکی میں تین بجے پاکستانی سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ لاہور کے مقام پر ہوا تھا۔ سرحدی علاقے میں باٹا پور کالونی تھی۔

باٹا پور کے لوگ بے خبر سو رہے تھے کہ اچانک ایسا معلوم ہوا کہ بڑی بڑی گاڑیاں سڑکوں پر چل رہی ہیں۔لوگ حیران ہوئے اور باہر آ کر دیکھا تو بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ان کے گھروں کے آگے سے گذر رہے تھے۔سب لوگ متعجب تھے کہ ہماری فوج اتنی خاموشی سے رات کی تاریکی میں نقل و حرکت کیوں کر رہی ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم کچھ لوگوں نے ٹارچیں روشن کیں اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ بھارتی گاڑیاں اور ٹینک تھے۔ لوگوں نے گھبرا کر اپنے دروازے بند کر لئے۔ تاہم

ایک گھنٹہ کے اندر اندر بھارتی فوجیوں نے مورچہ بندی کرلی۔ اور صبح چار بجے ان سب کو گاؤں خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ اس گاؤں کے بہت سے نوجوان سرحدی رینجرز فورس میں شامل تھے۔ اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ یہ رینجرز فورس سرحدوں پر اسمگلنگ کی روک تھام کے لئے زمانۂ امن میں بھی موجود رہتی ہے۔

بھارتی فوجوں کی اتنے بڑے پیمانے پر نقل و حرکت رینجرز فورس سے پوشیدہ نہ رہی۔ اس وقت صرف تین کمپنیاں لاہور سرحد پر موجود تھیں۔ ہر کمپنی میں دو سو سپاہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان جوانوں کی کل تعداد صرف چھ سو تھی جو دو ڈویژن فوج کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ تاہم کمپنی کمانڈروں نے ہیڈ کواٹر کو وائرلیس پر اطلاع دی اور فیصلہ کیا کہ پاکستانی فوج کے آنے تک خود بھارتی فوج کا مقابلہ کریں گے۔

آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ ان رینجرز کے پاس صرف ہلکی مشین گنیں اور رائفلیں ہوتی ہیں۔ ٹینکوں اور بکتر بند دستوں کو روکنے کے لئے ان کے پاس کوئی ٹینک شکن توپ یا ہتھیار نہیں تھے تاہم انہوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ پھر باٹاپور کے لوگ اور سرحدی علاقے میں آباد پاکستانی بھی اپنے عزیز وطن پاکستان کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہوگئے اور انہوں نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا۔ جس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان جوانوں نے راکٹ لانچرز اپنے جسم کے ساتھ باندھے اور بھارتی ٹینکوں کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے۔ جیسے ہی ٹینک ان کے جسم سے ٹکرائے۔ ان ٹینکوں کے پرخچے اڑ گئے۔ اور یہ جوان بھی اپنے وطن کی حفاظت کے لئے شہید ہو گئے۔ ان کی جگہ دوسرے جوانوں نے لے لی۔ اس طرح آدھے گھنٹہ تک انہوں نے کسی بکتر بند گاڑی یا بھارتی ٹینک کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اسی اثناء میں پاکستان آرٹلری کی دو پلاٹون بھی اس علاقے میں پہنچ گئیں۔ ان کے پاس ہلکی توپیں اور ایک ٹینک شکن توپ بھی تھی۔ بھارتی فوج نے جب دیکھا کہ ان کے پانچ ٹینک ضائع ہوگئے اور ان کی فوج کی پیش قدمی رک گئی ہے۔ تو انہوں نے ایک اور طریقہ استعمال کیا۔ جو فوجی اصول کے منافی اور غیر انسانی تھا۔ انہوں نے باٹاپور کے شہری افراد خاص طور پر عورتوں اور بچوں کو ٹینکوں کے آگے چلنے کا حکم دیا۔

پاکستانی فوج کے پلاٹون کمانڈر جو اپنے توپچی نور خان کے قریب ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے سنا کہ توپچی نور خان اپنے ساتھ والے سپاہی کو بتا رہا تھا۔ کہ ان لوگوں میں جنہیں بھارتی فوج نے ٹینکوں کے آگے چلنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے اپنے گھر والے بھی ہیں۔ پلاٹون کمانڈر نے جب دیکھا کہ اب ٹینک صحیح نشانہ پر آگئے ہیں تو انہوں نے "فائر" کا حکم دیا۔ پلاٹون کمانڈر کے دل میں خیال آیا کہ شاید توپچی کا ہاتھ رک جائے گا کیونکہ اس بات کا سوفی صد امکان تھا کہ بھارتی ٹینک کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی شہید ہو جائیں

گے۔ لیکن آفرین ہے ہمارے باحوصلہ فوجیوں پر کہ سب سے پہلے جس شخص کا ہاتھ توپ فائر کرنے کے لئے بڑھا وہ توپچی نور خان تھا۔ دونوں پلاٹون نے اتنی چابک دستی اور تیزی سے مقابلہ کیا کہ تین گھنٹہ تک بھارتی فوج ایک انچ آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی اثناء میں انجینئر مسعود نے تجویز پیش کی کہ بی، آر، بی، نہر کا پل اڑا دیا جائے تو بھارتی فوج لاہور کی طرف نہیں آسکتی۔ بھارت کا اس طرح رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح حملہ کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ خاموشی سے پاکستان کے دل یعنی لاہور شہر پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن پاکستان کا بچہ بچہ اپنے وطن کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کے لئے جان قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دو بکتر بند ڈویژن جس میں لاتعداد ٹینک اور تقریباً ڈھائی ہزار نفری شامل تھی۔ تین گھنٹہ بھاری اسلحہ کے ساتھ جدوجہد کرنے پر بھی پل تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ تاہم پل اڑانا ضروری تھا۔ تاکہ بھارتی فوج کی پیش قدمی کا راستہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ انجینئر کیپٹن مسعود بڑی خاموشی سے یہ کام انجام دینا چاہتے تھے۔ تاکہ بھارتی فوج کو پتہ نہ چل سکے۔ بھارتی فوج کو پتہ چل جاتا تو وہ بھاری توپخانہ کا فائر کھول دیتی اور فوراً پل پر قبضہ کر لیتی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ بیل گاڑی کی آڑ میں راکٹ لانچر اور ڈینو نیڑ بم لے جائے جائیں۔ ایک تیرہ سالہ بچہ بھاگ کر اپنی بیل گاڑی لے آیا اور قریبی کھیتوں میں سے چارہ اور خشک گھاس بھی لاد دی گئی۔ انجینئر کیپٹن مسعود اور ان کے ساتھی ضروری سازو سامان کے ساتھ گھاس کے اندر چھپ گئے۔ اس دلیر بچے نے بڑی تیزی سے اپنی بیل گاڑی بی آر بی نہر کے پل کی طرف دوڑانی شروع کر دی۔ اس کے قریب ہی بموں کے دھماکوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بیس منٹ میں بیل گاڑی پل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ تیزی کے ساتھ کیپٹن مسعود نے پل کے نیچے بم سیٹ کئے انہوں نے بچے کو بار بار تاکید کی۔ "بیٹا آپ واپس چلے جائیں۔" لیکن اس بہادر بچے نے فوراً جواب دیا۔ "سر آپ اپنا کام ختم کر کے میرے ساتھ چلیں۔"

اس دوران میں بھارتی فوج پل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ تیزی کے ساتھ بارودی سرنگیں سیٹ کرتے ہوئے ہمارے بہادر فوجیوں نے دینونیڑ دبائے۔ زبردست دھماکے کے ساتھ پل اڑ گیا۔ اور ہمارے دونوں انجینئرز اور وہ بہادر پاکستانی بچہ بھی شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گئے۔

پل کے اڑ جانے کی وجہ سے بھارتی فوج کی پیش قدمی مزید دو گھنٹے تک رکی رہی اور ہماری قابل فخر فضائیہ کے بہادر ہواباز پہنچ گئے۔ تین روز کی شدید جنگ، کے بعد بھارتی فوج واپس اپنے علاقے میں پسپا ہو گئی لیکن وطن عزیز کے دفاع میں اہم کام اس دلیر بچے نے انجام دیا۔ اس نے بھارتی فوج کو انچ بھر آگے نہ بڑھنے دیا۔ لاہور میں یادگار شہداء ایسے ہی بہادر پاکستانیوں کی یاد میں تعمیر کی گئی ہے۔

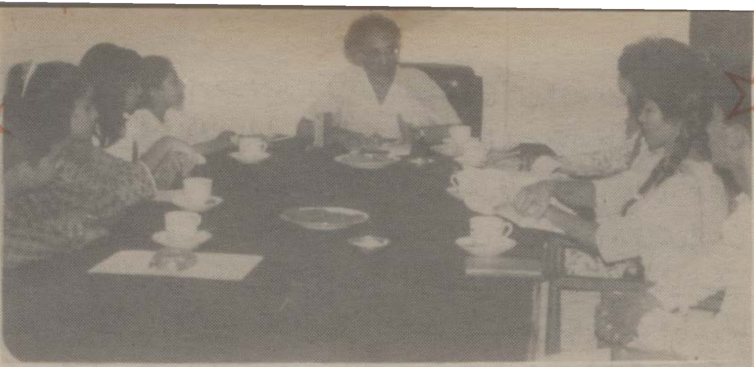

ملک کے مشہور دانشور ڈاکٹر منظور احمد سے بچوں کا مکالمہ

نئی نسل اور پاکستان

رپورٹ:۔ منیر احمد راشد

طاہر مسعود :۔ عزیز ساتھیو! آپ جانتے ہیں کہ قرار دادِ پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی جس میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور آج جب کہ ہم سب یہاں جمع ہیں، پاکستان کو بنے ہوئے چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ یہ عرصہ کسی بھی قوم کی زندگی میں کوئی بہت طویل عرصہ نہیں ہوتا۔ مختصر عرصہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مختصر عرصے میں بھی ہمارے ملک میں دو نسلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ایک نسل وہ ہے جس نے پاکستان بنایا تھا، دوسری نسل وہ ہے جس نے پاکستان کو ٹوٹتے دیکھا۔ اور آپ جو یہاں بیٹھے ہیں، ہماری تیسری نسل ہیں جو اپنے ملک کو مسائل میں گھرا ہوا دیکھ رہی ہے۔ یہ مسائل بڑے پیچیدہ اور تشویش ناک ہیں۔ جب آپ ملک و قوم کو اور اپنے آپ کو ان مسائل کے درمیان پاتے ہیں تو آپ کے ذہنوں میں بہت سے سوالات، بہت سے شبہات اور بہت سے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ ان کا جواب چاہتے ہیں۔ اور یقیناً آپ کو ان کا جواب ملنا چاہئے۔ "آنکھ مچولی" کے زیر اہتمام یہ نشست اسی لئے رکھی گئی ہے کہ آپ کے ذہنوں میں جو بھی سوالات ابھرتے ہیں انہیں بلا جھجک پیش کریں۔ آپ کے سوالوں کے جوابات کے لئے ہم نے ملک کے معروف دانشور جناب ڈاکٹر منظور احمد کو دعوت دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ نے انہیں ٹیلی ویژن کے مذاکروں میں ضرور

سناہو گا۔ ہماری آج کی نشست کا موضوع ہے "نئی نسل اور پاکستان۔" ڈاکٹر صاحب پہلے اسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ پھر اس تقریر کو سن کر یا اس کے علاوہ بھی جو سوالات آپ کے ذہنوں میں پیدا ہوں وہ آپ ڈاکٹر صاحب سے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد: شکریہ طاہر مسعود صاحب! آپ نے مجھے ان بچوں سے ملنے کا موقع دیا۔ ان بچوں میں ماشاء اللہ ہماری تیسری ہی نہیں بلکہ چوتھی نسل کے لوگ بھی موجود ہیں۔ اور اس میں کچھ مونٹیسوری کے طالب علم ہیں۔ ننھے منّے بچے مگر بہت ذہین اور بہت ہشیار، جن کو یہ معلوم ہے کہ ڈزنی لینڈ میں کیا ہوتا ہے اور یہ کس نے بنائی ہے۔ اور پھر اس میں نسبتاً وہ لوگ بھی موجود ہیں کو جو میٹرک یا بی اے تک اپنی تعلیم یا تو حاصل کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔ اب کوئی ایسی بات کہنا کہ جو ان سب ذہنوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ فہم ہو اور جو سمجھی جا سکے تھوڑا سا مشکل کام ہے۔ لیکن مجھے اپنے چھوٹے ساتھیوں سے بھی یہ امید ہے کہ وہ ماشاء اللہ بہت ذہین ہیں اور وہ باتیں اچھے طریقے سے سمجھ لیتے ہیں۔ اور نسبتاً بڑے ساتھیوں کے بارے میں یقین ہے کہ وہ باتیں ان کے لئے اتنی مشکل نہیں ہوں گی۔

دیکھیں رہنے سہنے کے لئے ایک گھر ہوتا ہے اور گھر جو ہوتے ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ کے پاس ماشاء اللہ ایک بڑا گھر ہے جس میں سب لوگ اچھے طریقے سے رہتے ہیں۔ اور وہ گھر آپ کو ورثے میں ملا ہے یعنی آپ کے آباؤ اجداد نے اس گھر کو بڑی محنت سے بنایا تھا۔ اور وہ منتقل ہو کر آپ کو مل گیا۔ اب آپ کی جو فکر ہوتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ اس گھر کو سلیقے سے رکھیں۔ اس کی مرمت کراتے رہیں، رنگ و روغن کراتے رہیں اور مختلف ضروریات کے تحت اس میں ردّ و بدل کراتے رہیں۔ یہی صورت کم و بیش ہوتی ہے ملکوں کی۔ دنیا میں بعض ممالک ایسے ہیں جو کافی پہلے بن گئے۔ یہ بڑے ممالک ہیں وہاں جو لوگ رہتے ہیں ان کی ضروریات کے لئے ان ملکوں کے پاس کافی وسائل ہیں۔ اب ان کو جو کام کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں روز مرّہ کی جن نئی نئی ضرورتوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ نئے قوانین کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو نئے قوانین بنالئے۔ کبھی نیا دستور بنانے کی ضرورت پڑ گئی، ترمیم کرنے کی ضرورت پڑ گئی تو دستور کے اندر ترمیم کرلی۔ کبھی الیکشن کرانے کی ضرورت ہو گئی تو انہوں نے الیکشن کرالئے۔ نئی پارٹی حکمران بن گئی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ چاہے دنیا کا کوئی ملک ہو اسے بنانے والے جب بھی بناتے ہیں اس میں انہوں نے بڑی قربانی دی ہوتی ہے۔ اور ان کی کوششوں سے یہ ممالک رفتہ رفتہ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ جو ہیں وہ اس مکان کے مکینوں کی مانند ہیں کہ جنہوں نے غالباً ایک ایسے مکان میں

رہنا شروع کیا ہے جس کی نیو تو کھودی جا چکی ہے لیکن ابھی اس کے اوپر کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی۔ تو ظاہر ہے کہ اس مکان کو نئے سرے سے بنانا پڑے گا۔ جتنا بن گیا ہے اس کے اوپر ایک منزل تعمیر کرنی پڑے گی تاکہ جتنے لوگ بھی اس مکان میں رہتے ہیں۔ ان کو آسانی کے ساتھ سہولت میسر آ سکے اور وہ اپنے جو بھی روز مرہ کے کام ہیں، وہ اچھے طریقے سے کر سکیں۔ اپنے قانون بنا سکیں۔ اپنا دستور بنا سکیں۔ گھر میں افراد کی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی ہو جائے تو کوئی ایسا طریقہ نکال سکیں کہ ان کا تصفیہ آسانی کے ساتھ ہو جائے۔ مکان بنانے اور ملک کے بنانے میں فرق یہ ہے کہ مکان کے بنانے کے لئے آپ کی جو آمدنی ہے، آپ اس کو خرچ کرنے لگتے ہیں۔ اور آمدنی میں اور اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ملک چونکہ بڑی چیز ہے اس لئے اس کے بنانے کے لئے آپ کو وسائل بھی ساتھ ساتھ مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ اور ان وسائل کو خرچ بھی صحیح طریقے سے کرنا پڑتا ہے۔ تو ان دونوں کاموں کے لئے آپ کو زیادہ محنت اور زیادہ لگن کی ضرورت ہوگی۔ پھر جس صورت سے مکان کے بنانے کے لئے آپ کو علم چاہئے۔ کہ کیسا مکان بنے، نقشہ کیسے بنے، اسی صورت میں ملک کو بنانے کے لئے آپ کو اور زیادہ علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو معاشیات کے علم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آپ یہ پتہ چلا سکیں کہ آپ کے ملک کا جو معاشی ڈھانچہ ہے وہ کیسے بنے تاکہ سب لوگ اس ملک کے اندر خوشحال زندگی گزار سکیں۔ آپ کو سیاسی علم کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ آپ کو یہ پتہ چلے کہ آپ کا جو سیاسی نظام ہے وہ کیسے قائم ہو اور روز مرہ کی لڑائی جھگڑے سے آپ کو نجات ملے اور اچھے طریقے سے آپ کی حکومت یکے بعد دیگرے بدلتی رہے اور جمہوری طریقے سے اس ملک کے اندر کام ہونا شروع ہو جائے۔ آپ کو سائنسی علوم کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ آپ کو یہ پتہ چلے کہ آپ کے ملک میں سائنسی ترقی کیسی ہونی چاہئے اور سائنس سے جو انسان کی زندگی کو فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کو کیسے حاصل کرنا چاہئے۔ پھر آپ کے ملک میں فکری ترقی ہونی چاہئے تاکہ انسان اپنی سوچ سے، اپنی فکر سے کام لے کر یہ پتہ چلا سکے کہ دنیا کے دوسرے ممالک جس صورت سے زندگی گزار رہے ہیں ان سے بہتر، یا اگر ان سے بہتر نہیں تو اس جیسی بہتر زندگی ہم کیسے گزار سکتے ہیں۔ تو اس میں بہت کام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب علم حاصل کرنے کا جو مسئلہ ہے وہ ایک پیچیدہ کام ہے۔ آج آپ چوتھی کلاس میں ہیں، کل آپ میٹرک میں آئیں گے پھر بی اے میں آئیں گے اس کے بعد ایم اے میں آئیں گے، تو اس میں کافی عرصہ گزر جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی کے اندر وقت ذرا بڑا ہو جاتا ہے۔ نئی نسل جو پاکستان میں رہتی ہے۔ ایک تو اسے زیادہ کام کرنا ہے دوسری بات یہ کہ اس کو علم کے حاصل کرنے میں اپنی عمر کو لگا دینا ہے۔ پہلی نسل نے قربانی دی، آپ کے لئے پاکستان حاصل کر لیا۔ دوسری نسل نے اس کو بنانے کی کوشش کی لیکن ان کے پاس کچھ تو وسائل کی کمی تھی، کچھ غالباً خیلات کی

کمی تھی کچھ اور بھی بہت ساری پریشانیاں تھیں جس کی وجہ سے وہ ملک کے اس طریقے سے غالباً نہیں بنا سکے جس طریقے سے ایک اچھے ملک کو بننا چاہئے۔ میں لوگوں سے مایوس نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا یہ ہوں کہ انسان جو ہے اس کے اندر زندہ رہنے کی جو قوت ہے وہ اتنی موجود ہے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے اور یہ ایک شخص نہیں کرتا بلکہ ایک نسل کرتی ہے۔ پرانی نسل نے جو کچھ زندہ رہنے کے لئے کیا وہ تو کیا، نئی نسل بھی ظاہر ہے کہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور اچھے طریقے سے زندہ رہنا چاہتی ہے، تو یہ مسئلہ محض اس بات کا ہے کہ آپ کے اندر جو قوت اور سکت موجود ہے زندہ رہنے کے لئے اور اچھے طریقے سے زندہ رہنے کے لئے، تو آپ محنت اور لگن کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ تو نئی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں اور یہ توقع کرتا ہوں کہ جیسے جیسے ہمارے علم کی ترقی ہو رہی ہے، نئی نسل اس علم کو حاصل کر کے اس ملک کی جو ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر جب بھی پڑیں گی، ان ذمہ داریوں کو وہ اچھے طریقے سے نبھائے گی۔ ایک بات البتہ میں یہاں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ نئی نسل کی جو بنیادی ذمہ داری ہے وہ اپنے آپ کو تیار کرنے کی ہے۔ علمی اور ذہنی طور پر تیار کرنے کی ذمہ داری ان کی ذمہ داری فوراً یہ نہیں ہے کہ وہ باہر نکل کر ملک کے معاملات کے اندر عملی حصہ لینے لگیں۔ یا دوسرے لفظوں میں سیاست میں حصہ لینے لگیں۔ سیاست میں حصہ لینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک سیاست میں حصہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ میں یہ سمجھ پیدا ہونی چاہئے کہ سیاست کسے کہتے ہیں اور اچھی یا بُری سیاست کیا ہوتی ہے۔ دوسرے سیاست میں حصہ لینا یہ ہے کہ آپ جلوس میں جانا شروع کریں، تو جب آپ روزانہ جلوس میں جانے لگیں گے تو نہ آپ کرکٹ کھیل سکیں گے اور نہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر سکیں گے۔ تو اگر یہ دونوں کام آپ نہیں کر سکیں گے تو آپ کو علم سے جو سیکھنا ہے وہ نہیں سیکھ سکتے۔ عملی زندگی بھی آپ کو بہت کچھ سکھائے گی۔ لیکن علم آپ کو اس عملی زندگی کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ جس عملی زندگی کی بنیاد علم پر ہونی چاہئے وہ ہمارے ملک میں نظر نہیں آتی۔ اور لوگوں نے اس پر اتنی توجہ نہیں کی جتنی توجہ کی جانی چاہئے، تو میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کو اس بات کا شعور اور احساس ہونا چاہئے کہ تعلیم بڑی اہم چیز ہے۔ اور ہم جو بھی علم حاصل کریں گے وہ ہماری بنیاد کے طور پر کام کرے گا کوئی قوم دنیا کی ترقی نہیں کر سکتی۔ نہ کسی قوم نے آج تک ترقی کی ہے اگر اس کے پاس علم کا سرمایہ نہ ہو۔ تو علم کا حاصل کرنا نئی نسل کے لئے میرے خیال میں تمام کاموں کی نسبت زیادہ اہم کام ہے۔ ایک اور چھوٹی سی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تعلیم، محنت، کام، نقشہ بنانا سب ایک طرف۔ لیکن جب تک نسلوں کے پاس دیکھنے کے لئے خواب نہیں ہوں گے اچھے خواب، مستقبل کے خواب۔ اس وقت تک وہ نسلیں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ اور ان کے آئیڈیلز نہیں ہوتے، ان کے مقاصد نہیں ہوتے وہ کوئی کام

نہیں کر پاتیں۔ پھر کام کرتے رہنا کافی نہیں۔ یا صرف تعلیم حاصل کرتے رہنا کافی نہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ۔ اور اپنی تربیت کے ساتھ ساتھ جو چیز آپ کو سامنے رکھنی چاہئے وہ مقاصد ہیں زندگی کے وہ کام ہیں جو آپ کو بالآخر کرنے ہیں۔ تو اس معاملے میں آپ کے ذہن کی تربیت ہونی چاہئے۔ اور آپ کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہئے۔ وہ کام بہت سی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کے ذہن میں مقصد یہ ہے کہ آپ پورے پاکستان کے اندر بھائی چارہ، اخوت اور یک جہتی چاہتے ہیں۔

اس کو اچھا ملک بنتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو یہ آپ کی زندگی کا ایک خواب ہو گا۔ اب آپ یہ دیکھیں کہ جو بھی کام ہو گا آپ کا اس سے متعین ہو گا کہ کیا میرے اس کام میں، کیا میرے اس فعل میں پاکستان کی بھلائی ہے یا نہیں۔ اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ ہاں پاکستان کی بھلائی ہے تو آپ کا یہ کام اچھا ہے۔ لیکن اگر آپ کا جواب یہ ہے کہ نہیں اس کام سے تو میرے پاکستان کی بھلائی نہیں۔ تو یا تو وہ آپ کا کام نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ اور اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ نہیں اس کام سے پاکستان کی برائی ہو گی تو وہ کام آپ کا بُرا ہے۔ تو اب آپ کی تعلیم اور روز مرہ کے کاموں کے جانچنے کا معیار یہ ہوا کہ کیا میرا یہ عمل پاکستان کی فلاح اور اس کی بہبود کے لئے ہے۔ پاکستان کو ایک اچھا اور مضبوط ملک بنانے کے لئے ہے۔ پاکستان کو ایک ایسا ملک بنانے کے لئے ہے جہاں سب لوگ خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ تاکہ اس کو پورا کرنے کے لئے انسان جدوجہد کر سکے۔ یہ تھوڑی سی باتیں تھیں ممکن ہے آپ نے پہلے بھی سنی ہوں لیکن ان باتوں کو دہرا دینا شاید فائدہ مند ہو گا مجھے نہیں پتہ کہ ان باتوں سے آپ کو اتفاق ہے یا نہیں اگر اتفاق نہیں ہے یا اس میں کوئی بات رہ گئی ہے تو آپ بتائیں۔

نئی نسل کے سوالات

ممتاز شیریں:۔ ابھی آپ نے شروع میں رہنے کے لئے ایک گھر کی بات کی تو ہم گھر اس لئے بناتے ہیں تاکہ ہم محفوظ رہ سکیں، چین و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ ظاہر ہے اس فضا میں ہی ہماری شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ پاکستان بھی ہمارا گھر ہی ہے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ ہی ہمیں تحفظ حاصل ہے۔ اور نہ ہی یہ احساس حاصل ہے کہ ہم محفوظ ہیں ہر طرف بے سکونی، انتشار کی فضا ہے تو ایسا کیوں ہے۔ اس فضا میں ہماری شخصیت کی تعمیر کس طرح ہو سکتی ہے۔؟

ڈاکٹر منظور احمد:۔ جو صورت حال آج کل ہے اس میں آپ کی ذمہ داری نہیں ہے لیکن آپ کے بزرگ ضرور اس کے ذمہ دار ہیں۔ اور اس ذمہ داری میں ہم سب لوگ شامل ہیں کہ ہم نے اس گھر کو یا

اس ملک کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ لیکن میرا خیال ایسا ہے کہ نئی نسل خاص طور پر آپ لوگ ایک کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آپ اچھّے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کام کر سکتے ہیں۔ کہ جس سے یہ احساس پیدا ہو لوگوں کے اندر کہ یہ اچھا کام ہے۔ اسے ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اختیار کرنا چاہئے۔

اور جس سے بڑوں کے ذہن میں بھی یہ خیال آئے کہ ہمارے بچے ہم سے اچھا کام کر رہے ہیں۔ تو بڑوں کو نیچا دکھانے کے لئے نہیں۔ بڑوں کو شرمندہ کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ بڑوں کے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے ایک مثال قائم کرنے کے لئے آپ کو اچھے کام کرنے چاہئیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ آپ کے سوال کا پورا جواب نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ خاص طور پر بڑے شہروں میں اور پاکستان میں بھی آج کل حالات ایسے ہیں کہ جہاں پر لوگوں کو عدم تحفظ کا ایک احساس ہے۔ اور واقعتاً ہم بڑے مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جلد ہی یہ حالات بہتر ہو جائیں گے اور وہ لوگ جو اس کے ذمہ دار ہیں وہ محسوس کریں گے کہ ان کا اپنا اور ان کے بچوں کا مستقبل اس ملک سے وابستہ ہے۔ اور جونہی یہ احساس ان کے اندر زیادہ تیز ہو جائے گا وہ اس گھر کے تحفظ کی ذمہ داری کو قبول کریں گے اور اسے پورا کریں گے۔

سنعمہ :۔ سر! آپ نے مکان کی مثال دی تو ہم اپنے مکان کو بہتر صرف محنت اور لگن سے ہی بنا سکتے ہیں۔ تو ہماری نئی نسل یا پھر وہ نسل جو آج کل سرگرم عمل ہے۔ اس میں محنت کا فقدان کیوں ہے؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ نئی نسل میں محنت کا فقدان نہیں ہے بچوں میں توانائی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ دیہاتوں میں چلے جائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ دن بھر کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ سڑکوں پر نکل جائیں چھوٹے چھوٹے بچے آپ کو کام کرتے ہوئے ملیں گے۔ آپ اپنی موٹر ٹھیک کرانے جائیں تو آپ کو مکینک بچے ملیں گے۔ آپ چھوٹے چائے خانوں کے اندر چلے جائیں تو چھوٹے بچے آپ کو بیرے کا کام کرتے ہوئے ملیں گے۔ تو محنت تو بچے کرتے ہیں لیکن بعض مرتبہ وہ غلط محنت کرتے ہیں۔ ان کو بتانا چاہئے کہ صحیح محنت کیا ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کی رہنمائی نہیں ہوتی ہے کہ وہ صحیح قسم کے کام کریں۔ آپ کو غالباً یہ خیال اس لئے پیدا ہوا ہوگا کہ آج کل امتحانوں میں جو نقل کرنے کا رجحان زیادہ ہو گیا ہے تو اس رجحان پہ تو قابو پایا جا سکتا ہے، اور اس رجحان کو کم بھی کیا جا سکتا ہے اور لوگوں سے محنت بھی کرائی جا سکتی ہے۔ صرف لوگوں کو یہ یقین دلانے کی ضرورت ہوگی کہ لوگوں کو محنت کا پھل ملے گا۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ یہاں محنت کا پھل نہیں ملتا۔ تو میں اسے بچوں میں محنت کی کمی کے رجحان سے تو نہیں منسوب

کرتا۔ البتہ ہمارے معاشرے کے جو غلط طور طریقے ہیں اگر ہم اسے ٹھیک کرلیں تو شاید یہ حالات بہتر ہوجائیں۔

درینہ حمید :۔ آپ نے کہا کہ ہماری نئی نسل کا اوّلین مقصد تعلیم حاصل کرنا ہے ظاہر بات ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں گے تو تعلیمی اداروں سے کریں گے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ باہر ملکوں میں جتنے دن اسکول اور کالج بند رہتے ہیں۔ اتنے دن ہمارے یہاں تعلیمی ادارے کھلے رہتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں جو بدنظمی ہے اور طالب علموں کا جو اتنا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں تعلیمی ادارے بند رہتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا کہ پورے ملک کے تعلیمی اداروں میں ایسا ہوتا ہے شاید زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اسکول تو ہمارے ہاں کم بند ہوتے ہیں الاّ یہ کہ کوئی بڑا واقعہ ہوجائے۔ کسی حد تک ہمارے جو کالجز ہیں وہ بھی اکثر کھلے رہتے ہیں۔ اگر کبھی اثر پڑتا ہے تو ہماری یونیورسٹی پر اثر پڑتا ہے جو بند ہوجاتی ہے۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈنا چاہئے اور نئی نسل کو اس بات کا مطالبہ کرنا چاہئے اور یہ مطالبہ کرنے میں وہ حق بجانب ہوں گے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو کھلا رہنا چاہئے اور ہمارے لئے تعلیم کا مناسب بندوبست ہونا چاہئے اور جن لوگوں کے بس میں یہ ہے کہ وہ تعلیمی اداروں کو کھلا رکھیں ان کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ تعلیمی اداروں کو کھلا رکھیں بلکہ وہ ماحول پیدا کریں جس میں تعلیم بچوں کے لئے ممکن ہوتی ہے۔ کسی حد تک اس میں ذمہ داری ان لوگوں کی بھی ہے جو آپ کی نسل سے نہیں ہیں ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ انہوں نے بہت جلد اپنے آپ کو تیار کئے بغیر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور جس کی وجہ سے یہ تعطّل پیدا ہوتا ہے۔ طلبہ کی سیاسی پارٹیوں کو چاہئے کہ وہ ملکر بیٹھیں اور یہ سوچیں کہ ان کے حق میں کیا بہتر ہے۔ کیا ان کے حق میں یہ بہتر ہے کہ سال بھر گزر جائے اور ان کو کچی جھوٹی ڈگریاں دے دی جائیں۔ یا ان کے حق میں یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو واقعی تعلیمی لحاظ سے تیار کریں۔

درینہ حمید :۔ ابھی آپ نے مطالبے کی بات کی کہ اگر تعلیمی ادارے بند ہوں تو ہم مطالبہ کرسکتے ہیں میرا سوال یہ ہے کہ ہم کس سطح پر اور کس طرح یہ مطالبہ کرسکتے ہیں؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ جو ہے مطالبہ۔ یہ بڑا سیاسی لفظ ہوگیا ہے۔ آپ کے ذہن میں غالباً یہ بات آرہی ہوگی کہ میں آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ کل آپ ایک جلوس نکالیں۔ یہ بھی مطالبے کی ایک شکل ہے۔ مگر مطالبوں کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ مطالبے کی شکلیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں کہ جس کے اندر کسی بڑے اقدام کی ضرورت نہ پڑے۔ آپ جس اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہاں آپ اپنے استادوں سے کہہ سکتے ہیں یا آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ ایک خط لکھیں اس پر طالب علموں کے دستخط کرائیں اور وہ

رافع نثار . پوری توجہ ایک نکتے پر

درینہ حمید . کسی گہری سوچ میں گم

ممتاز شیریں . انہماک کا عالم

خط اخباروں میں بھیج دیں۔ وہ خط اخباروں میں چھپ سکتا ہے۔ آپ اس خط پر دستخط لینے کے بعد اسے اپنے پرنسپل حضرات کو یا اپنے ٹیچر حضرات کو دے سکتے ہیں۔ تو اس قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں جس میں میرے خیال سے جائز حد تک طلبہ اپنے آپ کو مشغول کر سکتے ہیں۔ میں کبھی کبھی دیکھتا ہوں ٹیلی ویژن پر کہ بعض بچوں نے بڑے اچھے اچھے کام کئے ہوتے ہیں۔ تو اس سے دوسروں کا دل بڑھتا ہے۔ تو آپ سوچیں کے آپ محلے کے اندر کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آپ کے گھر کے سامنے کوڑا پڑا ہے تو آپ وہ کوڑا ہٹا دیں یہ چھوٹا نہیں بڑا کام ہے۔ آپ کوشش کریں کہ آپ کے محلے خوبصورت ہوں۔

ثمینہ نعیم :۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی کے نوجوانوں کو ملک کا معمار کہا جاتا ہے۔ لیکن دیکھا گیا کہ وہی نوجوان ملک و قوم کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں تو اسکی کیا وجوہات ہوتی ہیں؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ یہ اصل میں ایک ذرا سا مشکل سوال ہے۔ نوجوان ہماری نظر میں جو ملک و قوم کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اگر آپ ان نوجوانوں سے پوچھیں تو وہ کہتے ہیں کہ جی ہم تو تباہی نہیں چاہتے ہم تو بہتری چاہتے ہیں۔ بعض اوقات ہوتا ایسا ہے کہ وہ اس کے باوجود کہ وہ بہتری چاہتے ہیں کام ایسے کرنے لگتے ہیں جس سے بہتری نہیں ہوتی۔ اور اس کا بنیادی سبب یہی ہوتا کہ ان کے پاس چونکہ علم نہیں ہوتا اس لئے ان کو اس بات کی تمیز حاصل نہیں ہو پاتی کہ بہتری کس چیز میں ہے اور بدتری کس چیز میں۔ آج کل طلبہ جن کاموں میں مشغول ہیں ہمارے ملک میں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں معاشی بد حالی ہے اور لوگوں کو ملازمتیں نہیں ملتیں۔ اب جو طالب علم پڑھتے ہیں اور جن کو یقین ہے کہ ان کو

ملازمتیں نہیں ملیں گی تو اب اگر کوئی ان کو یہ کہتا ہے کہ جی میرے پاس ملازمتیں ہیں۔ اور تم یہ یہ کام کرتے رہو تو وہ بے چارے اس کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی حد تک مجبوری کے تحت ضروریات کے تحت تو یہ جو ہمارے ملک کی سیاسی جماعتیں ہیں، یہ اس طرح سے طلبہ کو ملوث کر لیتی ہیں۔ ان کے کچھ تھوڑے بہت وظائف کا بندوبست کر دیتی ہیں۔ ان کو کچھ تھوڑی بہت آسانیاں فراہم کر دیتی ہیں۔ اور طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ نوکری تو ہمیں ملنی ہی نہیں۔ اور اگر ہماری جو یہ جماعت ہے اگر آگے چل کر یہ برسر اقتدار آگئی تو نوکری اس کے ذریعے مل جائے گی اور اگر نہ بھی ملی تو چلو فی الحال تو کام چل رہا ہے۔ تو کچھ طلبہ تو اس طریقے سے ان کے لئے کام کرتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ واقعتاً ان کی بھلائی کس چیز میں ہے کیوں کہ ان کا علم محدود ہوتا ہے۔ اگر وہ تھوڑا سا علم حاصل کر لیں تو وہ یہ سمجھ پائیں گے کہ اس طریقے سے ان کی بہت تھوڑے وقت کے لئے تو بھلائی ہو سکتی ہے لیکن ایک لمبے عرصے کے لئے بھلائی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے اندر ایک تنقیدی عمل پیدا ہونا چاہئے۔ یعنی ہم پرکھ کر، سوچ کر یہ دیکھ سکیں کہ کون اچھے کام کر رہا ہے اور کون بُرے کام کر رہا ہے۔

احمد :۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ہم پاکستان کی کیسے خدمت کریں۔

ڈاکٹر منظور احمد :۔ بیٹے آپ پاکستان کی ایسے خدمت کریں کہ آپ تعلیم حاصل کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر کام کرنے سے پہلے سوچیں کہ اس کام سے میرے ملک اور وطن کو کیا فائدہ ہے اور بھی جو فائدہ آپ کے ذہن میں آئے تو پھر اس کی مناسبت سے آپ کام کیا کریں۔ تیسرا کام آپ کو یہ کرنا ہے آپ ابھی سے اپنے اندر لوگوں کی خدمت کرنے کی عادت ڈالیں۔

منیزہ :۔ ہمارے ملک میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو تعلیم دلانا بے مقصد اور لاحاصل ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد :۔ نہیں ایسا سوچنا غلط ہے اور میرا خیال ایسا ہے کہ لوگ ایسا سوچتے بھی نہیں ہیں ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کے لئے ایک خاص قسم کی تعلیم ہونی چاہئے۔ اب ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ جو کام مرد کرتا ہے وہی لڑکی بھی کرے۔

لیکن یہ کہنا بھی غلط ہے کہ لڑکی ایک اچھی ماہر طبیعات یا ایک اچھی ماہر کیمیا نہیں بن سکتی وہ بالکل بن سکتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے طلبہ تعلیم تو میڈیکل کی حاصل کرتے ہیں اور بعد میں مقابلے کا امتحان دے کر مجسٹریٹ یا کلکٹر بن جاتے ہیں۔ یا لڑکیاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور شادی کے بعد گھر بیٹھی رہتی ہیں، کام نہیں کرتیں۔ تو اس طرح پیسہ تو ضائع ہوا ناں تعلیم پر۔ تو اس بات کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے کہ کوئی لڑکا یا لڑکی تعلیم تو حاصل کرے میڈیکل کی اور دولت کمانے کے چکر میں مجسٹریٹ یا

ڈاکٹر منظور احمد بچوں کے انٹرویو پینل کے سامنے

کسٹم میں کلکٹر لگ جائے۔ بلکہ کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ ان سے لکھوالیا جائے کہ صاحب آپ تعلیم تو میڈیکل کی حاصل کر رہے ہیں۔ بعد میں دولت کمانے کے لئے پولیس میں تھانے دار تو نہیں لگ جائیں گے کیوں کہ وہ تعلیم تو دولت حاصل کرنے کے لئے حاصل نہیں کر رہے ناں۔ بلکہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے حاصل کر رہے ہیں۔

رافع نثار:۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری نئی نسل میں بڑوں کی دیکھا دیکھی مغرب پسندی کا رجحان بہت بڑھ گیا تو اس کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر منظور احمد:۔ مغرب کا لفظ ہم بولتے ہیں اس کے کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ مغرب نے مختلف علوم میں بہت ترقی کی ہے۔ مثلاً تعلیم ، سائنس ، صنعت وغیرہ۔ اگر ہمارے نوجوان اس مقصد سے وہاں جائیں اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے کس طریقے سے اپنے ملک کو ترقی دی ہے، تو یہ ایک قابل تعریف فعل ہے۔

لیکن مغرب سے مراد اگر ڈسکو قسم کی مصروفیات ہیں تو غلط ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ دیکھیں ایک تو وجہ اس رجحان کی یہ ہوتی ہے کہ انسان ہمیشہ اونچائی کی طرف دیکھتا ہے۔ اور مغربی ممالک چونکہ ترقی یافتہ ہیں تو لوگ انہیں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس وقت مسلمان عروج پر تھے تو مغرب والے بھی انہی کے طور طریقے اپناتے تھے۔

اچھا ایک بات یہ بھی ہے کہ آج ہم کسی کے گھر جائیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ صاحب اپنے بچے کو بلائیں گے اور کہیں گے کہ انکل کو اپنا سبق سنائیں۔ بچہ فوراً "بابا بلیک شیپ" سنا دے گا۔ حالاں کہ ہمارے زمانے میں بچے ایک تو انکل نہیں کہتے تھے کچھ اور رشتے ہوتے تھے۔ دوسرے سبق میں کلمہ سناتے تھے یا "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" سناتے تھے۔ تو اصل ضرورت یہ ہے کہ ہم بچوں کو اپنی

تہذیب سکھائیں مغربی تہذیب نہ سکھائیں۔

احسن :۔ ہمیں بتایا گیا کہ پاکستان اسلامی ملک ہے۔ لیکن یہاں اسلام والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں غیر اسلامی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے ؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ بیٹے ایک واقعہ ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ کا زمانہ تھا۔ روم کے بادشاہ نے اپنا سفیر بھیجا کہ وہ یہ دیکھے کہ یہ کون سی قوم ہے اور کیا کام کرتی ہے کہ اتنی جلدی ترقی کرتے ہوئے پوری دنیا پر چھاتی چلی جارہی ہے۔ سفیر نے واپس آکر صرف ایک جملے میں یوں نقشہ کھینچا کہ "وہ لوگ نہ تو دھوکا دیتے ہیں اور نہ دھوکا کھاتے ہیں۔" تو اصل میں اسلام ٹی وی، ریڈیو یا مسجدوں کی تعداد میں نظر نہیں آتا بلکہ اسلام نظر آتا ہے ملک کے حالات میں۔ اگر لوگ محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں تو ملک اسلامی ہے اور اگر نہیں کرتے تو غیر اسلامی۔ آپ کی بات سے میں متفق ہوں کے اسلام نظر آنا چاہئے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ ٹی وی پر کتنے پروگرام اسلامی ہوتے ہیں یا کتنے رسائل اسلامی چیزیں چھاپتے ہیں۔ یا یہ کہ کتنی مسجدیں بن رہی ہیں۔ نہیں۔ ہمیں مسجدوں سے زیادہ انسان بنانے ہیں۔ انسانوں کے عمل میں اسلام نظر آنا چاہئے۔

منعمہ :۔ آج کل والدین کو اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے کا اتنا جنون کیوں ہوتا ہے حالانکہ مغربی طرز کے جو لوگ ہیں ان کے اسکولوں میں اردو نام کا کوئی مضمون نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر منظور احمد :۔ یہ جو انگریزی اسکولوں کی لعنت ہمارے ملک پر مسلط ہو گئی ہے اس کا تو میں سخت مخالف ہوں۔ البتہ میں انگریزی زبان کا قائل ہوں۔ آپ لوگوں کو انگریزی ضرور سیکھنی چاہئے کیوں کہ یہ عالمی زبان ہے اور جہان بھر کا علمی سرمایہ اس میں محفوظ ہے۔ ہماری بڑی بدقسمتی ہوگی کہ سرسید نے جو اہم کام یہاں کے مسلمانوں کے لئے کیا کہ پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی بنائی تاکہ لوگ انگریزی سیکھیں۔ اور اب اگر کچھ لوگ سیکھنے کے قائل ہیں تو کچھ لوگ اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنا چاہتے ہیں۔ نہیں آپ انگریزی سیکھیں اور ضرور سیکھیں مگر بابا بلیک شیپ والے مسئلے سے بچیں۔

ممتاز شیریں :۔ ہمارے گھر میں عام طور پر بچوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ بڑے ہو کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے ہیں کیوں کہ ان پیشوں میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو کیا ڈاکٹر اور انجینئر ہی پاکستان کی خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ کی رائے میں سوچنے کا یہ انداز کیسا ہے ؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ دراصل ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو معاشی خوشحالی نصیب ہو اور میں ایسا سوچنے پر انہیں الزام بھی نہیں دیتا ہوں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ ملک اور قوم کی ترقی کے لئے میڈیسن یا

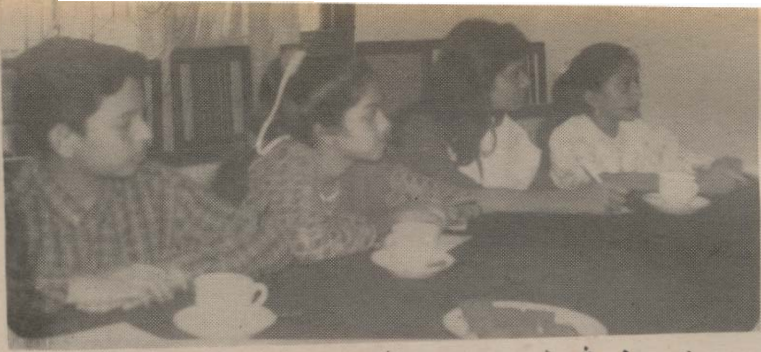

نبیزہ، منعمہ، ثمینہ نعیم اور احسن ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سنتے ہوئے

انجینئرنگ کی تعلیم ہی ضروری ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو اوسط درجے کا ذہن رکھنے والوں کو ان شعبوں میں جانا چاہئے۔ ذہین طالب علموں کو فزکس، ریاضی، فلسفہ، سوشیالوجی اور معاشیات وغیرہ کا علم حاصل کرنا چاہئے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ بھی اہم ہیں لیکن زیادہ اہم وہ شعبے ہیں جن کا تعلق فکری اور عملی زندگی سے ہے۔

منعمہ :۔ آپ نے کہا تھا کہ نوجوانوں کو پہلے تیار ہونا چاہئے پھر علمی زندگی میں آنا چاہئے۔ اس میں زیادہ تر ہاتھ ہمارے اساتذہ اور والدین کا ہوتا ہے۔ تو میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ والدین اساتذہ کہاں تک اپنے بچوں اور شاگردوں کا کردار بنانے میں کامیاب ہیں؟

ڈاکٹر منظور احمد :۔ یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ میں اس معاملے میں والدین اور اساتذہ دونوں کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں والدین سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بچوں کو اسکول بھیج دیا تو بس ان کی ذمہ داری پوری ہو گئی اور استاد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بچوں کو اے بی سی ڈی سکھا دی یا پہاڑہ سکھا دیا تو ان کا فرض بھی پورا ہو گیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی اخلاقی تربیت بھی کریں۔ لیکن اگر والدین یہ کام نہیں کرتے تو جو بچے سمجھ دار ہو گئے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اخلاقی دستے بنا کر اخلاقی تحریک چلائیں اور چھوٹے موٹے کام کریں۔

طاہر مسعود :۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے موضوع پر بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے آپ نے سیکھا ہو گا۔ ان کی گفتگو میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جن پر آپ کو سوچنا چاہئے اور انہیں یاد رکھنا چاہئے۔ آپ کے سوالات بھی یقیناً ابھی بہت سے باقی ہیں۔ ان کے لئے تو پوری ایک کتاب چاہئے۔ تو میں آخر آپ سب کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے ہمیں اپنا انتہائی قیمتی وقت دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کا بھی ممنون ہوں کہ آپ یہاں تشریف لائے۔

ICI in Pakistan Towards making the world a better place

ICI's involvement in Pakistan dates back to the very inception of the country.
Nearly 50 years ago, the very first ICI plant took shape at Khewra in the Punjab.

Today, some five decades later, and with much additional investment, ICI has been able to assist Pakistan in moving towards self-reliance in paints, soda ash, polyester staple fibre and specialty chemicals with plants dotted around the country.
In addition, essentials like pharmaceuticals, chemicals and agrochemicals are sourced by ICI's merchanting business to provide reliable and assured supplies.
All to meet the wide range of industrial and consumer essentials necessary for a young and growing country's needs —striving towards making it a better place for its people.

ICI in Pakistan, and through its membership of the ICI world-wide Group, is committed to assist the country to bring Quality to Life in Pakistan.

ICI Pakistan Limited ICI House 5 West Wharf Karachi Pakistan

جو وطن بنا کے چلے گئے جو چمن سجا کے چلے گئے

آزادی کی روشن کرنیں ان کے دم سے پھیلیں

ان چہروں کو کیسے بھولیں یہی ہے اپنا مان

جن کے ذریعے پاک وطن کی منزل ہم نے پائی

پاکستان بنانے والے کتنے عالیشان

تحریک پاکستان کے نامور رہنماؤں کے نام ترتیب وار (دائیں سے بائیں) لکھ کر یکم ستمبر سے قبل ہمیں بھجوا دیجئے۔ تمام درست نام بھجوانے والوں میں سے
۳ کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیا جائے گا

عظیم قائد عظیم رہبر

تمہیں ہمارا اسلام پہنچے

ئدینِ آزادی کو پاکستان کے نامور آرٹسٹ **آفتاب ظفر** کا خراجِ عقیدت

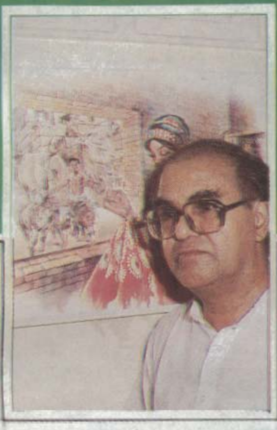

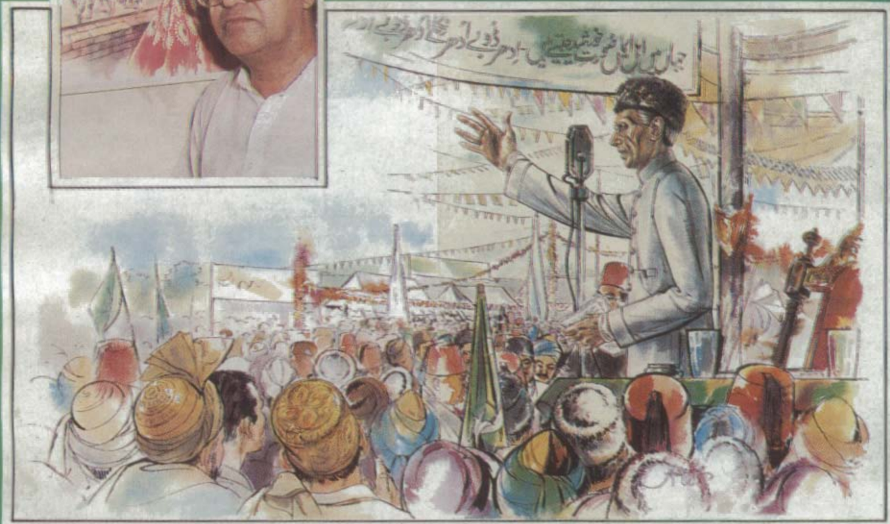

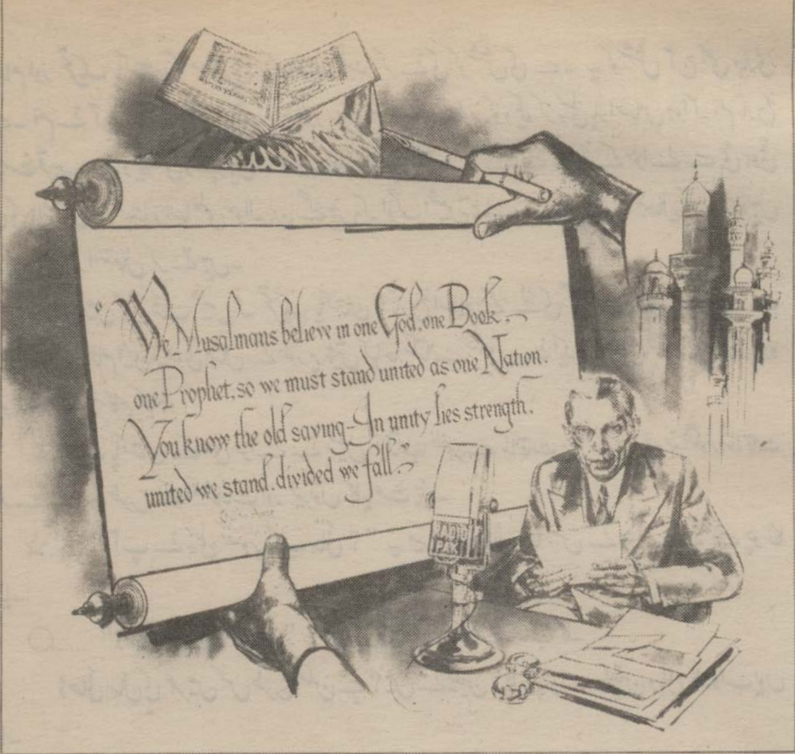

عظیم پاکستانی مصور

آفتاب ظفر

جس نے تاریخِ اسلام اور تحریکِ پاکستان کو تصویروں سے رقم کیا

آفتاب ظفر کا نام مصوّری کے حوالے سے عہد جدید کا معتبر ترین نام ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہمیشہ زندہ رہنے والی شاہکار تصاویر بنا کر وہ ایک تاریخ رقم کر چکے ہیں۔ ان کا اپنا ایک انداز ہے لائن ورک اور حسین رنگوں کے امتزاج سے بنی ہوئی تصاویر کا مخصوص انداز فوراً بتا دیتا ہے کہ انہیں آفتاب ظفر کے علاوہ کوئی اور تخلیق نہیں کر سکتا۔

آفتاب ظفر کی ہر تصویر ان کی وُسعتِ نظر، حسِ جمالیات، اور حسُن و توازن کا شاہکار ہوتی ہے۔ مصوّری کے حوالے سے تو وہ باکمال ہیں ہی مگر ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تاریخ

اسلام اور تحریکِ پاکستان کو مصوّری کے ذریعہ قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش آج بھی جاری ہے۔ ہم نے آج تک تاریخ کو صرف پڑھا اور سنا تھا مگر ان کی تصاویر کو دیکھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ ہم تاریخ کو بہت قریب سے دیکھ بھی رہے ہیں۔ حبیب بنک اور پی آئی اے کے لئے تاریخ کے حوالے سے بنی ہوئی ان کی ڈائریاں اور کیلنڈر ایسا علمی حوالہ بن گئے ہیں کہ لوگ انہیں نایاب کتب کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں اور بطور حوالہ استعمال کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریک پاکستان یا تاریخ اسلام کے لئے کی گئی مصوّری کے حوالے سے آفتاب ظفر کا نام ایسی اچھوتی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ایک سیریز کی شکل میں اتنا زیادہ مربوط اور بھرپور کام کیا ہو

تحریک پاکستان کے اسی حوالے نے ہمیں آفتاب ظفر سے ملاقات پر اکسایا۔ یہ خوشگوار ملاقات ہمارے لئے کئی طرح کے انکشافات اور حیرتوں کا باعث بنی۔

☆...... "آپ نے پہلی تصویر کب بنائی ؟" یہ میرا پہلا سوال تھا جس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

○...... "ڈھائی سال کی عمر میں" یہ جواب تھا آفتاب ظفر صاحب کا۔

ڈھائی سال کی عمر میں کس طرح ممکن ہے ؟ میں نے یقین دہانی چاہی ...... یقین دہانی کا جواب یوں ملا۔

"ڈھائی سال کی عمر میں اپنے والد صاحب کے ساتھ گرداس پور میں کھلے آسمان تلے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ دیکھ کر ذہن میں سوال ابھرا کہ یہ ستارے کیا ہیں ؟ اور کیوں ہیں ؟ انہیں کس نے بنایا ہے ؟ ...... میں نے یہ سوال اپنے والد صاحب سے کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ ڈھائی سال کی عمر میں، میں نے ایک ایسا سوال پوچھا تھا جس کی رفعت آسمان تک تھی۔ اگلے روز جب میں سو کر اٹھا تو میں نے گھر کی دیواروں پر بہت سے ستارے بنائے اور والد صاحب سے کہا کہ یہ ہیں وہ ستارے جو میں نے رات کو دیکھے تھے ...... تو یوں گویا میری پہلی تصویر ستاروں کی تصویر تھی جو میں نے ڈھائی سال کی عمر میں بنائی۔"

یہ فطری بات ہے، بچے کو بڑے ہو کر جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کی کچھ علامتیں بچپن ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ آفتاب ظفر کی یہ پہلی تصویر غالباً ایسی ہی علامت تھی۔

پانچ سال کی عمر میں سرکس کے جانوروں کو دیکھ کر گھر آئے اور انہی جانوروں کی تصاویر بناڈالیں یوں گویا مصوّری کا آغاز ہو گیا......

آفتاب ظفر نے بتایا کہ "قائداعظم کی تصویر تو مجھے بچپن سے یاد تھی۔ جب بھی میرے والد مجھ سے کہتے کہ تصویر بنا کر دکھاؤ میں فوراً ہی قائداعظم کی تصویر بنا ڈالتا۔"

☆...... تحریک پاکستان کے حوالے سے آپ نے پہلی تصویر کب بنائی اور وہ کس کی تھی؟

○...... "۱۹۴۷ء میں گرداس پور میں مسلم لیگ کے راہنماؤں نے ایک جلوس نکالا، اس جلوس میں میرے والد صاحب بھی تھے جو گرداسپور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ میں اس وقت مسلم گارڈز کا سارجنٹ تھا۔ میں نے یونیفارم پہن رکھا تھا اور جلوس میں سب سے آگے آگے پاکستان کا جھنڈا اٹھا کر چل رہا تھا۔ میرے پیچھے مسلم لیگی رہنما تھے گھر آکر میں نے ایک کاغذ پر ہوبہو اس جلوس کی منظر کشی کی جو سب کو بے انتہا پسند آئی۔

آفتاب ظفر صاحب سے مصوّری کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ تحریک پاکستان کی بابت بہت کچھ سنا اور جانا۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ ان کے سینے میں ایک تاریخ دفن ہے۔ تحریک پاکستان کی تاریخ جس کا وہ خود بھی حصہ ہیں۔ پاکستان کے لئے مصوری سے لے کر عملی جدوجہد تک انہوں نے بہت کچھ کیا اور ہنوز کر رہے ہیں...... آفتاب ظفر صاحب کے گرانقدر خیالات اور دیگر بہت سی قیمتی باتوں کو تو ہم آئندہ کسی اشاعت کے لئے اٹھا رکھتے ہی البتہ ان کی وہ باتیں جو تحریک پاکستان سے متعلق ہیں ان کو اختصار کے ساتھ آپ کی معلومات کے لئے شائع کر رہے ہیں۔

آفتاب ظفر نے ۸ سال کی عمر میں گرداسپور سے ہجرت کی ان کے بھائی چونکہ ائر فورس سے متعلق تھے اس لئے وہ انہیں رسالپور لے آئے۔ کچھ عرصے بعد آفتاب ظفر والدین کے ساتھ لاہور آگئے اور پھر

طویل عرصہ لاہور میں گذرا۔

۱۹۴۸ء میں آفتاب ظفر کے والد صاحب نے ان کی بنائی ہوئی تصاویر اور خطاطی کے نمونے قائد اعظم کو بھجوائے۔ قائد اعظم نے جواباً خط لکھ کر حوصلہ افزائی کی اور لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ یہ بچہ آگے چل کر بڑا آرٹسٹ بنے گا۔" قائد اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ آفتاب ظفر آج مصوّری کے حوالے سے بہت بڑا نام ہے۔ یہ نام وقت کے ساتھ ساتھ اور محترم ہوتا جائے گا۔ مصوّری اپنی قدر ایک دن میں نہیں کروالیتی بلکہ قدر دانوں کا حلقہ برسوں اور صدیوں کا سفر طے کر کے وسیع ہوتا ہے۔

آفتاب ظفر نے ۹ سال کی عمر میں میو اسکول آف آرٹس میں داخلہ لیا جو آج نیشنل اسکول آف آرٹس کہلاتا ہے۔ اس وقت اس اسکول میں داخلے کے لئے عمر کی حد کم از کم ۱۴ سال تھی مگر آفتاب ظفر کی قابلیت کے باعث انہیں داخلہ دے دیا گیا۔

۱۹۵۲ء میں آفتاب ظفر اپنے استاد شیخ احمد کے ساتھ کراچی آ گئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنے استاد کی نگرانی میں سلور برڈٹ کمپنی نیویارک کے زیر اہتمام شائع ہونے والی نصابی کتب کے لئے مصوّری کی۔ یہ کتابیں پاکستان ہی میں پڑھائی جاتی تھیں مگر شائع امریکہ سے ہوتی تھیں۔ اس معیار کی نصابی کتابیں آج تک پاکستان میں شائع نہیں ہو سکیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور عبداللہ بٹ جیسے نامور قلمکار شامل ہوا کرتے تھے۔

آفتاب ظفر کے عہد طالب علمی کی باتیں سن کر اپنی کاہلانہ زندگی پر شرم آنے لگتی ہے۔ وہ صبح ۵ بجے اٹھ کر ۱۲ میل دور واقع اسکول پیدل جایا کرتے اور پیدل ہی واپس آتے۔ پھر خلیفہ احمد حسن رقم سے کتابت سیکھنے جاتے۔ رات ۸ بجے گھر واپس آتے۔ گھر آکر کھانا کھاتے اور رات ۹ بجے دیئے کی روشنی میں ہوم ورک کرتے ...... کیا آپ حصول علم کے لئے اتنی سختیوں کا تصور آج کے دور میں کر سکتے ہیں؟

آفتاب شیخ سے متعلق ہم آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتے ہیں مگر صفحات کی قید قلم کا راستہ روک رہی ہے۔

ایک اور بات جس نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر کامیابی کو اپنے والد صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ بڑے لوگوں کو شیوہ ہے کہ وہ بڑے ہو کر اس بات کو نہ بھولیں کہ وہ کون سی ہستیاں ہیں جنھوں نے انہیں اتنا بڑا آدمی بنانے کے لئے کون کون سے دکھ نہ اٹھائے ہوں گے اور کیسے کیسے جتن نہ کئے ہوں گے۔

وعدہ

حنا خیری

کمال نے واقعی کمال کر دیا تھا۔ انٹر کے امتحان میں اس کی پہلی پوزیشن آئی تھی۔ وہ تھا بھی انتہائی ذہین اور محنتی لڑکا۔ پہلی جماعت سے اب تک وہ ہر سال امتحانات میں اوّل آتا رہا تھا۔ نتیجے کے اعلان کے بعد کمال خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شہر کے سارے اخباروں میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ اس نے اب تک سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کر کے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ کمال ان دنوں مبارکبادیں سمیٹتا پھر رہا تھا۔ اس کی الماری تحائف کے ڈھیر سے بھر چکی تھی۔ یوں تو اسے سب نے ہی تحفے دیئے تھے مگر نہیں دیا تھا تو دادا ابا نے ہر سالگرہ پر وہ کمال کو نقد پیسے دیا کرتے تھے کہ وہ اپنی پسند کی کوئی چیز خرید لے مگر اب جبکہ اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے تو انہوں نے ہی اپنی جیبیں سی لی تھیں۔ کمال کے لئے بھی یہ بات بڑی حیرت کا باعث تھی۔ اس کے سارے تحائف کو انہوں نے بڑے شوق سے دیکھا تھا اور ان پر خوش دلی سے تبصرہ بھی کیا تھا "اچھا ہے"، "بہت اچھا"، "بڑی عمدہ گھڑی ہے"، "خوبصورت قلم ہے"، بہت اچھی کتاب ہے"، "اللہ مبارک کرے" وغیرہ۔ مگر خود کچھ دینے کے بارے میں انہوں نے زبان نہ کھولی۔

"ٹھیک ہے ...... نہیں دیئے تحفہ تو نہ سہی میں بھی اپنے منہ سے نہیں مانگوں گا"۔ آخر کمال۔ نے کچھ خفا ہو کے سوچا۔

دوستوں کے بے حد اصرار پہ کمل نے ایک شاندار اور پر تکلّف دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد سب یار دوست بیٹھے گپ شپ کرنے لگے۔

"ہاں تو بھئی کمال۔ کب روانگی ہے تمہاری؟" آفتاب نے پوچھا۔

"آخر بھئی کیوں اتنی جلدی ہو رہی ہے۔" فرحان نے آفتاب کو گھورا۔

"کیوں نہ ہو۔ کمال وہاں پہنچ کر ہم لوگوں کے لئے بھی تو راستہ صاف کرے گا۔ آفتاب نے کہا۔"

"ہائے امریکہ!" منصور نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جانے ہماری باری کب آئے گی!"

"محنت سے پڑھتے تو آج ٹھنڈی آہیں نہ بھرتے۔" عابد نے فقرہ اچھالا۔ اسی اثناء میں دادا ابا برآمدے میں آکر رکھی کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کی گفتگو سننے لگے۔

"کیوں کمال۔ پڑھائی کے بعد تمہارے کیا ارادے ہیں"۔ منصور نے پوچھا "میرا مطلب ہے جاب تو وہیں کرو گے نا!"

"ظاہر سی بات ہے۔" کمال بولا۔ "میں یہاں واپس آتا بھی ہوں تو مجھے کیا مل جائے گا۔ چند ہزار کی نوکری اور بس۔"

"بالکل ٹھیک۔ مجھے ایسا موقعہ مل جائے۔" آفتاب حسرت سے بولا "ایمان سے یہاں سے ایسا بھاگوں کہ کبھی مڑ کے بھی نہ دیکھوں۔"

"کیوں؟ فرحان نے حیرت سے سوال کیا۔

"ظاہر۔ہے یہاں دھرا کیا ہے آخر؟ نہ تعلیم نہ اچھا مستقبل ...... لڑائی، جھگڑے، دنگا، فساد ...... دہشت ہر طرف دہشت گردی اور تخریب کاری۔ آئے دن کرفیو ۔ نہ جان مال محفوظ ہے نہ عزت آبرو۔ جانے کب کہاں، کیا ہو جائے اور اس پہ بھی تم کہتے ہو کیوں؟" آفتاب نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"ہاں یار یہ بات تو ہے منصور نے افسردگی سے بولا۔ "میرے بھی رشتہ داروں میں سے کوئی امریکہ چلا گیا ہے اور کوئی کینیڈا۔ اس ملک میں آخر رکھا کیا ہے ...... جسے اپنی جان پیاری نہ ہو وہ بے شک یہاں رہے۔ جوتیاں چٹخاتا پھرے یا کسی اڑتی ہوئی گولی کا نشانہ بن جائے۔ یہ ملک تو اب رہنے کے قابل رہا

نہیں۔"

"کیوں کمال ٹھیک ہے نا۔" آفتاب نے پوچھا۔ آفتاب نے سوال پوچھا تو کمال سے تھا مگر عابد بیچ میں ٹپک پڑا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ آخر یہ ملک ہمارے لئے ہی تو بنا تھا۔ ہم نوجوانوں کے لئے۔ اگر ہم ہی اسے چھوڑ جائیں گے تو کیا یہ مناسب ہو گا۔ ہم اسے وطن دوستی کا نام دے سکیں گے۔ اور کمال "اب وہ کمال سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں تو حکومت اپنے خرچ پر باہر پڑھنے بھیج رہی ہے۔ کیا یہ احسان فراموشی نہ ہوگی کہ یہ ملک جب تمہیں لکھا پڑھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کر دے تو تم اسے ایک بیکار ملک کہہ کر یہاں سے چلے جاؤ۔ وہیں نوکری کرو...... اور اپنا مستقبل بناؤ۔ آخر ملک کا مستقبل کون بنائے گا۔"

"خدا کے لئے عابد! اپنا لیکچر بند کرو۔" آفتاب نے بیزاری سے کہا۔ "تمہیں اگر یہیں نکے رہنا ہے تو شوق سے رہو مگر ہمارے کان مت کھاؤ۔" سب دوستوں کے مشترکہ قہقہے گونج اٹھے۔ ہنستے ہوئے، کمال کی نگاہ دادا ابا پہ پڑی جو بر آمدے میں بیٹھے انہیں چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہری افسردگی طاری تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ دادا ابّا بڑے خاموش خاموش سے رہنے لگے تھے۔ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔ کمال ان دنوں اتنا مصروف اور خود میں اتنا مگن تھا اور خوش تھا کہ اس نے دادا ابا کی خاموشی پہ غور ہی نہیں کیا۔ اس روز کمال کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بر آمدے میں آ بیٹھا۔ اس نے دیکھا کہ دادا ابا کے کمرے کی بتی اب تک جل رہی ہے۔ کمال دادا ابا کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بستر پہ لیٹے تھے۔ کمال کو دیکھ کے بولے "آؤ کمال...... کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟" کمال ان کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔

"بڑے دن ہو گئے تم سے بات کئے۔" دادا ابا چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔ یاد ہے کمال بچپن میں تم مجھ سے کہانی سننے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ آج میرا بہت جی چاہ رہا ہے تمہیں ایک کہانی سناؤں۔ یہ ایک سچی کہانی ہے۔

"سنائیے دادا ابّا۔" کمال نے اشتیاق سے کہا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان بنے کوئی سات آٹھ سال ہی ہوئے تھے۔ کسی کام سے میرا گزر ایک گاؤں سے ہوا وہاں ایک اسکول کے قریب میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ میں شاید اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے دونوں بازو غائب تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی لگی۔ ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی کہ یہ کون ہے، اسے کہاں دیکھا ہے؟ اسی کشمکش میں تھا کہ یکایک بجلی سے کوندی اور مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ وہ میرا کالج کا دوست اصغر

تھا۔ لیکن جب ہم آخری بار ملے تھے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا یہ اسے کیا ہو گیا۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ میں نے اصغر کا حال احوال دریافت کیا اور پھر اس کے بازوؤں کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے وہ بولا "ابھی ساری رام کہانی سناتا ہوں۔ ذرا چائے منگوالوں۔" چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ بولا۔

"یار احمد۔ کالج کے بعد تمہاری اور ہماری راہیں تو الگ ہو گئی تھیں۔ میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ ان دنوں پاکستان بننے کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں بھی جوش میں خوب پاکستان کے حق میں تقریریں کرتا اور نعرے لگاتا۔ ہندو اور سکھ خاص طور پر مجھ سے بہت خار کھانے لگے تھے۔ میری زندگی کا واحد مقصد صرف اور صرف پاکستان کا قیام تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ مسلمانوں پہ کیسے کیسے ظلم کئے جاتے تھے اور ان مظالم کے خلاف اگر کبھی کوئی آواز بلند بھی کرنا چاہتا تو اس کی آواز ہمیشہ کے لئے دبا دی جاتی۔ آخری دنوں میں تو فسادات پوری طرح عروج پر تھے۔ مسلمانوں کے قافلے ہجرت کر رہے تھے۔ ہندو اور سکھ غصے میں پاگل ہو کر نہتے مسلمانوں پہ حملے کرتے اور انہیں بے دریغ قتل کر دیتے۔ میری تو وہ تلاش میں تھے اور میں چھپتا پھر رہا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ، بیوی اور دو سال کی بچی مہاجروں کے ایک قافلے کے ہمراہ کر دیا اور کہہ دیا کہ میں بعد میں موقع دیکھ کر آؤں گا۔ ظالموں نے اس قافلے کے ایک ایک فرد کو شہید کر ڈالا مجھے جب علم ہوا تو میں خون کے آنسو رویا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک روز دشمنوں کو میری خبر ہو گئی انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے چاروں طرف مسلح ہندو اور سکھ تھے۔

"ہنھ یہ پاکستان کے لئے بڑا شیر بنا پھرتا تھا۔ اسے ایسا تڑپا تڑپا کے مارو کہ یہ پاکستان کا نام تک بھول جائے۔" ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔

"اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں الگ کر دو۔" ان میں سے ایک سکھ کرپان نکال کر میری طرف بڑھا ہی تھا کہ دوسرے نے اسے ہاتھ کے اشارے روکا "ٹھہرو...... اسے مارنا تو بہت آسان ہے اور یہ مر گیا تو پھر مزا کیا آئے گا۔ پاکستان کے قصیدے پڑھنے والے کے لے اصل سزا تو یہ ہوگی کہ یہ ہماری غلامی میں اسی ملک میں رہے۔ کیوں ؟ تمہیں زندگی چاہئے یا موت۔ پاکستان جانا چاہتے ہو تو موت تمہارا مستقبل بنے گی اور یہاں رہو گے تو زندگی تمہارا استقبال کرے گی۔ بتاؤ فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا "لعنت ہے اس زندگی پہ جو تمہاری غلامی میں بسر ہو۔

"بیکار کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔" پہلے سکھ نے دوسرے سے کہا "اس کی سزا صرف موت ہے" اس کے دونوں بازو اکھاڑ ڈالو۔"

"دوسرا بولا اگر اس میں جان ہوگی تو خود ہی پاکستان چلا جائے گا۔ ہر وقت پاکستان پاکستان کرنے والوں کو وہاں بھیک بھی نہیں ملے گی۔

"وہاں دھرا کیا ہے جو اسے بھیک ملے گی۔" ایک نے قہقہہ لگایا اور پھر انہوں نے مجھ پہ حملہ کر دیا۔ میں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بازوؤں پہ کرپان کے وار پڑتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔ پتہ نہیں کتنے دن بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو معلوم ہوا میں مہاجروں کے کیمپ میں تھا۔ میرے زخم بھرنے میں دن لگ گئے۔ مجھے اپنے ہاتھ کھونے کا دکھ تو تھا لیکن اس بات کی زیادہ خوشی تھی کہ میں جیتے جی اپنی پاک سرزمین پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ان درندوں کا کہا غلط ثابت کر دیا۔ میں نے فاقہ کرنا گوارا کر لیا لیکن بھیک نہیں مانگی اور گاؤں کے اس اسکول میں میں بچوں کو پڑھاتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے اس نے بڑی عزت دی ہے۔"
اصغر نے اپنی بات ختم کی اور میں نے اس عظیم انسان کو دیکھا اور بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"آج اس واقعہ کو کتنے سال گذر گئے میری اس سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔" دادا ابا خاموش ہوئے تو کمال محویت سے چونک اٹھا۔

"بس بیٹے کہانی اتنی ہی سی تھی؟ دادا ابا نے آہستگی سے کہا اور کمال ...... وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ وہاں سے اٹھ گیا۔

کمال کے جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ خالہ، ماموں، چچا، پھوپھیاں سب ہی اس کی دعوتیں کر رہے تھے۔

دادا ابا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کمال کل جانے والا تھا۔ وہ کمال سے بڑا پیار کرتے تھے اور اس کی جدائی کے خیال سے پریشان تھے۔

دروازے پہ کھٹکا ہوا تو انہوں نے دیکھا۔ کمال کھڑا تھا۔ "آؤ کمال۔" کمال خاموشی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا "دادا ابا میں جانتا ہوں آپ نے وہ واقعہ مجھے کیوں سنایا تھا۔ میں آپ کی امیدیں نہیں توڑوں گا۔" وہ بولا "ہاں دادا ابا...... میں وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ضرور جا رہا ہوں، مگر وہاں سے میں جو کچھ لے کر لوٹوں گا اس پر پہلا حق اس ملک کا ہوگا۔ میں واپس آؤں گا۔ اور یہاں سے کبھی نہ جانے کے لئے آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

دادا ابا کا چہرہ کھل اٹھا انہوں نے بڑھ کر کمال کو گلے لگا لیا اور پھر بولے "ذرا ٹھہرو" الماری سے ایک پیکٹ نکالا اور کمال کے ہاتھوں میں تھما کر بولے "بیٹا تمہارا تحفہ رہ گیا تھا نا...... یہ لو"۔ بعد میں کمال نے دیکھا تو پیکٹ میں ایک خوبصورت قلم تھا اور ایک نہایت حسین باتصویر کتاب تھی۔ کتاب پاکستان کے بارے میں تھی۔

س۔ پاکستان میں شمسی توانائی کی بہتات ہے۔ اس سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے ؟۔

اعجازالدین بھٹی۔ کراچی

ج۔ آپ نے بالکل درست کہا کہ پاکستان خوش قسمتی میں ان ممالک میں سے ہے جہاں سورج کی روشنی تقریباً تمام سال ہی رھتی ہے۔ یہ روشنی اور حرارت دراصل توانائی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس پر ہماری زندگیوں کا دارومدار ہے۔ اس کو ایک نقطہ پر جمع کر کے اتنی توانائی پیدا کی جاسکتی ہے جو پانی کو گرم کر کے بھاپ بناتی ہے اور اس بھاپ سے ٹربائین چلا کر بجلی بنائی جاتی ہے۔

کافی دنوں پہلے خبر آئی تھی کہ شمسی توانائی سے چلنے والا چولھا بنالیا گیا ہے۔ اور ابھی چند سالوں پہلے کی بات کہ جامعہ این ای ڈی کراچی کے تین باہمت طالب علموں نے پاکستان کی پہلی شمسی کار سولر سامبا بنائی۔ ۳۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی کار کی چھت پر شمسی بیٹریاں لگی ہوئی تھیں جو سورج کی روشنی سے توانائی جذب کرتی تھیں۔

غرض یہ کہ سورج کی روشنی ایک نہ ختم ہونے والا توانائی کا ذریعہ ہے۔ جہاں توانائی کے دیگر ذرائع مثلاً کوئلہ ، گیس اور پیٹرول محدود مقدار میں دستیاب ہیں اور ایک نہ ایک دن ان کے ذخائر ختم ہو جائیں گے ، وہاں شمسی توانائی ہمارے مستقبل کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرے گی۔ دنیا بھر کے سائنسدان اس کے حصول کو سہل اور قابلِ استعمال بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اور پاکستان میں بھی اس سمت میں کوششیں جاری ہیں۔

س۔ پاکستان کے مصنوعی سیارے کا آج کل بہت چرچا ہے۔ یہ کن مقاصد کے لئے ہے۔ اس کا اہتمام کون کر رہا ہے؟

اسماء حسن جلال پور جٹاں

سائنس انکوائری

ایاز محمود

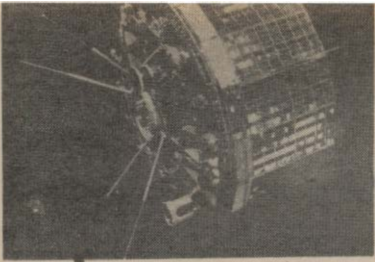

ج۔ پاکستان کے پہلے مصنوعی سیارے 'بدر اے' کے خلا میں چھوڑے جانے کے بعد پاکستان بھی دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ خلائی دور میں باضابطہ طور پر داخل ہو گیا ہے۔ یہ ہم سب کے لئے نہایت فخر کی بات ہے۔

۴۸ سینٹی میٹر کے قطر کے حامل بدر اے، کا وزن تقریباً ۵۰ کلو گرام ہے۔ اس کو چین کی سرزمین سے راکٹ کے ذریعے خلائی مدار میں بھیجا گیاہے۔ پاکستان کے پاس فی الحال ایسے راکٹ نہیں جو یہ کام کر سکیں۔

بدر اے۔ مکمل طور پر پاکستانی ماہرین کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اسے ۱۹۸۷ء ہی میں مکمل کرلیا گیا تھا مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر اسے خلا میں نہیں چھوڑا جاسکا۔ یہ سیارہ چونکہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے لہٰذا اس کا دائرہ کار خاصا محدود ہے۔ خلائی تحقیق کے ادارے سپار کو نے کراچی اور لاہور میں دو اسٹیشن بنائے ہیں جو اس سیارے کو پیغامات دینے۔ کے ساتھ ساتھ اس سے پیغامات وصول بھی کر سکیں گے۔ یہی اس سیارے کا دائرہ کار ہے۔ یعنی وہ پیغامات اور اطلاعات وصول کرے، انہیں محفوظ کرے اور اپنے مدار کے حوالے سے متعین مقام پر نشر کر دے۔

بدر اے نچلے مدار کا سیارہ ہے۔ اپنے ہر چکر کے دوران یہ ۱۵ سے ۲۰ منٹ تک پاکستان کے اوپر سے ہو کر گزرے گا۔

بدر اے کو خلا میں چھوڑے جانے کا پروگرام چین میں خراب موسم کی وجہ سے کچھ تاخیر کا شکار ہو گیا تھا مگر آخر کار اسے ۱۶ جولائی ۱۹۹۰ء کو خلائی مدار میں بھیج دیا گیا۔ آخری اطلاعات تک یہ سیارہ اب تک ٹھیک کام کر رہا ہے۔

س۔ میں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ پاکستان کے ساحلی علاقے تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔ ــــــب عثمانی کراچی

ج۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تیل ایک نہایت کار آمد ایندھن ہے جو توانائی حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ تجارتی، صنعتی اور نجی طور پر تقریباً ۸۰ فیصد توانائی تیل ہی فراہم کرتا ہے اسی لئے ساری دنیا میں اس کی زبردست مانگ ہے۔

پاکستان میں صورتِ حال یہ ہے کہ روزانہ تقریباً ۵۲،۰۰۰ بیرل تیل نکالا جارہا ہے، جو بمشکل ہماری ۳۳

فیصد ضروریات کو پورا کرتا ہے اور بقیہ تیل زرِ مبادلہ دے کر بیرونی ممالک سے بر آمد کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی بہت خوشگوار صورت حال نہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ اب کافی قطعیت کے ساتھ یہ یقین ہو چلا ہے کہ ہمارے ساحلی علاقے اس دولت سے مالا مال ہیں۔ یہ خاص طور پر وہ علاقے ہیں جہاں دریائے سندھ ڈیلٹا بناتا ہوا بحیرہ عرب میں گرتا ہے۔ اس کے علاوہ مکران کے ساحلی علاقوں میں بھی تیل کی موجودگی کا بہت قوی امکان ہے۔

ابھی تک پاکستان میں تیل کی تلاش کا کام بہت محدود پیمانے پر ہوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ ایک دقّت طلب اور مہنگا کام ہے۔ تیل کا ایک کنواں کھودنے پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور پھر ضروری نہیں کہ ہر کنویں سے تیل نکل ہی آئے۔ اوسطاً دس کنویں کھودنے پر ایک کنویں میں سے تیل نکلتا ہے۔ اس کے لئے وسیع پیمانے پر ارضیاتی سروے کرنا پڑتا ہے جس سے حاصل شدہ اعداد و شمار کی درستگی ہی کامیابی کے امکانات پیدا کرتی ہے۔ یہ مرحلہ بھی ایسا ہے جسے ابھی عبور کرنا ہے۔

ان سب دقّتوں کے باوجود پاکستان کے ساحلی علاقوں میں تیل کی تلاش کا کام جاری ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک تیل در آمد کرنے والے ممالک کی صف میں ہو گا۔

آئندہ ماہ سے
سائنس انکوائری کی جگہ
ایک نیا خوبصورت
سائنسی اور
معلوماتی سلسلہ

جہانِ نو

ناقابلِ یقین اور
حیرت انگیز ایجادات
سائنسی کرشموں پر
مبنی یہ سلسلہ
ستمبر میں پڑھنا نہ بھولیں

دَورِ جدید کے اہم سائنسی کارناموں کی رپورٹ

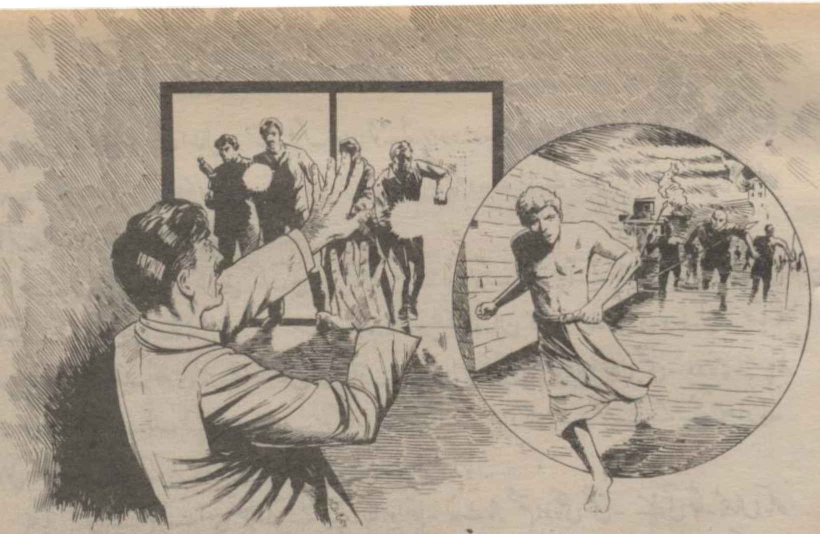

تعاقب

م۔ الف۔ راشد

وہ اپنے جسم کی تمام تر قوت سے دوڑ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے بھالے، کرپانیں اور لاٹھیاں اٹھائے ہوئے بلوائیوں کا ایک گروہ، جے ہند کے نعرے لگاتا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کا توانا بدن اسے لمحہ بہ لمحہ دشمنوں سے دور کر رہا تھا۔ راستے کی ناہمواری اور قد آدم خار دار جھاڑیاں اس کا راستہ روکنے میں ناکام تھیں۔ جسم پر لباس نام کی کوئی شے باقی نہیں بچی تھی۔ جگہ جگہ خراشوں سے خون رِس رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ مسلسل کئی میل دوڑنے کی وجہ سے اب تو ٹانگیں بھی جواب دے چکی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی دوڑ رہا تھا۔ اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے۔

ملک کے حالات کافی عرصے سے خراب چل رہے تھے۔ پاکستان کی آزادی کا اعلان کیا ہوا تھا گویا ایک طوفان آ گیا تھا۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ ہندو اور سکھ بلوائی مسلمانوں کی بستیوں میں قتلِ عام کرتے پھر رہے تھے۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ وہ چھوٹی سی بستی ابھی نفرت کی اس آگ سے محفوظ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کا سالانہ میلہ بڑی دھوم دھام سے جاری تھا۔ اور مختلف قسم کی اشیاء کے اسٹالوں پر خریداری کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ بھیّا نے اس مرتبہ سرخ امرتی کا ٹھیہ لگایا تھا۔ نام تو خیر اس کا لطیف تھا مگر سب لوگ بھیّا کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ وہ بہت اچھا کاریگر تھا۔ اللہ نے ہاتھ میں وہ ذائقہ دیا تھا کہ ایک بار کھانے والا بار بار کھانے کی خواہش کرے۔ اس دن بھی خریداری کرنے والوں

کا زیادہ ہجوم امرتی ہی کے اسٹال پر تھا۔ لوگ یوں ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے آج کے بعد دوبارہ امرتی کھانا نصیب نہ ہوگا۔ بھیّا بھی بڑی پھرتی سے لوگوں کو نپٹا رہا تھا کہ چھوٹے سالے نے آکر کہا۔ ''بھیا! جان بچا کر بھاگ چلو۔ بلوہ ہوگیا ہے''۔

بلوے کی خبر میلے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور لوگ چیختے چلاّتے جائے پناہ کی تلاش میں بھاگنے لگے۔ بلوائیوں نے چُن چُن کر مسلمانوں کو مارنا شروع کیا اور ان کا سارا سامان بھی لوٹ لیا۔ بھیّا کا گھر چار میل دور ایک گاؤں میں تھا۔ لیکن اس گاؤں میں بھی اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ وہ چھپتا چھپاتا لالہ سوبھا کے ہٹّے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ لالہ نے اسے اپنی دکان کے تھڑے کے نیچے چھپا دیا۔ بلوائی آئے اور بھیّا کے بارے میں پوچھا مگر لالہ نے انہیں ٹرخا دیا..........

بھیّا مسلسل گھنٹے بھر سے اس تھڑے کے نیچے دبکا ہوا تھا۔ لوٹ مار ختم ہو چکی تھی۔ میلے کی جگہ جہاں کچھ دیر پہلے قہقہے گونج رہے تھے اب ہو کا عالم تھا۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا تھا۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ مگر بلوائی ابھی تک بھیّا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں کسی نے بتا دیا تھا کہ ایک مسلمان کو سوبھا نے چھپا رکھا ہے۔ لالہ سوبھا گاؤں میں اچھا رسوخ رکھتا تھا۔ بلوائیوں نے بار بار اسے دھمکیاں دیں مگر وہ مان کر نہ دیا کہ اس نے کسی کو چھپا رکھا ہے۔ سوبھا کا چھوٹا بھائی روی بھی جانتا تھا کہ تھڑے کے نیچے کوئی چھپا ہوا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو بلوائیوں کے حوالے کر دیا جائے مگر بھائی کے سامنے مجبور تھا۔ وہ دیر سے اس بحث میں الجھا ہوا تھا کہ آخر ایک مسلمان کو اس نے کیوں پناہ دے رکھی ہے۔ تنگ آکر سوبھا نے اسے وہ وجہ بتا دی.......... اس نے کہا ''بھیّا! ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، وہ ہزاروں روپے لیکر میلے میں آیا تھا۔ آج پہلے ہی دن جب میلہ لٹ گیا تو یقیناً وہ ہزاروں روپے ابھی بھیّا کے پاس محفوظ ہوں گے۔ اسے اگر بلوائیوں کے حوالے کر دیا تو وہ رقم خوامخواہ ڈوب جائے گی۔ ہم بلوائیوں کے جانے کے بعد بھیّا کو گھر لے جائیں گے اور پیسے حاصل کر کے اس کو ختم کر دیں گے۔'' حالانکہ اس نے بہت ہی آہستہ سرگوشیوں میں یہ بات روی کو سمجھائی تھی۔ لیکن تھڑے کے نیچے چھپے ہوئے بھیّا نے سن لی۔ موت بالکل آنکھوں کے سامنے ہو تو انسان کے حواس کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ مرنا تو یوں بھی ہے۔ کیوں نہ ایک آخری کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔ پھر جیسے ہی بلوائیوں کا شور ذرا دور ہوا، بھیّا تھڑے کے نیچے سے نکلا اور یوں بگٹٹ بھاگا کہ روی اور سوبھا دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ بلوائی ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ انہوں نے کسی کو یوں بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس کے پیچھے ہو لئے۔ لیکن بھیّا تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ آخر بلوائیوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر ہی اس نے دَم لیا تھا۔ مگر یہاں بھی حالات اچھے نہیں تھے۔ سب لوگ گھر بار چھوڑ چھوڑ کر

جارہے تھے۔ بھیاّ نے بھی بھرا پُرا گھر چھوڑا اور پاکستان جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو کر لاہور آگیا۔ لیکن اس کا رزق شاید کراچی میں تھا۔ وہ کراچی شفٹ ہوا اور صدر کے علاقے میں امرتی کا چھوٹا سا ٹھیہ لگالیا۔ بھیا کی امرتی............ چند ہی دنوں میں لوگوں کو اس امرتی کا چسکا لگ گیا اور بھیاّ اپنے پرانے غم بھول کر نئی زندگی کی رنگینیوں میں محو ہو گیا۔ بھیاّ کو بس ایک ہی غم تھا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس نے ہزاروں دعائیں مانگیں۔ منتیں مانیں۔ مزاروں پر حاضریاں دیں پھر ایک دن اللہ نے اس کی سن لی۔ اور تیس سال بعد اس کے ہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ بھیاّ بہت خوش تھا۔ بچے کا نام جاوید رکھا گیا۔ بھیاّ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ وہ رات کو اسے اپنے پاس سلاتا اور ذرا بڑا ہوا تو دن کو بھی دکان پر لے جانے لگا۔ بچے کی محبت اتنی شدید تھی کہ بھیاّ نے اسے اسکول میں بھی داخل نہ کروایا۔ بلکہ اپنے ساتھ ہی دکان پر رکھ لیا۔ دن گزرتے گئے اور جاوید دس سال کا ہو گیا۔ وہ دکان پر ہر طرح سے بھیاّ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ پھر نہ جانے کس کی نظر بد اس شہر کو لگی کہ روشنیوں کا شہر کراچی اندھیروں میں ڈوب گیا۔ پہلے جہاں امن تھا، خوشی تھی، سکون تھا۔ وہاں اب فائرنگ کی بھیانک آوازیں گونجنے لگیں۔ لوگ گھروں سے نکلتے وقت خوف زدہ رہنے لگے۔ کاروبار ختم اور رزق تنگ ہو گیا۔ شہر میں زیادہ تر کرفیو رہتا۔ کبھی گھنٹے دو گھنٹے کے لئے وقفہ ہوتا تو روز کمانے اور روز کھانے والے مجبور لوگ روزی کی تلاش میں نکلتے۔ آئے دن کے کرفیو نے بھیاّ کی جمع پونجی کو جلد ہی چاٹ لیا۔ جب نوبت فاقوں تک پہنچنے لگی۔ تو بھیاّ نے بھی وقفوں کے دوران اپنا ٹھیہ لگانا شروع کیا۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ کرفیو کا وقفہ ختم ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ آج خریداری خوب ہو رہی تھی۔ لوگ دکان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جاوید امرتی تولنے میں مگن اور بھیاّ رقم وصول کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ لوگ چیختے ہوئے گلیوں اور دکانوں میں چھپنے کے لئے دوڑے۔ دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ بند ہونے لگے ایک سنسناتی ہوئی گولی جاوید کے سر میں لگی اور اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ بھیاّ نے بدحواسی میں دکان کو چھوڑا اور ایک گلی میں بھاگنے لگے۔ آج چالیس سال بعد ایک بار پھر تاریخ اپنے آپ کو دُھرا رہی تھی۔ وہ اپنی پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ لیکن ساٹھ سال کا بوڑھا کتنی تیز دوڑ سکتا ہے۔ بلوائیوں کا گروہ ان کے تعاقب میں تھا۔ سڑک ہموار تھی مگر قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ تہبند نجانے کب اور کہاں کھل کر گر گیا تھا۔ ایک بنیان بدن پر تھی۔ نحیف ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا............ مگر پھر بھی وہ بھاگ رہے تھے۔ انہیں چالیس سال پہلا بیتا ہوا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ بالکل وہی حالت تھی۔ مگر اس بار ان کے تعاقب میں ہندو یا سکھ نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا کہ آخر وہ کیوں بھاگ رہے تھے۔ کیا زندگی کی حفاظت کے لئے؟............ مگر ان کی زندگی تو وہیں تھڑے پر رہ گئی تھی۔

چودہ اگست

محمد نوید مرزا

زندگانی کی خبر چودہ اگست   روشنی کا ہم سفر چودہ اگست
توڑ کر زندانِ جبر و قہر کو   دے گیا آزاد گھر چودہ اگست
مرحبا خونِ شہیدانِ وطن   بن گیا رنگِ سحر چودہ اگست
قائد اعظمؒ نے بویا تھا شعور   بن کے اُبھرا ہے شجر چودہ اگست
دور کر دو یہ نفاقِ باہمی   کہہ رہا ہے چیخ کر چودہ اگست
راستوں میں کھو گئے ہیں جو انہیں   دینے آیا ہے نظر چودہ اگست

آج ہی کے دن غلاموں کو نوید
کر گیا تھا مقتدر چودہ اگست

a great new taste
mayfair
Fruta Chew
Chew it, you'll love it.
Fruta Chew
Fruta Chew
mayfair
–the sweet favourites

آنکھ مچولی کے معیار کا اعتراف

فیصل مسجد کے حسین اور وسیع آڈیٹوریم کا ایک گوشہ جہاں سینکڑوں آنکھیں آنکھ مچولی کو بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرتے دیکھ رہی ہیں

ان لمحوں کی روداد جب آنکھ مچولی کو پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ قرار دیا گیا

مدیرِ اعزازی کے قلم سے

پاکستان بھر سے آئے ہوئے بچوں کے رسائل کے ایڈیٹرز جناب غلام ربانی آگرو اور ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی ڈاکٹر محمود احمد غازی اور اکادمی ادبیات کے چیئرمین جناب غلام ربانی آگرو حاضرین سے مخاطب ہیں

آنکھ مچولی جیت گیا

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی دعوۃ اکیڈمی سے برادرم افتخار کھوکھر کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔

"جلدی سے اسلام آباد تشریف لے آیئے ہم لوگ پاکستان کے سب سے اچھے رسالے کو، ایوارڈ دے رہے ہیں۔"

یہ تو تھی وہ خبر جس پر ہماری تمام تر توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ورنہ خط میں تو اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔

دوسرے ہی روز ایک اور خط ملا اس خط میں پروگرام کی تفصیل درج تھی جو مختصراً کچھ یوں تھی۔

"دعوۃ اکیڈمی نے پاکستان بھر کے مختلف علاقوں میں رہنے والے بچوں سے ایک مفصّل جائزے کے بعد پاکستان کے سب سے بہترین بچوں کے رسالے کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۱۶ جون کو پاکستان کی سب سے بڑی فیصل مسجد اسلام آباد کے حسین آڈیٹوریم میں سینکڑوں بچوں اور والدین کی موجودگی میں یہ ایوارڈ دیا جائے گا۔ اس تقریب میں چونکہ تمام رسائل کے مدیر شرکت کریں گے اس لیۓ آنکھ مچولی کی نمائندگی کے لئے بھی کسی کو آنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ کرۂ فال آنکھ مچولی ہی کے نام نکل

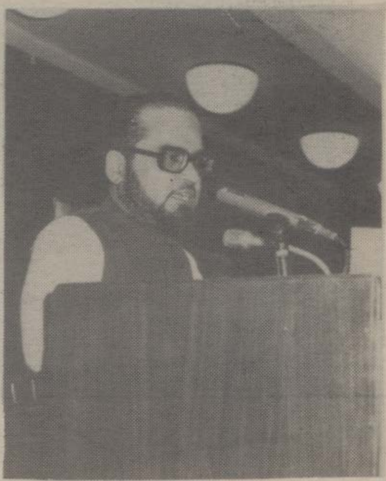

جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی

جناب غلام ربّانی آگرہ

آئے۔"

خط پڑھ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، کبھی خوش فہمی ہونے لگی کہ یہ ایوارڈ ہمیں ملے گا اور کبھی اندیشے ستانے لگتے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آنکھ مچولی کی تو ابھی عمر ہی ۴ سال ہے۔ اس ننھّی عمر میں اتنا بڑا ایوارڈ کیسے مل سکتا ہے؟ دعوۃ اکیڈمی کا دعوت نامہ پڑھ کر پیشن گوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دفتر کا ہر فرد کسی ماہر قیافہ شناس یا اعلیٰ درجے کے نجومی کی طرح اپنے اپنے اندازے بیان کرنے لگا۔ کبھی یقین ہو جاتا کہ ہماری کوشش رائیگاں نہیں جائے گی اور کبھی ساری امیدیں محض یہ سوچ کر دم توڑنے لگتیں کہ بچوں کے بعض رسائل ایسے بھی ہیں جو ۳۵ سال سے لے کر ۴۰ سال کے عرصے سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں ان رسائل کے ہوتے ہوئے ایوارڈ آنکھ مچولی کو کیونکر مل سکتا ہے۔ تاہم امید کا دامن تھام کر ہم جہاز پر سوار ہو گئے ...... پورا سفر تذبذب، تجسّس اور بے چینی میں گذرا۔

۱۵ جون کو اسلام آباد سے شائع ہونے والے بعض اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوئے جس میں بچوں کو ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اسلام آباد کے بچے اشتہارات شوق سے پڑھتے ہیں اور اپنی پسندیدہ دعوت پر لبیک کہتے ہوئے لپکتے ہیں۔ ۱۶ جون کو مغرب کی نماز کے بعد فیصل مسجد سے متّصل انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں بچوں اور والدین نے آنا شروع کر دیا اور رونق بڑھتے بڑھتے ایسی بڑھی کہ اس کشادہ سے آڈیٹوریم میں بیٹھنے کے لئے کوئی

ایوارڈ کسی کو بھی ملے
اسٹیج پر کچھ بھی ہوتا رہے
ہم تو پڑھیں گے
آنکھ مچولی

سیٹ باقی نہ بچی۔

سینکڑوں بچے بچیاں اور والدین بھی ہماری طرح مضطرب تھے کہ دیکھیں ایوارڈ کسے ملتا ہے ؟

خدا خدا کر کے تقریب کا آغاز ہوا۔ پروگرام کے میزبان افتخار کھوکھر تھے جو دعوۃ اکیڈمی میں بچوں کے شعبے کے انچارج ہیں۔ تلاوت کلام پاک کے بعد میزبان نے تھوڑی سی تاخیر پر سب سے معافی مانگی اور ہم سب نے انہیں ایک شان بے نیازی کے ساتھ معاف کر دیا۔

کھوکھر صاحب نے اعلان کیا کہ بچوں کے رسائل کے تمام مدیروں سے گذارش ہے کہ وہ ان نشستوں پر تشریف رکھیں۔ جو بچوں کے سامنے رکھی ہوئی ہیں تاکہ سب بچے مدیران کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ایک ایک کر کے مدیر آتے گئے اور بیٹھتے گئے۔ ایک کرسی آخر تک خالی رہی۔ یہ کرسی آنکھ مچولی کی تھی۔ مگر خالی کیوں تھی ؟؟ بہت دیر بعد پتہ چلا کہ آنکھ مچولی کے نمائندے تو تصاویر بنانے میں مگن ہیں...... جن رسائل کے نمائندے یا ایڈیٹرز تشریف لائے تھے ان میں "ماہنامہ فاختہ اسلام آباد ، بچوں کی باجی لاہور ، نونہال کراچی ، انکل سرگم ، بچوں کا رسالہ کراچی ، خزانہ کراچی ، چاند تارے لاہور ، ٹوٹ بٹوٹ کراچی ، مجاہد پشاور ، ساتھی کراچی ، ماہنامہ کوثر لاہور ، علم و عمل اسلام آباد ، ماہنامہ آنکھ مچولی اور چند دیگر رسائل بھی تھے۔ دو چار رسائل کے نمائندے کسی مجبوری کے باعث نہ آ سکے۔

تمام مدیر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے مجرم ، عدالت میں جج کے سامنے سہما رہتا ہے۔

لیک ایک مدیر کو اسٹیج پر بلایا جاتا، بچے سوال کرتے مدیر جواب دیتا، بچوں کے کئی سوالات تو ایسے خطرناک اور جارحانہ تھے کہ ہم نے کئی مدیروں کو ڈگمگاتا ہوا محسوس کیا۔ بچے چونکہ سچے سیدھے اور معصوم ہوتے ہیں اس لئے وہ بے لاگ اور صاف صاف بات کہہ دیتے ہیں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اس تقریب میں بھی ایسے ہی بچے تھے۔ انہوں نے ایڈیٹرز کی خوب خوب خبر لی۔ آنکھ مچولی کا نمبر آیا تو ایک بچے نے سوال کیا...... "انکل آپ رسالے کی قیمت کم کیوں نہیں کرتے۔ ۱۰ روپے بہت زیادہ قیمت ہے۔" اس پر آنکھ مچولی نے بچے سے ایک سوال کر ڈالا۔

...... "آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ اپنی تمام شرٹس ایک ہی قیمت میں خریدتے ہیں؟" "جی نہیں کوئی سستی کوئی مہنگی۔" بچے نے جواب دیا۔

...... "مہنگی شرٹ میں کیا خوبی ہوتی ہے"؟ آنکھ مچولی نے پھر سوال کیا

...... "یقیناً کوالٹی میں دوسری شرٹس سے بہتر ہوتی ہے"۔ بچے نے جواب دیا۔

...... "کیا آنکھ مچولی دوسروں سے بہتر نہیں ہے؟......" "وہ تو ہے" بچے نے بالآخر اعتراف کر لیا۔

سوال جواب کی نشست کے بعد دعوۃ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بچوں سے خطاب کیا اور بتایا کہ وہ وطن عزیز کے بچوں کے لئے اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کے سلسلے میں کیا

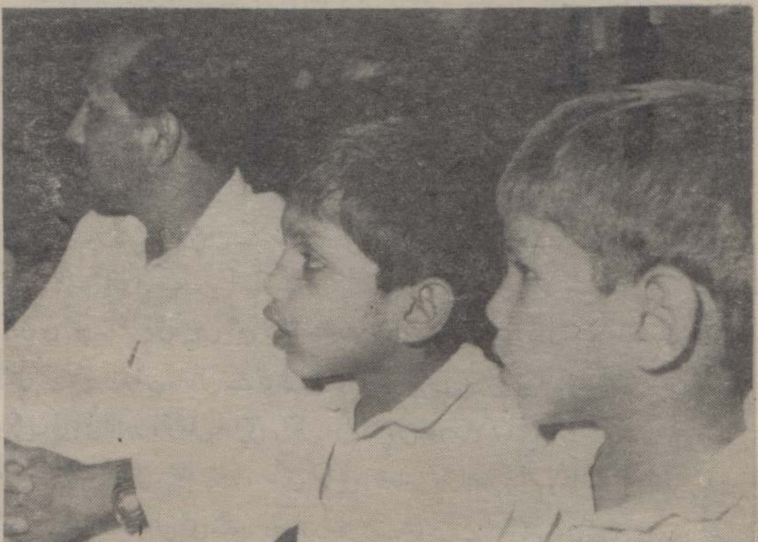

اپنے ابو کے ساتھ آئے ہوئے تقریب کے شریک دو ذہین بچے

کچھ کر رہے ہیں۔ ان کی کوششوں کو سب نے سراہا، ان کی تقریر بہت عمدہ اور پُراثر تھی۔

آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی کو بھی خطاب کی دعوت دی گئی۔ مدیر بیچارہ دھڑکتے دل کے ساتھ آیا اور اپنے دُھکڑے بیان کر گیا۔ آنکھ مچولی کا موقف تھا کہ حکومت بچوں کے رسائل کو مہنگا ہونے سے بچانے کے لئے ان رسائل کی خصوصی مدد کرے تاکہ رسائل، عام بچے کی قوت خرید سے باہر نہ ہو جائیں۔

اکادمی ادبیات کے چیئرمین جناب غلام ربانی آگرو تقریب کے مہمان خصوصی تھے انہیں تقریر بھی کرنا تھی اور ایوارڈ بھی دینا تھا۔ مگر ایوارڈ کا اعلان کرنے کے لئے تشریف لائے، ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب۔ اعلان سے قبل ہم نے اپنی نبض ٹٹولی اس کی رفتار میں اضافہ ہو چکا تھا۔ دل کی دھڑکن ٹیکسی رکشہ کے میٹر کی طرح تیز ہو چکی تھی۔ ہماری کیفیت بالکل ایسی تھی جیسے نتیجے سے پہلے اس بچے کی ہوتی ہے جسے پوری محنت اور اچھے امتحان کے باوجود یہ اندیشے ستا رہے ہوں کہ

"کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے"

انتظار کے لمحے ختم ہوئے۔ سب سے پہلے تیسرے نمبر پر آنے والے رسالے کا اعلان ہوا۔ یہ رسالہ تھا تعلیم و تربیت۔ پھر دوسرے نمبر پر آنے والے رسالے کا اعلان ہوا۔ یہ رسالہ ماہنامہ ہمدرد نونہال کراچی تھا۔ اس سے قبل کہ اوّل نمبر پر آنے والے رسالے کا اعلان ہوتا۔ پورا ہال آنکھ مچولی کی نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔

جناب غلام ربانی آگرو نے گولڈن شیلڈ آنکھ مچولی کو عطا کی اور ایک بار پھر پورا ہال تالیوں اور مبارک باد کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

آخر میں آگرو صاحب نے خطاب کیا اور رسائل کو یقین دلایا کہ وہ ان کے مسائل کو حل کریں گے مدیران رسائل کو اچھے اچھے مشورے دیئے۔ بچوں سے اور بچوں کے رسائل سے اپنی محبت کا اظہار کیا آنکھ مچولی کو مبارک باد دی کہ وہ اس مبارک باد کا مستحق تھا۔ رسائل سے اچھی امیدوں اور توقعات کا اظہار کیا اور یوں ایک خوبصورت تقریر اختتام پذیر ہوئی اس تقریر کے ساتھ ہی تقریب بھی ختم ہو گئی۔

تقریب کے بعد بچوں بڑوں اور تمام مدیران جرائد نے نمائندہ آنکھ مچولی کو مبارک باد دی۔

ایک شرارتی بچہ قریب آیا اور کان میں کہنے لگا۔

"میں نے آپ کی سفارش کر دی تھی اس لئے انعام آپ کو ملا ہے اب میری کہانی ضرور شائع کرنا ورنہ اگلی بار کسی اور کو انعام دلوا دوں گا۔"

ماھنامہ

آنکھ مچولی کو

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی

کی جانب سے پاکستان کا بہترین رسالہ قرار دیئے جانے پر ہم دل کی گہرائیوں سے

مبارک باد

پیش کرتے ہیں

خدا کرے یہ رسالہ یونہی علم کی روشنیاں بکھیرتا رہے

اور طالبانِ علم اس سے فیضیاب ہوتے رہیں

فیاض بُک ڈپو - فیصل آباد فون:- ۲۷۴۰۶ — چوہدری امانت علی اینڈ سنز - رحیم یار خان فون:- ۲۶۲۶

ایم ایم ٹریڈرز - کوئٹہ فون:- ۷۵۰۰۲ — وہاڑی نیوز ایجنسی - ریل بازار وہاڑی

ملک اینڈ سنز - سیالکوٹ فون:- ۸۷۹۸۹ — اسلم نیوز ایجنسی - اخبار گھر - گوجرانوالہ

اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷ — اشرف نیوز ایجنسی - بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ - اوکاڑہ

پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال - سرگودھا فون:- ۶۲۹۵۱ — مسلم بُک ڈپو - سرائے عالمگیر

کیپٹل نیوز ایجنسی - بہاولپور فون:- ۲۹۵۷ — سلمان برادرز - نواب شاہ فون:- ۲۴۱۴

طاہر نیوز ایجنسی - جہلم فون:- ۰۵۹۴۱ — سعید بُک اسٹال - گجرات فون:- ۰۴۳۳۱

شہیدِ وطن

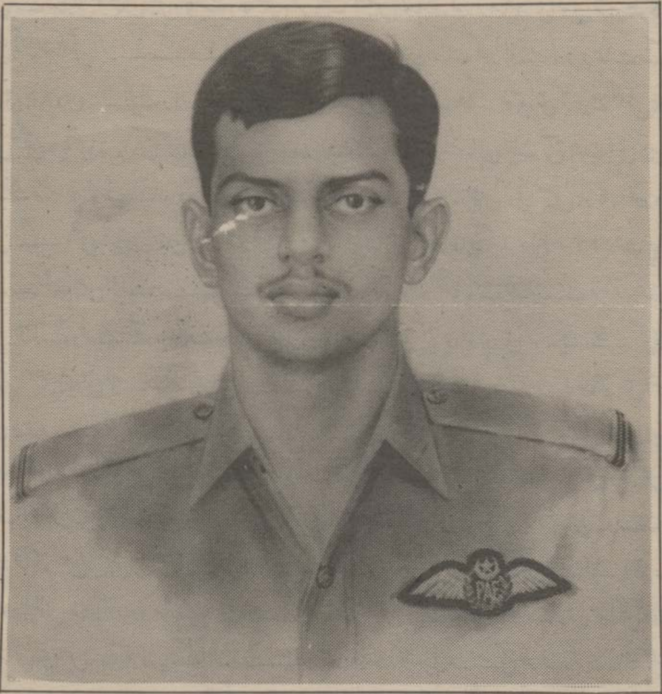

راشد منہاس بچپن ہی سے ذہین، دبلے پتلے اور پھرتیلے جسم کے مالک تھے۔ ان کا پسندیدہ کھیل شروع ہی سے ہوا میں اڑتے ہوئے جہازوں کو دیکھنا اور اس وقت تک تالیاں بجاتے رہنا تھا جب تک وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ جب انہیں کبھی اپنی امی یا ابو کے ساتھ خرید و فروخت کے لئے بازار جانے کا موقع ملتا یا پھر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے بازار کی طرف جا نکلتے تو ان کے قدم کسی ایسی دکان کے قریب جا کر خود بخود رک جاتے جہاں شوکیس میں پلاسٹک سے بنے ہوئے یا دھات سے بنے ہوئے ہوائی جہاز رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ راشد کے خالو فضائی فوج میں افسر تھے۔ جب کبھی وہ ان

کے گھر آتے تو ننھے راشد انہیں اور ان کی باوقار وردی کو بڑے غور سے دیکھتے اور ان سے جہازوں کی مختلف قسموں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ ان کے ایک رشتے کے بھائی پی۔ آئی اے میں کپتان تھے۔ وہ جب کبھی ان کے گھر آتے تو راشد ان سے اکثر جہازوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے بہت خوش ہوتے۔ انہوں نے بعد میں پائلٹ بننے کے لئے درخواست دی اور پھر انہوں نے ابتدائی امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ انہیں کوہاٹ اور رسالپور کی فوجی تربیت گاہوں میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس طرح پلاسٹک اور لوہے اور دھات کے بنے ہوئے مصنوعی جہازوں سے کھیلنے والا راشد منہاس اصلی جہازوں کو اڑانے لگا۔ ضروری تربیت مکمل ہونے پر انہیں کراچی بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کے والدین رہ رہے تھے۔ راشد منہاس ایک صبح جب اپنی تیسری پرواز کے لئے نکلے تو بہت خوش تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے ساتھ جہاز میں کوئی نہیں ہو گا۔ اور وہ اکیلے جہاز کو اڑائیں گے۔ انہی خیالوں میں گم راشد منہاس ۲۰ اگست جمعہ کے دن گیارہ بج کر ۲۶ منٹ پر اپنا جہاز ہوائی اڈے سے فضا میں اڑانے کے لئے نکلے۔ وہ آج تیسری مرتبہ تنہا پاک فضائیہ کے تربیتی جہاز ٹی۔ ۳۳ کو اڑانے والے تھے۔ ابتک وہ اپنی پانچ ماہ اور چند دنوں کی پرواز پوری کر چکے تھے۔ گیارہ بجکر چھبیس منٹ پر انہیں ہوائی اڈے کے کنٹرول ٹاور سے جہاز اڑانے کی اجازت ملی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جہاز کو رن وے پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ اچانک راشد نے اپنے استاد مطیع الرحمٰن کو جہاز کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس نے راشد کو خطرے کا اشارہ دیا۔ انہوں نے اپنے جہاز کو روک لیا۔ اتنی دیر میں مطیع الرحمٰن چھلانگ لگا کر پچھلی نشست پر چڑھ گیا۔ راشد اپنے استاد کے اس رویہ پر بڑا حیران ہوئے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آج انہیں جہاز کو اکیلے ہی اڑانا ہے۔ غدار مطیع الرحمٰن نے بیٹھتے ہی اپنے ایک ہاتھ سے جیب میں رکھا ہوا پستول نکالا اور دوسرے ہاتھ سے رومال نکالا جس میں بے ہوش کرنے والی دوا لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کے اشارے سے راشد کو جہاز کا رخ بھارت کی طرف کرنے کا حکم دیا۔ اچانک راشد نے سنا، طیارے میں زبردستی گھس آنے والے غدار اور ملک دشمن مطیع الرحمٰن نے جہاز کے وائرلیس سیٹ پر کسی کو پیغام دیا۔

"میں بھارتی ہوائی اڈے جام نگر پر اتروں گا۔ تم میرے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے کر فوراً بھارتی ہائی کمشنر کی بلڈنگ میں پناہ لے لو۔"

ان تمام باتوں نے راشد منہاس کے دماغ میں بے شمار شکوک کو جنم دیا۔ ان کے ذہن میں یقیناً اس وقت وہ الفاظ گونج رہے ہوں گے جو انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد اپنی ڈائری میں لکھے تھے۔ "موت یا زندگی۔ انسان فانی ہے۔ موت ایک ہی وقت آتی ہے۔ لیکن بہترین موت وہ

ہے جو ملک کی خاطر آتی ہے۔"

انہوں نے کنٹرول روم کو حالات سے آگاہ کرنے کے لئے پیغام دیا۔ "مجھے اغوا کیا جارہا ہے۔" ایک طرف وہ جہاز کو غدار وطن سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دوسری طرف ان کے بھائی بہن اور ماں باپ اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ ان کا بیٹا آج تنہا تیسری پرواز پر روانہ ہو چکا ہو گا۔ آج اس کے ساتھ جہاز میں اور دوسرا کوئی نہیں ہو گا۔ جب راشد جہاز کے نظام پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے اور بھارت کی سرحد پاکستانی علاقے سے صرف ۳۲ میل دور رہ گئی تو راشد نے اپنی زندگی کا آخری فیصلہ کیا۔ وہ جہاز کو زمین سے بلندی پر لے جانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے غلامی کی زندگی سے آزادی کی موت کو سینے سے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ راشد نے جہاز کی ایک کل کو دبایا اور جہاز تیزی سے زمین کی طرف جانے لگا۔ غدار مطیع الرحمٰن ان کی کوشش ناکام بنانے کے لئے پوری طاقت صرف کرنے لگا۔ پھر چند سیکنڈ کے اندر اندر جہاز زمین سے ٹکرا گیا۔ ان کے طیارے کے حادثہ کی خبر شام کے وقت ملی۔ جہاز کے عملے سے فضائیہ نے دو لاشیں تلاش کر کے قبضہ میں لے لیں۔ خدا کی قدرت ہے کہ راشد شہید کی لاش کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی جب کہ غدار مطیع الرحمٰن کی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی تھی۔ راشد جہاں شہید ہوئے تھے وہاں ان کی یادگار قائم کی گئی۔ یہ جگہ کراچی سے ۶۲ میل دور شمال مشرق میں جند نام گاؤں ہے۔ مقامی لوگوں نے جگہ کا نام شہید ڈیرو رکھ دیا تھا، جس کا مطلب ہے شہادت گاہ۔

کیا آپ کو
مصوّری
سے دلچسپی ہے

تو پھر آیئے آپ کا امتحان ہو جائے

اکتوبر کے شمارے کیلئے مقابلۂ مصوّری کا موضوع ہے

اگرچہ خاک تک اس ملک کی سُرمہ ہے آنکھوں کا — مجھے لیکن وطن کی یہ ادا بے حد پسند آئی

- وطن کی وہ کون سی ادا ہے جس نے آپ کو بے حد متاثر کیا
- اپنا وطن کس زاویے سے آپ کو زیادہ اچھا لگا۔
- اس کے مناظر، اس کے کھیل، اس کی صنعتیں، پہاڑ، دریا، جھرنے، شخصیات یا کچھ اور
- آپ تصویر کے لئے ایسے کاغذ کا انتخاب کیجئے جس پر سیاہی یا رنگ پھیلنے کا اندیشہ نہ ہو
- تصویر کا سائز ۴ اینچ × ۷ اینچ ہونا چاہیئے۔ تصویر کی پشت پر اپنا نام پتا ضرور لکھیں
- مقابلہ میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ۵ ستمبر ۱۹۹۰ء ہے
- تین بہترین تصاویر کو بذریعہ قرعہ اندازی خوبصورت انعامات بھجوائے جائیں گے

مقابلۂ مصوّری — ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی۔ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

پاکستان نے مجھے کیا دیا
میں نے پاکستان کو کیا دیا

سروے: م. الف. راشد

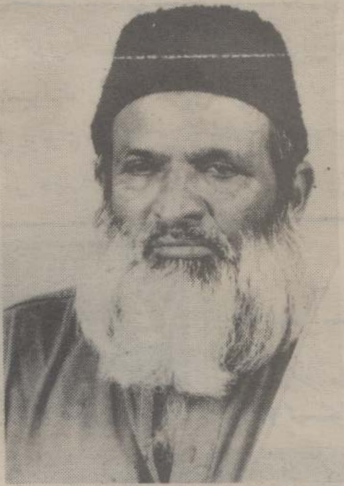

پاکستان تو

ہمارا محسن ہے۔

عبدالستار ایدھی

جب پاکستان بنا تو میں نے والد صاحب سے کہا کہ ہمیں پاکستان چلنا چاہئے جہاں ہم اسلام اور انسانیت کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ پاکستان کے حصول کا مقصد ہی یہ تھا۔ لہٰذا ہم لوگ یہاں آئے اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ رہا سوال یہ کہ پاکستان نے مجھے کیا دیا۔ تو میں تو کہوں گا کہ...... آج جو کچھ میں ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے سب کچھ پاکستان ہی کا دیا ہوا ہے۔ پاکستان تو ہمارا محسن ہے۔

میرزا ادیب (بچوں کے محبوب ادیب)

اگر مجھ سے سوال کیا جاتا کہ پاکستان نے تمہیں کیا دیا ہے تو میرا جواب قریب قریب وہی ہوتا جواب اس سوال کی صورت میں ہے کہ پاکستان نے ہمیں کیا دیا ہے۔

اس سوال کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمیں آزادی کا احساس ہوا ہے جو اس دنیا میں دنیا پیدا کرنے والے کی طرف سے سب سے بڑی نعمت ہے۔

علامہ اقبال آزادی کی تعریف اپنے اس خوبصورت اور بلیغ شعر میں یوں کرتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

پاکستان دنیا کے نقشے پر نہیں ابھرتا تو ہم غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے۔ غلامی میں ہم اس طرح اپنے شب و روز نہیں گذار سکتے تھے۔ جس طرح ہم چاہتے تھے۔ بلکہ اس انداز سے گزارتے جس طرح ہمارے بدیسی حکمران چاہتے تھے۔ یہ فرق جو آزادی اور غلامی میں ہے ایک ایسا فرق ہے جس کا صحیح احساس غلامی کے دنوں میں نہیں، آزادی کے ماحول میں ہوتا ہے۔ غلامی میں تو انسان جانوروں کی طرح رہتا ہے حکم کا بندہ ہوتا ہے۔ اور آزادی میں وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہوتا ہے غلامی میں اس کی تقدیر اس کا حکمران بناتا ہے اور آزادی میں وہ اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔

غلامی کے دور میں ہمارا اپنا کچھ نہیں ہوتا یہاں تک کہ جسموں کے اندر روح بھی منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے زندگی کی حقیقی حرارت، گرمی اور تابناکی چھن گئی تھی اور آزادی کا سورج قوم کے بلند افق پر طلوع ہوا تو ہر طرف روشن، حرارت اور نور کی ندیاں رواں دواں ہو گئیں۔ اس روشنی حرارت اور نور میں ہماری روح نے حیات نو پائی اس کا ذرہ ذرہ متحرک ہو گیا۔

پاکستان جب تک محض خواب تھا ہمارے ذہنوں پر ایک انتشار کی کیفیت چھائی رہی تھی۔ وہ چیز جسے تنظیم کہتے ہیں اور جو فرد اور ملت کے لئے۔ بے حد ضروری ہے، ہماری انفرادی اور ملی زندگی سے یکسر غائب تھی۔ تنظیم نہ ہو تو افراد اور ہر قوم زندگی کی اعلیٰ اقدار کے حصول میں سرگرم عمل ہونے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے برعکس تنظیم میں انسان، دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں ایک ساتھ آگے ہی آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ غلامی منتشر کرتی ہے اور آزادی منظم۔

قیام پاکستان کا واضح مطلب یہ تھا کہ ہم زندگی کے ہر ہر معاملے میں ذہنی آزادی کے ساتھ حصہ لیں، اپنے ماضی کی شاندار روایتوں سے اپنے دل گرمائیں، جوش وولولہ کی جس گراں قدر متاع سے محروم چلے آرہے ہیں۔ اس کی نمود سے سینوں میں سوئے ہوئے جذبوں کو جگائیں اور ہمیشہ بلندیوں پر نظر رکھ کر زندگی کا سفر کریں۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان نے ہمیں غلامی کے اندھیروں سے نکال کر آزادی کی روشنیوں میں کھڑا کر دیا۔ آزادی نے ہمیں یقین محکم دیا کہ اب ہم اپنی سوچ میں اور اپنے عمل میں آزاد ہیں جو چاہیں، جس طرح چاہیں سوچ سکتے ہیں، جو چاہیں، جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں۔

کیا اس طرح پاکستان نے ہمیں وہ کچھ نہیں دے دیا جو زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر، جو زندگی کی سب سے بڑی نعمت اور دنیا کی سب سے قیمتی متاع ہے؟

شکیل (اداکار)

میں نے پاکستان کو کچھ نہیں دیا، پاکستان نے مجھے سب کچھ دیا۔ اگر میں پاکستان میں نہ ہوتا، تو میں اس مقام پر نہ ہوتا، میری شہرت، میری شناخت اور میری تمام کامیابی پاکستان کے حوالے سے ہی ہے۔

ہمارا تو ایمان ہے کہ پاکستان کو ہم نے نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بنایا تھا۔

نصراللہ خان (بزرگ کالم نگار)

○ ...... ہم نے پاکستان کو لیا اور اب اسے اپنی جاگیر بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ باقی رہا پاکستان کو

کچھ دینے کا سوال تو جب تک ہم پاکستان سے کچھ وصول نہیں کر سکتے تو دے کیا سکیں گے۔ ہماری نسل پاکستان سے لے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اگلی نسل اسے کچھ دے بھی سکے کیونکہ اس وقت تک خاصا مال جمع ہو چکا ہو گا۔ غرض کے پاکستان ہم نے لینے کے لئے بنایا تھا اور اپنی طرف سے اسے کچھ دینے کے لئے نہیں بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے ہم یہ نعرہ لگاتے تھے کہ "لے رہیں گے پاکستان"۔

اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں جاگیرداروں اور وڈیروں اور ڈاکوؤں کی حکومت ہے اس لئے ہماری حیثیت ان کے ہاریوں کی ہو چکی ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس اب دینے کے لئے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے ڈاکوؤں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا بکاؤ مال بن چکے ہیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ پاکستان ہم نے نہیں بنایا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بنایا تھا۔ اور اس کے نیک بندے ہونے کی حیثیت سے ہم اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے وہ جانے اور اس کا پاکستان جانے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

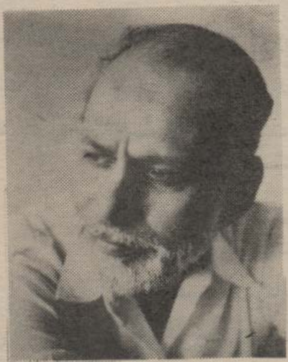

پاکستان کا جو حق ہمارے اوپر ہے
وہ تو دراصل ہم ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں

ابن الحسن (بزرگ صحافی)

اس سوال کا جواب دینے میں ذرا سی جھجک ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی قدر بڑے بولے پن کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کا جو حق ہمارے اوپر ہے وہ تو دراصل ہم ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں اور اگر کچھ تھوڑا بہت ہم نے پاکستان کے لئے کیا بھی ہے تو وہ اس خیال سے تو یقیناً نہیں کیا ہے کہ ہم پاکستان کی کوئی خدمت کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ ہم نے دراصل اپنی ہی زندگی کی آسانی اور سہولت، فائدے اور ترقی کے لئے کیا ہے۔ مثلاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بالعموم کوئی ایسی بدعنوانی مجھ سے سرزد نہیں ہوئی جس سے پاکستان کو کوئی نقصان پہنچتا تو اس سے دراصل مجھے ہی فائدہ پہنچا

ہے کہ میرا دامن کسی قابل گرفت بُرائی سے پاک رہا اور میں بدنام شخصیات میں شامل نہیں ہوا ہوں یا اگر میں نے ایک تربیت یافتہ زندگی گذاری ہے اور امن پسند شہری کی طرح رہا ہوں یا قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی تو یہ سب اپنی ہی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیا ہے اور اپنے ہی حالات کو پرامن اور صاف ستھرا رکھنے کے لئے کیا ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو اگر اچھی تربیت دی ہے اور بہتر تعلیمی سہولتیں فراہم کی ہیں تو اس کا سراسر فائدہ مجھ ہی کو پہنچا ہے۔ یہ اور بات کہ اس سے پاکستان کو بھی کچھ نہ کچھ عافیت حاصل ہوئی ہے اور اگر دیکھا جائے تو ہر پرامن شہری کی زندگی دراصل پاکستان کی امن و آشتی کی فضا مستحکم بناتی ہے۔

پاکستان نے پچھلے بیالیس برس میں کافی نقصان اٹھایا ہے تو یہ پاکستان میں رہنے والے اور خود کو پاکستانی کہنے والے لوگوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔

پاکستان نے اس عرصے میں بہت کچھ ترقی بھی کی ہے۔ نئے تعلیمی ادارے کھلے ہیں۔ دوسرے اور بہت سے ترقیاتی کام ہوئے ہیں۔ یہ سب بھی پاکستانی قوم کی ہی کوششوں کے نتیجے میں ہوا ہے۔ میرا بھی اس میں کچھ تھوڑا بہت حصہ ضرور ہو گا۔ بُرائی میں بھی اور اچھائی میں بھی۔ جہاں پاکستان کو نقصان پہنچا وہاں بہت ساری کوتاہیوں میں میری کوتاہی کو بھی دخل ہوگا۔ جہاں پاکستان کو فائدہ پہنچا ہے۔ وہاں کچھ نہ کچھ میری طرف سے بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش ہوئی ہوگی۔ بس یہی حساب کتاب اگر لگایا جائے تو اس میں سے یہ تصویر ابھر سکے گی کہ میں نے پاکستان کے لئے واقعی ان بیالیس برسوں میں کچھ کیا ہے یا نہیں۔

میجر صولت رضا (مزاح نگار)

پاکستان نے ہمیں عزت، وقار، پہچان اور حوصلہ دیا۔ اور ہم نے پاکستان کے لئے خون تو کیا پسینہ بھی نہیں بہایا۔ جو کچھ پسینہ بہا بھی تو لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے۔ فی الحال تو ہم پاکستان سے شرمندہ ہیں۔

پاکستان کا مطلب کیا ....؟؟

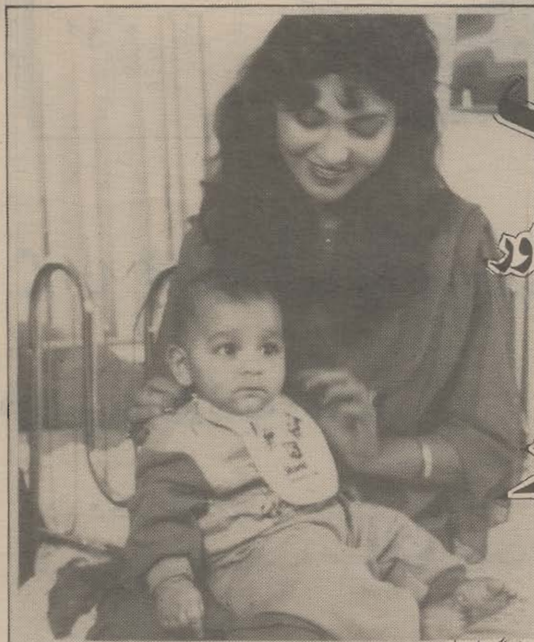

مفت

پینٹی اور بب

شیلڈ

ایون فلو فیڈر کے ساتھ

شیلڈ ایون فلو فیڈر جو سو فیصد فوڈ گریڈ پولی کاربونیٹ سے تیار کیا جاتا ہے پانی میں اُبالا جا سکتا ہے اور مضر کیمیاوی اثرات سے پاک ہے۔

یہ اپنی مخصوص و منفرد ساخت کی وجہ سے دودھ کی با سہولت روانی برقرار رکھتا ہے تاکہ بچہ کو پینے میں سہولت ہو اور فیڈر کی صفائی مکمل طور پر ہو سکے۔

سمجھدار ماؤں کا انتخاب اب تحفہ کے ساتھ

آنکھ مچولی کو بہترین رسالے کا ایوارڈ ملنے پر

ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ

دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور
نئی نسل اس کے ذریعہ علم کے گوہر نایاب سمیٹتی رہے

☆ محمد حسین برادرز — کراچی — فون: ۲۳۹۵۵

☆ سلطان نیوز ایجنسی — لاہور — فون: ۵۸۲۴۹

☆ ملک تاج محمد نیوز ایجنٹ — راولپنڈی — فون: ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶

☆ افضل نیوز — پشاور سٹی — فون: ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱

☆ مہران نیوز ایجنسی — حیدرآباد — فون: ۲۰۱۲۸

قالین کی صفائی میں سب سے اعلیٰ

ٹپ ٹاپ

ڈرائی کلینرز

فون: ۴۱۴۴۶۴

۴۳۳، ۱۴۳

علامہ اقبال روڈ

پی ای سی ایچ ایس

حسن اپارٹمنٹس

۴۴۰،۴۰

ڈیفنس سوسائٹی

۵۴۲۱۶۳

کلفٹن

۵۳۰۳۶۹

ناظم آباد

۶۱۳۸۱۶

Del Monte
Quality
Island Blends
Pine-Orange
Pine-Grapefruit
Pine-Guava
Pine-Banana
Savor the flavors!

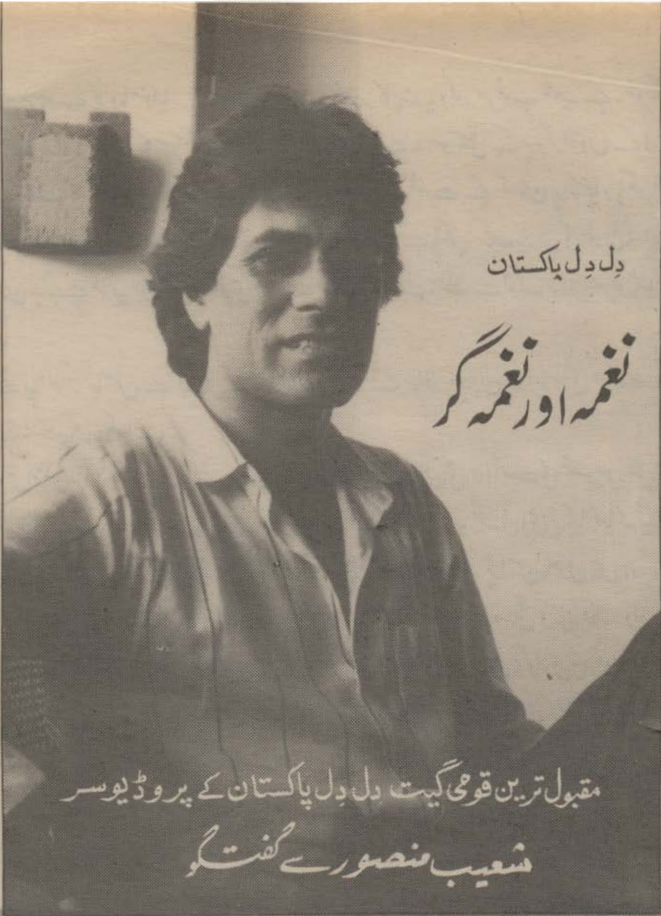

دِل دِل پاکستان

نغمہ اور نغمہ گر

مقبول ترین قومی گیت، دل دِل پاکستان کے پروڈیوسر

شعیب منصور سے گفتگو

گفتگو۔ سلیم مغل

شعیب منصور کا شمار پاکستان ٹیلی ویژن کے ان چند گنے چُنے پروڈیوسروں میں ہوتا ہے جنہیں اگر ٹی وی سے علیحدہ کر لیا جائے تو ٹی وی والوں کے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ اور نہیں رہ جاتا۔ وہ لوگ جو ٹی وی پروگرام غور سے دیکھتے ہیں یا وہ لوگ جو پروگرام کو تکنیکی حوالوں سے اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ شعیب منصور کی صلاحیتوں سے بھی یقیناً آگاہ ہوں گے۔ ففٹی ففٹی، جھرنے، ان کہی، سلور جوبلی، پی ٹی وی ایوارڈ اور دیگر لاتعداد پروگرام ایسے ہیں جنہیں شعیب منصور نے سوچا تیار کیا اور کروڑوں ناظرین کو دکھا کر اپنے

بہترین پروڈیوسر ہونے کا لوہا منوایا...... موسیقی شعیب منصور کا پسندیدہ اور مرغوب شعبہ ہے۔ موسیقی کے پروگراموں کو نئی راہ دکھانے کا سہرا بھی شعیب ہی کے سر جاتا ہے۔ موسیقی کے پروگراموں کے ذریعہ کئی گمنام لوگوں کو ملک کا مشہور گلوکار بنا دیا۔ کتنے پوشیدہ ناموں کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا مگر خود بیچارے پروڈیوسر کے پروڈیوسر ہی رہے۔ پروڈیوسر بھی بڑی عجیب چیز ہوتا ہے بالکل سنگِ پارس کی طرح، جو اسے چھو لے وہ سونا بن جاتا ہے مگر یہ خود پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے، غالباً اس لئے بہت سے لوگ پروڈیوسر کو چھوتے نظر آتے ہیں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے شعیب منصور کے ساتھ معاون پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھا ہے۔

خوش مزاج اور خوش گفتار شعیب منصور نے پاکستان ٹیلی ویژن کی ۱۴ اگست کی خصوصی نشریات کے لئے ایک نغمہ تیار کیا تھا۔ "دل دل پاکستان، جان جان پاکستان" ...... یہ نغمہ ٹی وی پر کیا آیا کہ ایک ہنگامہ شروع ہو گیا...... ہنگامے سے مراد صرف لڑائی جھگڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہنگامہ پُرامن ماحول میں ہونے والے شور و غوغا کو بھی کہتے ہیں سو نغمے کے نشر ہوتے ہی اسی طرح کا شور ہر طرف سنائی دینے لگا۔ داد و تحسین، مبارکباد اور نغمے کو پسند کئے جانے کی آوازیں آنے لگیں انہی آوازوں میں ناگواری کی آوازیں اور تنقید کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اور کئی سمتوں سے اعتراضات کا طوفان بھی کھڑا ہوا، اعتراض یہی تھا کہ یوم آزادی پر جین پہنے ہوئے اور گٹار بجاتے ہوئے لڑکوں کی ٹولی پاکستان کا نغمہ گا رہی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بغاوت ہے اقدار سے اور سرکشی ہے قومی روایات سے اور بھی نہ جانے کیا کیا...... ماہنامہ آنکھ مچولی کا دل دل پاکستان نمبر نکالنے کا خیال آیا تو بے اختیار اس نغمے کے حوالے سے شعیب منصور بھی یاد آئے میں نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر اس نغمے کی بابت کچھ گفتگو شعیب منصور سے ہو جائے۔ میں نے شعیب سے ملنے کا ارادہ کیا اور چند دنوں میں میں اسلام آباد ٹی وی اسٹیشن پر شعیب منصور کے سامنے بیٹھا تھا۔ کہنے کو بہت سی باتیں اور پوچھنے کو بہت سے سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے مگر میں اپنی گفتگو کو اسی نغمے تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ سلام دعا، حال چال، خیر خیریت اور بہت سے گِلوں شکووں کے بعد جب اصل موضوع پر گفتگو کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس نغمے کے بارے میں چند معلومات حاصل کرنا چاہیں۔

☆ میرا پہلا سوال تھا...... "میں نے سنا ہے اس نغمے کے اصل محرک تو نثار ناسک صاحب ہیں مگر نغمے کی ریکارڈنگ ہوتے ہوتے یہ نغمہ ان کا نہیں رہا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

○ "کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"؟ شعیب منصور نے حیرت، تجسس اور قدرے تشویش سے پوچھا۔

کیا شلوار قمیض پہننے والے پاکستان سے زیادہ محبّت کرتے ہیں "شعیب"

☆ "ہم نے سنا ہے کہ یہ نغمہ بعد میں لکھا گیا ہے اور دھن پہلے بنی۔ چونکہ ناسک صاحب کو دھن پر لکھنے کا تجربہ نہیں تھا اس لئے وہ ٹھیک طرح سے نہیں لکھ پا رہے تھے۔ لہٰذا مجبوراً آپ نے ان کے اشعار کو تبدیل کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے یہ نغمہ آپ ہی کا ہو کر رہ گیا۔ کیا یہ بات درست نہیں...... "؟

○ میرے اس سوال کے جواب میں شعیب منصور نے تھوڑا سا توقف کیا ان کے سوچنے کے انداز سے ایسا لگا جیسے وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ "تمہیں اس بات کا کس طرح پتہ چل گیا......؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ کو کسی نے غلط بتایا ہو گا۔ ہم نے اگر کوئی تبدیلی کی بھی ہے تو برائے نام کی ہوگی۔ بنیادی طور پر تو اس کے شاعر ناسک صاحب ہی ہیں۔"

☆ شعیب منصور کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ یہی جواب دیتے لیکن اس جواب سے میرا اطمینان نہیں ہوا تاہم میں نے گفتگو کا رخ تبدیل کرنے کی خاطر پوچھا کہ ان لڑکوں کا تو تعارف کروائیں جنھوں نے یہ نغمہ گایا۔

○ ان کے نام جنید، جمشید، روحیل حیات، شہزاد حسن اور نصرت حسین ہیں۔ ان کا اپنا گروپ ہے جو وائٹل گروپ کہلاتا ہے۔

☆ کیا اچھا نہ ہوتا اگر یہی نغمہ عالمگیر، شہکی، سجاد یا کوئی اور گاتا۔؟

○ نہیں...... آپ کی رائے سے میں متفق نہیں۔ نغمے کے لئے صرف آواز ہی تو ضروری نہیں ہوتی۔ نئے چہرے، نیا اسٹائل بھی بسا اوقات نغمے کو خوبصورت بناتا ہے۔ اور پھر کب تک ایک سے چہروں کو بار بار دکھایا جاتا رہے گا۔ آخر نئے ٹیلنٹس بھی تو متعارف کروانے ہیں یا نہیں۔؟

☆ "شعیب بھائی آپ نے نئے چہرے تو متعارف کروا دیئے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نغمے پر پسندیدگی کے اظہار کے باوجود اعتراض بہت ہوا ہوگا۔ ؟

○ ہاں اعتراض تو ہوا، باہر کے اعتراض کو چھوڑیئے خود ٹی وی والے بھی اسے On air دیتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ بلکہ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ پہلے ہم اس نغمے کی جو استائی دے رہے تھے وہ "دل دل پاکستان" نہیں تھی بلکہ وہ We Love Pakistan تھی آپ اسی دھن پر We Love Pakistan گا کر دیکھیں آپ کو موزوں بھی لگے گا اور اچھا بھی۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں اس انگریزی جملے کی وجہ سے بندش ہی نہ لگ جائے ہم نے اسے حذف کر کے دل دل پاکستان ڈال دیا۔

☆ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس نغمے پر اعتراض کیا تھا اور اعتراض میں کتنا وزن تھا۔ ؟

○ شعیب نے میری بات کو تحمل سے سنا مگر قدرے بھناتے ہوئے جواب دیا، "اعتراض کی نوعیت تو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہی کہ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے لڑکوں کی ٹولی گا رہی ہے ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا شلوار قمیض پہننے والے پاکستان سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ؟ یا پتلون پہن کر پاکستان سے ہماری محبت میں کمی آجاتی ہے؟ یہی تو ہمارا مسئلہ ہے ہماری پوری قوم کا یہی مسئلہ ہے۔ ہم اپنے بچوں کو خود انگریزی اسکولوں میں داخلہ دلواتے ہیں، ان کے لئے جین کی پینٹ اور بیرونی کپڑے خرید کر لاتے ہیں ان کے منہ سے انگریزی سن کر خوش ہوتے ہیں مگر جب یہی بچے ٹی وی پر آکر پاکستان کی بات کرتے ہیں تو بُرے لگتے ہیں۔ کیوں آخر۔ ؟انہیں یہ ٹریل (موٹر سائیکل) ہم ہی نے خرید کر دی ہیں، یہ ہماری خواہش کے ساتھ ہی ایسے بنے ہیں اب اگر یہی لڑکے پاکستان کی بات کرتے ہیں تو سب کو بُرا لگتا ہے کیا پاکستانی صرف وہی ہیں جو سرکاری اسکولوں میں مفت پڑھتے ہیں، انگریزی اسکولوں میں پڑھنے والے بچے پاکستانی نہیں ہیں۔ ؟ اپنے اندر سے وہ بھی اتنے ہی پاکستانی ہیں۔"

☆ شعیب منصور کے لہجے میں شدت آگئی اور گفتگو طوالت پکڑنے لگی تو میں نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

"تو کیا واقعی آپ کو بہت خوشی ہوئی یہ نغمہ پروڈیوس کر کے؟"

○ "ہاں مجھے بہت خوشی ہوئی۔" شعیب منصور نے اپنے آپ کو Cool down کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ خاص طور پر اس نغمے کو بچوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ میری ۲ سال کی بچی بھی اس نغمے کو گنگنانے کی کوشش کرتی ہے...... اپنی آنے والی نسل اور ان ننھے ننھے بچوں کے زبان پر دل دل پاکستان سنتے ہیں تو خوشی بھی ہوتی ہے اور پاکستان سے ان کے بہتر تعلق کی امید بھی بندھتی ہے۔

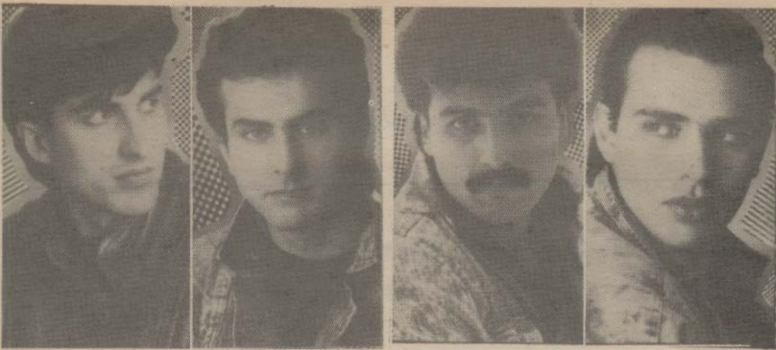

شعیب منصور کی دریافت دل دل پاکستان کے چار باصلاحیت فنکار

☆ آپ کو اس نغمے پر پہلا انعام ملا۔ اس سے قبل بھی ایک نغمہ پیش کرنے پر آپ کو پہلا انعام مل چکا ہے۔ اس نغمے کی تیاری میں آپ کے ساتھ معاون پروڈیوسر میں ہی تھا۔ آپ کو یاد ہو گا بینجمن سسٹرز کے گائے ہوئے اس نغمے کے لئے موم بتیاں اور پھول میں لے کر آیا تھا۔ ان سب چیزوں کے ۱۶ روپے ابھی تک آپ کی طرف باقی ہیں۔ کچھ یاد ہے آپ کو؟

○ میری اس بات پر شعیب منصور نے بڑا زور دار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے ...... کیا واقعی باقی ہیں۔؟

☆ ہاں باقی تو ہیں لیکن چلیں چھوڑیں آپ کیا یاد کریں گے۔ شعیب منصور سے اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتے ہوئے پھر اس نغمے کا ذکر چل نکلا تو شعیب منصور نے بتایا کہ "جب یہ نغمہ گایا جا رہا تھا اس وقت ٹی وی اسٹیشن کا آڈیو تھیٹر (وہ جگہ جہاں نغمہ یا (صرف آواز) گایا اور ریکارڈ کیا جاتا ہے) نہیں بنا تھا۔ اس لئے گلوکاروں نے یہ نغمہ باتھ روم میں کھڑے ہو کر گایا تھا۔

واہ!! میں نے بے اختیار کہا ...... باتھ روم میں کھڑے ہو کر اتنا اچھا نغمہ گایا جا سکتا ہے تو باورچی خانے میں گائے جانے والے نغمے کی تو بات ہی کچھ اور ہو گی ...... اس پر چاروں جانب سے قہقہے گونجے اور قہقہوں کی آوازوں میں ہماری آوازیں آہستہ آہستہ Fade out ہو گئیں۔

یہ فیصلہ ہے .... کو سجا کے دم لیں گے

شیر میسور نے کہا

شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے

اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں   سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

میری پہلی تحریر

آپ کچھ لکھنا چاہتے ہیں
آپ کی خواہش ہے کہ آپ کی کوئی تحریر شائع ہو
آپ مستقبل کے بڑے ادیب بننا چاہتے ہیں

تو پھر دیر کس بات کی

اپنی پہلی تحریر آج ہی ہمیں بھجوا دیجئے۔
آنکھ مچولی کے صفحات آپ کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے حاضر ہیں۔

خیال رہے

* "میری پہلی تحریر" کے مستقل سلسلے میں صرف وہی قلمکار شریک ہوسکتے ہیں جن کی کوئی تحریر آج تک شائع نہ ہوئی ہو۔ (آنکھ مچولی یا کسی اور رسالے میں)
* پہلی تحریر شائع ہوجانے کے بعد دوسری تحریر اس عنوان کے تحت شائع نہ ہوسکے گی۔
* تحریر مختصر، صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک جانب لکھی گئی ہو۔ اپنی نگارش کے اختتام پر نام پتہ ضرور لکھیں۔
* لکھنے کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں، بس اختصار اور دلچسپی شرط ہے۔
* تحریر بھجوانے سے قبل کسی بڑے استاد یا بڑے لکھنے والے سے اصلاح لے لینا بہتر ہوگا
* "میری پہلی تحریر" کا دلچسپ سلسلہ اکتوبر ۹۰ء سے شروع ہو رہا ہے۔ پہلی فرصت میں اپنی تحریر بھجوا دیجئے۔

"میری پہلی تحریر" ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۱۱ ڈی ۔ سائٹ کراچی

میں تو ماتا بھاگ آیا

کیا بتاؤں تجھ کو حالت جنگ کے میدان کی
فکر ہر اک کو لگی تھی اپنی اپنی جان کی
میرا پیچھا کر رہی تھی فوج پاکستان کی
میں تھا کب واقف لڑائی کے انوکھے ڈھنگ سے
اس لئے میں بھاگ آیا ہوں محاذِ جنگ سے

ان کا لشکر تھا کہ کوئی لشکرِ جرار تھا
مورچہ ہر ایک اُنکا چین کی دیوار تھا
ہر سپاہی لڑنے مرنے کے لئے تیار تھا
اُن سے لڑنا اصل میں سر پھوڑنا تھا سنگ سے
میں تو ماتا بھاگ آیا ہوں محاذ جنگ سے

پھر نہ لوں گا بھول کر بھی جنگ پر جانے کا نام
یہ کسی صورت نہیں ہے اب ہمارے بس کا کام
بیٹھ کر آرام سے گھر میں کروں گا رام رام
ایشور[1] محفوظ رکھے دشمنوں کے ہنگ[2] سے
اس لئے میں بھاگ آیا ہوں محاذ جنگ سے

مسعود انور شفقی

مرسلہ۔ غلام عباس طاہر (جھنگ)

محاذ جنگ سے بھاگ جانے والے بھارتی فوجی کی فریاد

۱۔ خدا
۲۔ قوت

دِل دِل پاکستان

عامر یونس

ایسی زمیں اور آسماں ان کے سوا جانا کہاں
بڑھتی رہے یہ روشنی چلتا رہے یہ کارواں
دل دل پاکستان
جان جان پاکستان

شہزاد ساتھ ساتھ گا رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے آنسو رواں تھے اور جسم خود بخود گانے کی دھن

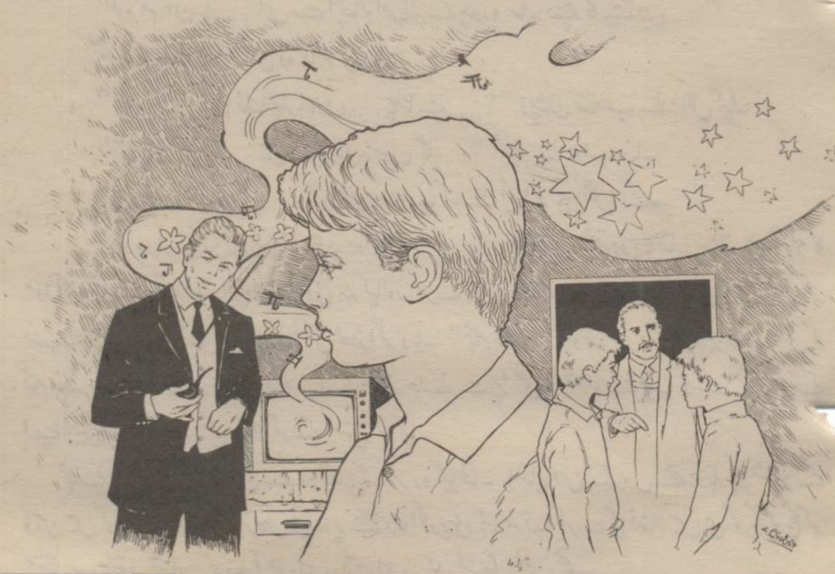

پر جھوم رہا تھا۔

"ارے ...... شہزاد...... یہ کیا ہو رہا ہے ......" ذیشان صاحب کی آواز نے شہزاد کو جیسے سوتے سے جگا دیا۔ وہ خاموش ہو گیا اور آنسو پونچھنے لگا۔

"ہاؤ کم یو آر واچنگ پی ٹی وی ......" (یہ تم پی ٹی وی کس طرح دیکھ رہے ہو آج ......) ذیشان صاحب نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ ڈیڈی ...... اردو میں بات کریں ...... میں انگلش میں بول بول کر تھک جاتا ہوں...... کم از کم آپ تو اردو میں بول لیا کریں...... "شہزاد نے کہا۔

او کے بوائے...... ! اوہ آئی مین ٹھیک ہے...... تم نے بتایا نہیں آج مووی نہیں لائے......" ذیشان صاحب نے اردو میں کہا۔

"دیکھا کتنا اچھا لگ رہا ہے...... آپ کو اردو میں ہی بولنا چاہئے...... خیر...... مووی تو میں لے آیا تھا ٹی وی آن کیا تو یہ میوزک کا پروگرام آرہا تھا...... اور ڈیڈی...... یہ گانا...... یہ زبردست گانا ہے...... بلکہ گانا نہیں یہ تو ترانہ ہے...... قومی ترانہ...... میں نے جیسے ہی سنا تو بس سنتا ہی رہ گیا...... آپ بھی سنیں...... شہزاد نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ذیشان صاحب چند لمحے گانا سنتے رہے پھر بُرا منہ بنا کر بولے،

"اوہ کم آن یار...... اس سے اچھا تو امریکہ کے پندرہ سالہ بچے گا لیتے ہیں......"

شہزاد کو بہت بُرا لگا لیکن وہ خاموش رہا۔

"خیر...... میں جیم خانہ جارہا ہوں...... چلنا ہے......؟" ذیشان صاحب نے سوال کیا۔

"نہیں...... ڈیڈ...... میں گھر پر ہی رہوں گا......" شہزاد نے جواب دیا۔

"اوکے...... ایز یو وِش......" ذیشان صاحب کندھے اُچکا کر باہر نکل گئے۔

شہزاد دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا لیکن وائٹل سائنز کا گانا اب ختم ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی شہزاد کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور کمرے میں رکھے ہوئے فرج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔ پانی نے اس کا دماغ بھی ٹھنڈا کر دیا۔ "جیم خانہ...... ہونہہ......" شہزاد بڑبڑایا۔ اس کو جیم خانہ جانے اور وہ بھی ذیشان صاحب کے ساتھ جانے سے چڑ تھی۔ شہزاد نے ایک کیسٹ منتخب کر کے اپنے اسٹیریو میں لگایا اور ہلکی آواز کر کے بستر پر گر گیا۔

نجانے کیوں اس کے ذہن سے وہ گانا چپک کر رہ گیا تھا۔ یا شاید اس کے بول تھے جو بار بار شہزاد کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ بہر حال ڈیک پر بجنے والا انگریزی گانا صرف کمرے کی فضاء میں ہی گونج گونج کر منتشر ہو رہا تھا، شہزاد کے دماغ میں اس وقت اس کے لئے جگہ نہیں تھی۔

نجانے کتنی دیر وہ یونہی لیٹا رہا......

...... ○ ......

"ہے تنویر......" شہزاد نے آواز لگائی۔ دور جاتا ہوا تنویر رک گیا۔

"یار وہ کل ٹی وی دیکھا تھا......؟" شہزاد نے پوچھا۔

"وہاٹ...... آر یو کریزی...... یار اپنے ٹی وی پر کیا آتا ہے......" تنویر نے جواب دیا۔

"بتانا یار...... کل شام ساڑھے سات بجے ایک گانا آیا تھا...... دیکھا تھا......" شہزاد نے پوچھا۔

"نہیں یار...... بتایا نا میں پی ٹی وی دیکھتا ہی نہیں...... سب بکواس پروگرام آتے ہیں...... ڈرامے فلسفے کی کلاس ہوتے ہیں، گانے میرے دادا کے زمانے کے، انگلش مووی دکھاتے ہی نہیں۔ میں تو ویسے بھی کل شام ڈیڈ کے ساتھ جیم خانہ گیا تھا...... وہ تاش کھیل رہے تھے اور میں ٹینس...... پھر رات کو وڈیو پر میں "ٹاپ آف دی پاپ" دیکھ رہا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے نئی کامیڈی مووی دیکھی تھی......" تنویر نے پوری کار گزاری بتا دی۔

اور شہزاد مایوس ہو گیا۔ اسکول میں صبح سے اب تک وہ تقریباً ہر ایک سے پوچھ چکا تھا لیکن کسی نے بھی وہ گانا نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ان میں سے تو کوئی بھی پی ٹی وی کے پروگرام نہیں دیکھتا تھا۔

تین بجے جب اسکے گرامر اسکول کی چھٹی ہوئی تو اس کی ملاقات باسط سے ہوئی۔

"یار شہزاد...... آج میری گاڑی نہیں آسکے گی...... تم مجھے ڈراپ کر دو گے......؟" باسط جو کلفٹن میں اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا، بولا۔

"کیوں نہیں......" تھوڑی دیر بعد دونوں شہزاد کی گاڑی میں بیٹھے چلے جا رہے تھے۔

"یار باسط...... تم ٹی وی کے پروگرام دیکھتے ہو......؟" شہزاد نے یونہی پوچھ لیا۔

"کیا......!" باسط نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔

"میرا مطلب ہے...... تم ٹی وی پر پاکستانی پروگرام دیکھتے ہو......"

"ہاں یار...... کبھی کبھار......" باسط نے کہا۔

"اچھا......" شہزاد ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا...... "کیا کل شام کو تم نے موسیقی کا پروگرام دیکھا تھا......؟"

"ہاں...... دیکھا تھا......" باسط نے کہا

"واہ...... یہ ہوئی ناں بات...... بتاؤ وہ گانا دیکھا تھا وائٹل سائنز کا......؟" شہزاد نے تقریباً

اُچھلتے ہوئے کہا۔

"وہی دل دل پاکستان والا.....؟" باسط نے کہا۔

"ہاں وہی...... " شہزاد بے انتہا خوش تھا۔

"زبردست تھا یار...... کیا کی بورڈ بجایا تھا...... اور گانا گایا بھی بہت اچھا تھا۔ بالکل باہر کی طرح...... مگر تھا بھی اپنا...... اردو میں ایسا گانا پہلی دفعہ سنا ہے......"

باسط تعریف کر رہا تھا اور شہزاد ہنس رہا تھا

"ڈرائیور ہالی ڈے اِن ہوٹل لے چلو...... ہم ذرا برگر اور آئسکریم کھائیں گے...... " شہزاد نے کہا۔

"یار کیا تم ٹریٹ دے رہے ہو.....؟" باسط نے کہا۔

"ہاں یار...... بہت باتیں کرنی ہیں...... پہلے کھاتے پیتے ہیں پھر میرے گھر چلتے ہیں تم وہاں سے فون کر دینا...... اوکے......"

"اوکے...... " باسط نے کہا اور شہزاد دوبارہ ہنسنے لگا۔

...... ○ ......

اس رات شہزاد بستر میں لیٹا تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ باسط سے باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ بھی اس گانے کو پسند کرتا ہے۔ پھر شہزاد نے اور باسط نے مل کر وہ گانا گانے کی کوشش کی مگر وہ یاد ہی نہیں تھا۔ تب ہی باسط نے مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ وہ بھی گروپ بنائیں اور یہی گانا گائیں اور اس کے بعد سے تو ایک ہنگامہ سا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں نے بھاگ بھاگ کر اپنے اپنے پیسے ملائے اور شام کو ہی جاکر ایک الیکٹرک پیانو خرید لیا۔ باسط کو یہ کی بورڈ بجانا آتا تھا۔ اس نے فوراً اس پر گانوں کی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ پھر انہوں نے اسی گانے "دل دل پاکستان" کی دھن بجانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ طے یہ ہوا کہ اس دفعہ ٹی وی پر جب وہ گانا آئے تو اس کو وڈیو پر ریکارڈ کر لیا جائے تاکہ وہ اس کو یاد کر سکیں۔ پھر جب باسط کے گھر سے گاڑی آئی تب ہی دونوں نے خواب دیکھنا بند کر دیئے۔

اس کے بعد سے روزانہ شہزاد ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا اور دیکھتا رہتا۔ انگلش فلم اور میوزک کی وڈیو دیکھے کئی روز گزر گئے۔ گھر میں سب پریشان تھے کہ پتہ نہیں شہزاد کو کیا ہو گیا ہے۔ مگر شہزاد کو تو دراصل اس گانے کی تلاش تھی۔

پھر ایک روز وہ گانا دوبارہ آگیا اور شہزاد نے اسکو ویڈیو پر ریکارڈ کر لیا۔

"ممی...... آپ مجھے یہ سمجھا دیں......" شہزاد نے اپنی ممی مسز ذیشان کو زبردستی ویڈیو کے آگے بٹھا دیا۔

"افوہ...... شہزاد...... میری اردو اتنی اچھی نہیں ہے...... پھر مجھے ایک میٹنگ میں بھی جانا ہے...... مسز وقاص اور مسز طاہر میرا انتظار کر رہی ہونگی۔ پھر کبھی...... اوکے......"

اور ممی چلی گئیں۔ چھوٹی بہن ماریہ کھلونوں سے کھیل رہی تھی اور ڈیڈی یعنی ذیشان صاحب حسب معمول گھر سے باہر تھے۔

شہزاد نے فون اٹھایا اور باسط کا فون ملانے لگا۔ پھر دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے......

...... ○ ......

"معاف کیجئے گا سر......"

شہزاد کی آواز پر قدرت اللہ صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

"سر...... آپ سے ایک بات پوچھنی ہے......"

"ہاں بیٹا پوچھو...... کیا کوئی شعر سمجھنا ہے......؟" قدرت صاحب اردو کے استاد تھے۔ پورے گرامر اسکول میں وہی ٹیچر تھے جو اردو میں بات کرتے تھے کیونکہ وہ اردو کے استاد جو تھے۔

"جی سر...... کچھ ایسا ہی سمجھ لیں......" باسط نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شہزاد نے ایک کاغذ قدرت صاحب کو پکڑا دیا۔

"ہائیں...... یہ کیا ہے...... کس نے لکھا ہے......؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

شہزاد اور باسط نے سر قدرت کو سمجھایا کہ یہ ایک میوزک گروپ نے گانا گایا ہے اور وہ بھی اس کو گانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو قدرت صاحب دونوں کو اس طرح گھورتے رہے جیسے کہ وہ دونوں خلائی مخلوق ہوں پھر ہنسنے لگے۔

"اچھا تو ایسا کرنا کہ مجھے کسی دن وہ وڈیو دکھانا...... میں تمہیں سب سمجھا دوں گا......"

قدرت صاحب نے کہا اور شہزاد اور باسط دونوں خوش ہو گئے......

سر قدرت کو وڈیو پر وہ گانا دونوں دوستوں نے دوسرے دن ہی دکھا دیا۔ سر قدرت پہلے تو نوجوانوں کو گانا گاتے دیکھتے رہے پھر خود بھی گانے لگے۔

"مگر یار تم دونوں کو یہ سب کچھ کیوں لگ گیا ہے......؟" سر قدرت چائے پیتے ہوئے بولے۔

"پتہ نہیں سر...... بس میں تو ڈیڈی کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں ویسا نہیں بننا چاہتا......

میں کچھ اور کرنا چاہتا ہو...... " شہزاد نے کہا۔

"یعنی گروپ بنا کر گانا چاہتے ہو...... " سر قدرت نے ہنس کر کہا۔

"شاید...... شاید نہیں...... لیکن میں ڈیڈی کی طرح نہیں بنوں گا...... پتہ ہے جب ڈیڈی امریکن انداز میں انگلش بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو مجھے اتنی ہنسی آتی ہے اور جب خود ہی سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو افسوس سا ہوتا ہے...... پتہ نہیں بس مجھے ڈیڈی اور ممی کی ہر چیز عجیب سی لگتی ہے، وہ ہر چیز، گاڑی سے لے کر منہ دھونے کا صابن تک باہر کا استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ڈیڈی تو اخبار بھی باہر کے منگوا کر پڑھتے ہیں...... کہتے ہیں کہ پاکستانی اخبار بکواس کرتے ہیں اور ان میں باہر کی خبریں نہیں ہوتیں...... دوپہر کو بارہ بجے ان کے لئے خلیج ٹائمز اخبار آتا ہے اور صبح وہ صرف پاکستانی اخبار ڈان پڑھتے ہیں...... ڈیڈی نے دو گاڑیاں اپنے لئے اور دو گھر کے لئے رکھی ہوئی ہیں...... اور ہاں گھر...... آپ تو دیکھ ہی چکے ہیں...... ایک دفعہ ہمارے گھر کے احاطے میں داخل ہو جائیں تو کہہ ہی نہیں سکتے ہیں یہ پاکستان ہے...... ممی نے ویمنز کلب کی ممبر شپ لی ہوئی ہے وہ وہاں جاتی ہیں اور اس کے علاوہ باہر کے کھانوں کی کلاسیں لیتی ہیں جبکہ ہمارا کھانا باورچی بناتا ہے...... اور سر کیا کیا بتاؤں...... سر آپ کو تو پتہ ہے کہ ہمارا گرامر اسکول کتنا ہی زبردست سہی، ہے تو صدر کے علاقے میں واقع...... میں کئی دفعہ چپکے سے صدر گھومنے جا چکا ہوں...... میں نے وہاں بالکل مختلف زندگی دیکھی ہے سر...... باقی سب لوگ پاکستانی چیزیں استعمال کرتے ہیں، خود میں چپکے چپکے لسی پی چکا ہوں...... مجھے بڑی مزیدار لگی تھی سر...... مگر ممی ڈیڈی کو پتہ چل جائے تو طوفان آجائے...... وہ تو پانی بھی بوتلوں میں بند کمپنیوں کا پیتے ہیں...... اور کبھی نل سے پانی پی لیں تو ان کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ ...... سر ہم آخر پاکستان میں کیوں رہتے ہیں...... امریکہ میں کیوں نہیں رہتے...... ڈیڈی بزنس باہر کیوں نہیں کرتے...... پاکستان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے...... "

شہزاد کی باتوں نے قدرت اللہ صاحب کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ گرامر اسکول میں پڑھنے والے کروڑ پتی باپ کی اولادیں بھی سوچ سکتی ہے۔ پھر انہیں گانے کا معمّہ سمجھ میں آیا...... شہزاد کو وہ گانا کیوں پسند آیا تھا...... کیونکہ وہ اس کے دل کی آواز جو تھا...... وہ گانا نہیں شہزاد کے جذبات تھے جو اس نے کسی اور کی زبان سے سنے تھے...... عجیب واقعہ تھا...... باپ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے دور تھا اور غیر پاکستانی ماحول میں پلنے والا بیٹا دل میں پاکستان کی محبت لئے ہوئے تھا...... اللہ کی قدرت اپنا کھیل کھیل رہی تھی...... قدرت صاحب کا دل بھر آیا...... انجانے جذبے کے تحت ان کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے، ان کے دل و دماغ میں بس ایک ہی گونج تھی۔

دل دل پاکستان ...... دل دل پاکستان

معیاری خوردنی اشیاء کی پہچان
اس کے اجزاء
ODUCES TASTE AHMED PRESERVE
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
PRODUCE OF PAKISTAN
NET WT. 330g./11.50 oz.
AHMED FOOD INDUSTRIES (Pvt.) LTD
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

اپنے دانتوں کو
مزے سے صاف کیجئے
کرسٹل کے تین ذائقے، تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔
کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔
Crystal
سانس خوشگوار، دانت چمکدار
Crystal
Crystal
Crystal White

ببلو پٹاخہ عرف پاکستانی

شاھنواز فاروقی

آپ ببلو پٹاخہ عرف پاکستانی کو جانتے ہیں؟ نہیں جانتے ہوں گے۔ ہم میں سے اکثر اچھی چیزوں اور اچھے لوگوں کو ذرا کم ہی جانتے ہیں۔

ببلو پٹاخہ عرف پاکستانی دراصل میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے پانچ سال اور قد میں ایک فٹ چھوٹا ہے۔ مگر ذہنی عمر میں وہ مجھ سے کم از کم بیس برس بڑا ہے۔ مجھ سے ہی نہیں بڑے بڑوں سے۔ اس کا اصل نام بابر ہے جو محبت میں بگڑ کر ببلو ہو گیا۔ ہم محبت میں بہت سی چیزوں کو بگاڑ دیتے ہیں جیسے بقول ببلو کے ہم نے پاکستان کو محبت محبت میں بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ پٹاخہ کا خطاب اسے اپنی حاضر جوابی اور باتونی ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ بالکل اچانک کسی پٹاخے کی طرح پھٹ پڑتا تھا۔ پاکستانی کی عرفیت اسے ابو سے ملی تھی۔ کیوں ملی تھی یہ ہم آپ کو آگے چل کر بتائیں گے۔

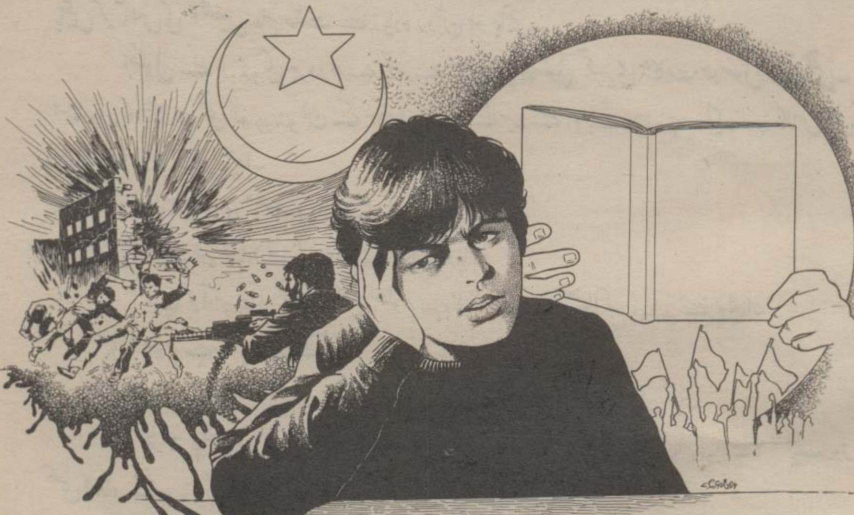

بہلو بڑا عجیب تھا۔ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی عجیب ڈغریب حرکت کرتا رہتا۔ لوگوں کو اس کی باتیں عجیب لگتی تھیں مگر اس کی باتوں میں بڑے گہرے معنی چھپے ہوتے تھے۔ جو سطحی باتیں سوچنے والوں کی سمجھ میں نہ آتے۔ ان دنوں وہ میٹرک اور میں بی اے کے آخری سال میں تھا۔ ایک روز میں کالج سے لوٹا تو دیکھا بہلو بھری دوپہر میں ٹارچ روشن کئے گلی میں ادھر ادھر گھوم کر کچھ تلاش کر رہا ہے اور گلی سے گزرنے والے لوگ اسے دن کی روشنی میں ٹارچ جلائے کچھ تلاش کرتا دیکھ کر مسکراتے یا قہقہے لگاتے گزر رہے ہیں۔

"مسٹر پٹاخہ دن کی روشنی میں ٹارچ جلا کر کیا تلاش کر رہے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"ایک سچا پاکستانی" بہلو نے اس طرح منہ بناتے ہوئے کہا جیسے وہ کونین کی گولی چوس رہا ہو۔

"ایسا کام کیوں کرتے ہو جس میں کامیابی کی توقع نہ ہو۔" میں نے اس کی اس عجیب و غریب حرکت کے معنی سمجھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں میں اس کام میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ اگر مجھے گلیوں گلیوں گھوم کر بھی کوئی پاکستانی نہ ملا تو میں واپس آکر آئینہ دیکھ لوں گا۔" بہلو نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ بہلو جب بھی ایسی باتیں کرتا اس کی آنکھیں عام حالت سے زیادہ روشن ہو جاتیں۔

اسکول سے بہلو کی ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی تحریری شکایت موصول ہوتی تھی۔ استادوں کو شکایت تھی کہ بہلو ان کے سوالوں کے الٹے سیدھے جوابات دیتا ہے۔ ایک روز کلاس میں استاد نے بہلو سے پوچھا۔

"پاکستان کی دو مشہور پیداوار کے نام بتاؤ؟"

"قومیت اور فسادات" بہلو نے جواب دیا۔

"آپ کو قومیت کی تعریف بھی معلوم ہے؟" استاد نے جھنجلا کر بہلو سے پوچھا۔

"جی معلوم ہے" بہلو نے کہا۔

"بیرونی روپیہ+خود غرضی+جھوٹ=قومیت" بہلو نے قومیت کا فارمولا بیان کیا۔

"گزشتہ چالیس برس میں پاکستانی قوم نے سب سے نمایاں کارنامہ کیا انجام دیا ہے؟" ایک روز کسی استاد نے بہلو کی کلاس سے سوال کیا۔

"ایٹم بم بنانے کی صلاحیت حاصل کی۔" کسی بچے نے جواب دیا۔

"غذا میں خود کفالت حاصل کی۔" ایک اور بچے نے کہا۔

"ہم نے ڈاکٹر قدیر، عمران خان اور جہانگیر خان پیدا کیے۔" ایک آواز ابھری

"ہم نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر کے بنگلہ دیش بنوا دیا۔"

آپ ٹھیک سمجھے یہ ببلو کا جواب تھا۔

"اتنی سی عمر میں آپ کی سوچ اتنی منفی کیوں ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"اتنی بڑی عمر میں بھی آپ کی سوچ اتنی مثبت کیوں ہے؟" ببلو نے سوال کیا۔ استاد اچھے تھے خاموش ہو گئے اور ہمارے ابو کے نام ببلو کے خلاف شکایتی خط لکھ دیا۔

ایک دن ہم سب گھر والے بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک ببلو نے ابو سے ایک عجیب سوال کر دیا۔

"ابو جی آپ اپنے نام یعنی امداد کے ساتھ لکھنوی کیوں لکھتے ہیں۔" چند لمحوں تک تو ابو کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ مگر پھر سوال کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"اس لئے کہ ہم لکھنؤ سے آئے ہیں۔"

"کہاں آئے ہیں؟"

"پاکستان میں اور کہاں۔" ابو نے الجھتے ہوئے کہا۔

"پاکستانی ہو کر ایسے نام کے ساتھ لکھنوی لکھنا ایسے ہی جیسے کوئی شخص بادشاہ ہو کر بھی اپنے نام کے ساتھ کنگال لکھے۔" ببلو نے لقمے کو زور زور سے چباتے ہوئے کہا۔

"ابو سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو خاموش ہو گئے اور اس دن کے بعد سے ببلو میاں کے نام کے ساتھ پاکستانی کی عرفیت کا اضافہ ہو گیا۔ یہ عرفیت کبھی تو تعریف کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور کبھی طنز کے طور پر۔

"پاکستان ببلو کی کمزوری ہے، بالکل اسی طرح جیسے کچھ لوگوں کی کمزوری غربت، جہالت یا کم ذات ہونا ہو۔ لیکن ببلو میں ایک اور عجیب عادت تھی، وہ خود تو پاکستانی قوم پر خوب خوب تنقید کر لیتا تھا۔ مگر جہاں کسی اور نے پاکستانی قوم یا پاکستان پر تنقید کی، ببلو شروع ہو گئے اس کی درگت بنانے۔ ایک روز دوپہر کو میں کالج سے گھر آیا تو ببلو بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر جوتے کھولنے لگا۔

ببلو اچانک اخبار پڑھتے پڑھتے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے مزے کی خبر چھپی ہے بھائی جان۔ پتہ ہے کل بہت سے لوگ ہندوستان کے

قونصلیٹ پر بھارت میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام پر مظاہرہ کرنے گئے تھے۔ معلوم ہے بھارتی قونصلیٹ جنرل نے مظاہرین کے رہنماؤں سے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام کو رکوانے کی کوشش کریں گے، آپ کراچی اور حیدر آباد میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کو رکوانے کی کوشش کریں۔ خبر میں ہے کہ یہ جواب سن کر مظاہرین کے رہنماؤں کے منہ بھیگے کپڑوں کی طرح لٹک گئے ہا...... ہا...... " ببلو زور زور سے ہنسنے لگا۔

ایک روز مجھے ببلو کے ایک دوست اور ہم جماعت نے بتایا کہ استاد نے پڑوسیوں کے حقوق پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے مذہب نے ہمیں بار بار تلقین کی ہے کہ ہم اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھیں۔ مگر افسوس اب ہم اپنی زندگی میں اتنے مگن ہو گئے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے برابر میں کون رہتا ہے۔ تقریر کے بعد انہوں نے پوری کلاس سے پوچھا۔

"ہاں تو بچو ہمیں اپنے پڑوسیوں کا کیوں خیال رکھنا چاہئے؟"

"اس لئے کہ ہمارے مذہب نے اس کی تلقین کی ہے۔" ایک آواز ابھری۔

اس لئے کہ خدا اور اس کا رسولؐ ہم سے خوش ہو۔" کسی اور نے کہا۔

"ببلو آپ بھی بتایئے" استاد نے جو حال ہی میں کسی دوسرے اسکول سے تبادلہ ہو کر آئے تھے ببلو سے کہا۔

"ہمیں اپنے پڑوسیوں کی پوری خبر گیری کرنی چاہئے۔"

"پوری کلاس حیران تھی کہ آج ببلو مثبت تبصرہ کر رہا ہے۔ لیکن ببلو نے اگلے جملے میں اپنا اصل تبصرہ بیان کر دیا۔ اس نے کہا۔

"ہمیں اپنے پڑوسیوں کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ مہاجر ہیں یا سندھی، پنجابی ہیں یا پٹھان تاکہ اگر فساد ہو تو ہم ان کو بروقت ہلاک کر سکیں۔" ببلو نے اپنا جواب مکمل کیا تو پوری کلاس پر سناٹا چھا گیا۔ نئے ماسٹر صاحب حیرت سے منہ کھولے ببلو کو دیکھ رہے تھے۔

"اگرچہ کسی کی ذاتی ڈائری پڑھنا بری بات ہے مگر میں یہ جانتے ہوئے بھی ببلو کی ڈائری پڑھتا تھا۔ بڑی عجیب ہوتی تھی۔ عجیب و غریب خیلات اس میں لکھے ہوئے تھے۔ کراچی میں باقاعدہ لسانی فسادات شروع ہوئے تو ببلو اداس رہنے لگا اور خلاف معمول خاموش بھی۔ انہی دنوں میں نے اس کی ڈائری پڑھی۔ لکھا تھا۔

"پاکستان جسے اسلامی ریاست کا نمونہ بنناتھا قومیتیں پیدا کرنے والی فیکٹری بن گیا ہے۔ جس طرح جاپانی ہر سال کار کا ایک نیا ماڈل بنا کر بازار میں پیش کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ہر سال ایک نئی قومیت بنا کر

دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں ہم نے اتنی تعداد میں قومیتیں پیدا کی ہیں کہ یہ ان میں خود کفیل ہو گئے ہیں بلکہ اگر حکومت چاہے تو ان قومیتوں کو ضرورت مند ممالک کو بر آمد کر کے اچھا خاصا زر مبادلہ کما سکتی ہے۔

قومیتوں میں خود کفیل ہونے کے باعث ہم شہیدوں میں بھی خود کفیل ہو گئے ہیں۔ اب پوری دنیا میں ہماری شہرت کے صرف دو ذرائع ہیں۔

ایک ہمارا پڑوسی ملک بھارت، جو اپنی ہر مصیبت کا الزام ہم پر ڈال کر ہمیں پوری دنیا میں مشہور کرتا ہے اور دوسرا ذریعہ ہماری قوم پرست تنظیمیں اور ان کی وجہ سے ہونے والے فسادات ہیں"

دو دن بعد کی ڈائری میں لکھا تھا۔

"ہمارے علاقے میں تین قومیتوں کے ماننے والے رہتے ہیں ہر روز ان میں سے کوئی نہ کوئی جلوس نکلتا ہے جب بھی کوئی جلوس نعرے لگاتا ہوا ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے میرے سر میں شدید درد ہو جاتا ہے اور چند لمحوں کو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔"

آخری جملہ پڑھ کر میں چونک گیا۔ اسی رات کو میں نے ابو کو یہ بات بتادی۔ یہ سن کر ابو بھی فکر مند ہو گئے۔ چند دن بعد ہم نے ببلو کو دماغی بیماریوں کے ایک ماہر ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے ببلو کے دماغ کا ایکسرے کروایا۔

تین دن بعد رپورٹ نے جو کچھ بتایا اس نے پورے گھر کو موت کے سناٹے کی گرفت میں دے دیا۔ رپورٹ کے مطابق ببلو کا دماغ (DEGENERATION) کی بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسی بیماری ہوتی ہے جس میں انسان کی کھوپڑی میں ایک اور دماغ پیدا ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر کے بقول یہ بیماری غیر معمولی ہے۔ ذہین افراد یعنی بڑے جینیئسوں کو ہوتی ہے اور عام طور پر غیر معمولی ذہنی دباؤ کے باعث ہوتی ہے۔ پاکستان میں اس بیماری کا یہ پہلا کیس تھا۔ اس بیماری کا شکار مریض دو تین برسوں میں یقینی طور پر موت کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ببلو کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس کے دماغ میں دوسرے دماغ کی پرورش کا عمل سست رفتاری سے جاری تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت وہ ایک آدھ سال زیادہ جی سکتا تھا۔

ڈاکٹر کے مطابق ہمارا ببلو پٹاخہ عرف پاکستانی چھ ماہ بعد مر جائے گا۔ ببلو کہتا ہے کہ میں آدھا مروں گا، یعنی ببلو پٹاخہ مر جائے مگر پاکستانی زندہ رہے گا یہ بات صرف ہمارے گھر والے ہی جانتے ہیں کہ ببلو اس بیماری کا شکار صرف اس لئے ہوا کہ وہ پاکستان میں قائد اعظم کے اصولوں کو پامال ہوتا دیکھ کر غیر معمولی ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا تھا۔

ببلو اب گزشتہ دو ماہ سے کلفٹن میں اپنی بوڑھی پھوپھی، پھوپھا کے پاس رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علاقہ خاصا سنسان ہے۔ وہاں کسی قومیت کا کوئی جلسہ، جلوس نہیں ہوتا۔ انتہائی مذہبی پھوپھی کے یہاں ریڈیو اور ٹی وی نہیں ہے اور اخبار وہ لوگ ببلو سے چھپا کر پڑھتے ہیں۔ ہاں مگر کل سے ہم لوگ بہت خوش ہیں۔ ببلو عرف پاکستانی کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے لے جایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ اور مختلف قسم کے ٹیسٹ لینے کے بعد یہ خوش خبری سنائی کہ ببلو کی حالت سدھر رہی ہے اور اس کی زندگی بچ جانے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر ہم اس خوشی سے رو پڑے۔

ببلو کی حالت ایک دم کیوں بہتر ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر یہ بتانے سے قاصر تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ ببلو اس لئے صحت مند ہو رہا ہے کیونکہ اسے پاکستان کے بارے میں بری بری خبریں ملنی بند ہو گئی ہیں............ پاکستان اچھا اور صحت مند رہے گا تو ببلو پر بھی اس کا اچھا اثر ہو گا۔

ببلو زندہ رہے گا کیونکہ پاکستان بھی زندہ رہنے کے لئے بنا ہے۔

باادب بانصیب

دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی حدیث کا درس دے رہے تھے۔ یکایک ایک خستہ حال بوڑھا یہ پکارتا ہوا آیا۔ "قاسم کہاں ہے؟ قاسم کہاں ہے؟" حاضرین کو نووارد کا یہ لہجہ بہت ناگوار گزرا، ممکن ہے کوئی اسے ٹوک بیٹھتا مگر مولانا قاسم فوراً دوڑے اور نووارد سے بولے۔ "حضرت! میں حاضر ہوں۔" بوڑھے کو انہوں نے ادب سے سلام کیا اور گلے ملے پھر پلنگ بچھایا، اس پر بستر لگایا اور بوڑھے کو عزت سے بٹھا دیا۔ طلبہ سے انہوں نے کہا۔ "جب تک حضرت یہاں قیام پذیر ہیں، درس موقوف رہے گا۔"

جب تک وہ وہاں ٹھہرے، مولانا قاسم ان کی خدمت میں مصروف رہے۔ درس کا سلسلہ ان کی روانگی کے بعد شروع ہوا۔ طلبہ حیرت زدہ تھے، انہوں نے مولانا قاسم سے پوچھا۔ "حضرت یہ بزرگ کون تھے۔" مولانا قاسم نے سادگی سے جواب دیا۔ "یہ وہ تھے جنہوں نے تمہارے استاد قاسم نانوتوی کو شیخ الحدیث بنا دیا۔" طلبہ اور حیرت زدہ ہوئے۔ مولانا نے بتایا۔ "یہ میرے ابتدائی معلم تھے۔ انہوں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا تھا۔"

قائدِ اعظم سے ایک ملاقات

محب علی خان

پیارے ساتھیو آج میں آپ کو قائداعظم سے اپنی غیر ارادی ملاقات کی داستان سناتاہوں کہ یہ انجانے میں کس طرح ہوئی۔

یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ میرے والد کو دہلی میں لیڈی ہارڈنگ کے ہسپتال میں کچھ فرنیچر وغیرہ بنانے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ میری عمر اس وقت ۱۷، ۱۸ سال تھی اور میں فرنیچر کا کام خوب اچھی طرح کر سکتا تھا۔ اس دن میں اور میرے ساتھی لیڈی ہارڈنگ کے ہسپتال میں کام میں مصروف تھے کہ ایک خاتون جو ہسپتال میں کسی کام سے آئی تھیں واپس جاتے ہوئے رک گئیں اور میرے ایک ساتھی جے دیال سے کہا میرے بنگلے پر آؤ کچھ فرنیچر مرمت کرانا ہے اور اپنا ایک پرچہ دیا جس پر ان کا پتہ لکھا تھا۔

دوسرے دن میں، جے دیال، اور سجاد تینوں ضروری اوزار اور سامان لے کر ان خاتون کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچ گئے۔ ساتھیو! تمہیں معلوم ہے یہ خاتون کون تھیں یہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔ جن کو ہم میں سے وہاں کسی نے نہ پہچانا تھا۔ خیر! جب ہم ان کے بنگلے ۱۰ اورنگ زیب روڈ پر پہنچے تو باہر کے گیٹ پر ایک نہایت سفید وردی میں ملبوس دربان کھڑا تھا۔ ہم نے وہ پرچہ اس کو دکھایا۔ اس نے کہا اندر والے دربان کو دو۔ ہم لوگ گیٹ میں داخل ہوئے تو بائیں جانب سیمنٹ کی چھتری کے نیچے قائداعظم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھے جن میں ان کے سیکریٹری، کے۔ ایچ خورشید بھی شامل تھے جو بعد میں آزاد کشمیر کے صدر بھی رہے لیکن ہم تو کسی کو بھی نہ جانتے تھے۔ یہ سب تو بعد میں معلوم ہوا۔

خیر ہم دبے پاؤں اندر کے دربان تک پہنچے اور اسے وہ پرچہ دیا۔ اس نے پرچہ دیکھا اور اندر سے پیتل کی ایک پلیٹ لایا اور اس میں پرچہ رکھ کر اندر داخل ہوگیا۔ واپس آکر ہم سے کہا پچھلے دروازے کی طرف جاؤ۔ جب ہم کچن کے دروازے کے پاس گئے تو وہاں چبوترے پر محترمہ فاطمہ جناح آئیں (ہم اب تک نہ پہچانے تھے) انہوں نے جے دیال سے کہا "ہم نے تم کو ایڈریس دیا؟" جے دیال نے میری طرف اشارہ کیا کہ محترمہ فاطمہ جناح مجھ سے بات کریں۔ میں نے کہا ہاں ہم لوگ فرنیچر مرمت کرنے ہی آئے ہیں۔ اس وقت دن کے تقریباً دس بجے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے زور سے اپنے

سیکریٹری کو آواز دی اور کہا کہ گودام کا دروازہ کھولو اور سارا فرنیچر نکالو فوراً سب فرنیچر نکالا گیا۔ تقریباً ۳۰، ۴۰ کرسیاں تھیں۔ انہوں نے پوچھا کتنے پیسے ہونگے۔ میں نے کہا ۱۷۵ روپے۔ وہ غصے میں اندر چلی گئیں۔ میں نے جے دیال سے کہا واپس چلو شاید کام نہیں ملے گا ہم کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے کہ میرے کاندھے پر کسی کا نرم ہاتھ محسوس ہوا۔ وہ قائداعظم تھے۔ انہوں نے کہا "تم بائی جی سے ناراض ہو گیا" ؟ اور یہ پوچھا کہ ان سے تم نے کیا مانگا تھا۔ میں نے کہا ۱۷۵ روپے۔ پھر انہوں نے کہا "نہ ان کی بات نہ تمہاری بات۔ بس ۱۷۰ روپے" یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

ہم تینوں نے اسی وقت کام شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک ملازم آیا اور چھوٹے چھوٹے کتوں کو کھانا دے کر وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے اس ملازم سے پوچھا "یہ صاحب کہاں نوکر ہیں؟" اس نے تعجب سے پوربی زبان میں پوچھا "تم نہ جانوانہیں ؟ یہ مسلمانوں کے بادساہ کہلاوے ہیں، یاکو (ان کو) جناح صاحب کہتے ہیں۔ ارے ! تم ان کو نا جانو ہو ؟" پھر میرے ذہن میں ان کی تصویر آئی ہے اور واضح ہوگئی کیونکہ اس زمانے میں ٹیلیویژن تو نہیں تھا بس اخباروں میں تصویر دیکھنے کو ملتی تھی۔ کام ختم کر کے جب ہم باہر نکلے تو گیٹ کے باہر چوراہے پر کافی طالب علم قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کو ایک نظر دیکھنے کے لئے جمع تھے اور مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے (قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح روزانہ چار بجے تفریح کے لئے نکلتے تھے)۔

اس واقع نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں فوراً "مسلم نیشنل گارڈز" میں شامل ہوگیا۔ اور پاکستان بننے تک شامل رہا۔ ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کو دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر کراچی کے لئے رخصت کرتے وقت ہم نے بھی وہاں مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے نعرے لگائے تھے۔

محب علی خان "مسلم نیشنل گارڈز" کے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ

ہم دُکھ اُٹھاتے ہیں پھر بھی پاکستان سے مُحبّت کرتے ہیں

ساجد سعید

میں اپنے گھر کی سامنے والی سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ "تازہ اخبار آج کا تازہ اخبار پڑھیے۔" یہ آواز کوئی دس گیارہ سالہ بچے کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اخبارات کے بنڈل تھے۔ لوگ اس سے اخبار خرید کر آگے بڑھ جاتے اور کچھ اخبارات پر سرسری نگاہ ڈال کر چل پڑتے۔ اس کے ننھے منے ہاتھوں میں اسکول کی کتابوں کے بجائے اخبارات تھے جسے بیچ کر وہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتا ہوگا۔ دوسری طرف میری نظروں میں وہ بچے گھومنے لگے جو صاف

جلتی دوپہر میں پسینے سے شرابور محفوظ الیاس تولئے بیچتے ہوئے

ستھرے لباس پہنے، فکروں سے آزاد اپنے اسکول کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ کیسا نظام ہے ایک طرف شکستہ گھروں میں رہنے والے بچے ہیں جو گندے برتنوں میں روکھی سوکھی کھا کر سو جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی وہ گلی کوچوں میں اخبار بیچتے ہیں بوٹ پالش کرتے اور گیراجوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ بچوں کے عالمی ادارے نے بچوں کے کام کی ایک عمر مقرر کر رکھی ہے۔ تب ہم نے سوچا کیوں نہ ایسے ہی بچوں سے بات کی جائے جو چھوٹی عمر میں محنت اور ایمانداری سے کما کر اپنے اور گھر والوں کے لئے روزی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ خود بھی جیتے ہیں اور اپنے گھر والوں کو بھی جینے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے رہتے ہیں۔ یہ بہادر، جدوجہد کرنے والے سچے پاکستانی۔ ان باتوں کو سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ یہ بچے اپنے وطن پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ اس وطن کے بارے میں جس کی سڑکوں اور گلیوں میں انہیں دن بھر رزق کی تلاش میں مارے پھرنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن میں انہیں کتنی ہی تکلیفوں سے گزرنا پڑتا ہو...... مگر بہر حال یہ ان کا اپنا وطن ہے۔ اور اس کے بارے میں ان کے کچھ نہ کچھ تو احساسات ہوں گے ہی۔ تو میں ان سے پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اے میرے محنت کش دوستو! تمہیں پاکستان کیسا لگتا ہے؟ اور یہ تم اسے کیسا دیکھنا چاہتے ہو......

میں نے ایسے محنت کش بچوں کو مختلف جگہوں سے تلاش کیا۔ ان میں اخبار بیچنے والے بھی تھے، گیراجوں میں کام کرنے والے بھی اور کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والے بھی۔ سب سے پہلے میری ملاقات ایک گیارہ سالہ بچے سے ہوئی جو سڑکوں پر گاڑی صاف کرنے والے تولئے بیچتا ہے۔ اس کا نام محفوظ الیاس تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "محفوظ! تم پڑھتے کیوں نہیں؟" محفوظ نے جواب دیا:

"میں پڑھتا تھا۔ میں چھٹی جماعت میں تھا جب میرے والد صاحب کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میری عمر صرف سات سال تھی۔ والد صاحب ہی گھر کا سہارا تھے۔ انکی وفات کے بعد گھر کے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ جس کے بعد مجھے پیٹ کی خاطر پڑھائی چھوڑنی پڑی اور میں کمانے لگا۔"

"دن بھر میں کتنی آمدنی ہو جاتی ہے محفوظ!" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی پچیس روپے!"

"پھر تم انہیں خرچ کیسے کرتے ہو؟"

میں اپنی والدہ کے ہاتھوں میں سارے پیسے دے دیتا ہوں۔ وہی گھر کا سارا خرچ چلاتی ہیں...... میرے چھوٹے بھائی بہن بھی ہیں...... وہ پڑھتے ہیں۔ انہیں پیسوں سے ان کی فیس ادا کر دی جاتی ہے۔"

"محفوظ! یہ بتاؤ تمہیں پاکستان کیسا لگتا ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جی۔ پاکستان تو میرا ملک ہے جی...... یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے"

"اپنے ملک سے تمہیں کوئی شکایت تو نہیں ہے ؟" میں نے سوال کیا۔

"اپنے ملک سے کسے شکایت ہوگی۔ بس یہاں کے حالات ایسے ہیں جس کی وجہ سے غریب لوگ پریشان رہتے ہیں۔ اگر یہاں لوگ مل جل کر رہیں اور تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں تو اس میں ان ہی کی کامیابی ہے۔" محفوظ جسے حالات نے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا، تعلیم کی اہمیت کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ بے شک ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک تعلیم عام نہیں ہو، جہالت کے اندھیرے دور نہ ہوں۔ تعلیم ہی سے ہر مسئلے کا قفل کھل سکتا ہے۔

محفوظ الیاس سے مل کر میں جا رہا تھا کہ میری نگاہ ایک بچے پر پڑی جو ایک ٹھیلے پر بڑی سی دیگچی رکھے بریانی فروخت کر رہا تھا۔

"السلام علیکم !" میں نے نزدیک پہنچ کر کہا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ یہیں کھائیں گے یا پارسل کر دوں؟" اس نے جلدی سے کہا۔ یہ عمران بیگ تھا جن کا خیال تھا کہ میں بھی دوسرے گاہکوں کی طرح اس کا ایک گاہک ہوں اور بریانی کی پلیٹ کے لئے اس کے پاس آیا ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے اپنے رسالے کے لئے بات چیت کرنا چاہتا ہوں تو وہ فوراً تیار ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ جب بہت چھوٹا تھا اسی زمانے سے اس کے

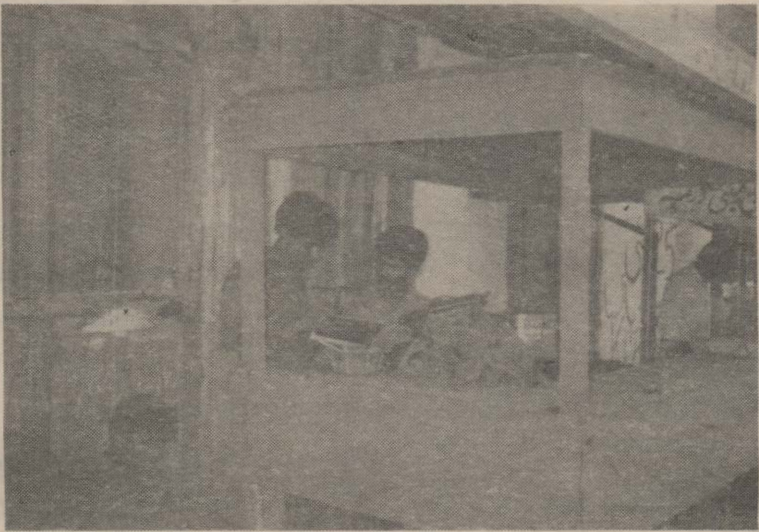

دوسروں کو کھلا کر اپنے کھانے کا سامان کرتے ہوئے ۔ عمران بیگ

گھریلو حالات خراب ہونا شروع ہوگئے باپ کی مسلسل بیماری سے پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ آخر کار پڑھائی چھوڑ کر اس نے کپڑوں کا کاروبار شروع کر دیا...... کچھ عرصے بعد جب باپ کی حالت سنبھلی تو انہوں ایم اے جناح روڈ پر بریانی بیچنا شروع کر دی اور بیٹے کو بھی اس کام پر لگا دیا۔ عمران بیگ اب دن میں دو تین گھنٹے بریانی بیچتا ہے اور باقی وقت کپڑے فروخت کرتا ہے اس کی تین بہنیں اور تین بھائی ہیں...... اسی طرح کل افراد خانہ نو ہیں۔

"عمران! تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی تعلیم حاصل کرو" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ بہت دل چاہتا ہے کہ میں بھی لکھوں پڑھوں لیکن شاید میری قسمت میں ہی نہیں تھا۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔ شاید اداس ہوگیا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں پاکستان کیسا لگتا ہے؟ کیا تم یہاں کے حالات سے مطمئن ہو؟"

"مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے" عمران نے کہا۔ "لیکن کچھ لوگوں نے یہاں کے حالات بہت خراب کر دیئے ہیں۔ سب آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر پاکستان نہیں رہے گا تو وہ کہاں جائیں گے۔ دیکھئے نا۔ ہمارا دین تو یہ سکھاتا ہے کہ دشمن سے بھی حسن سلوک کرو۔ اور ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اسی طرح کہیں ملک ترقی کر سکتا ہے۔" عمران بول رہا تھا اور میں خاموش سن رہا تھا۔ یہ اس بچے کے خیالات تھے جسے زندگی سے کچھ نہیں ملا تھا۔ لیکن جسے اپنے وطن سے پیار تھا۔

کچھ ایسے خیالات اس چودہ پندرہ سالہ بچے کے تھے جو اردو بازار میں پرانی کتابوں کا ڈھیر لگائے بیٹھا تھا۔ اکا دکا گاہک اسکول کی کتابوں کی فہرست اس کے سامنے کر دیتے اور وہ ان کو کتابیں نکال کر دے دیتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے آس پاس کوئی گاہک نہیں ہے میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کا نام راشد عبدالستار تھا۔ اور اس نے اس سال سائنس کے مضمون میں میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ جب اسکولوں میں داخلے شروع ہوتے ہیں تو وہ کتابیں بیچنا شروع کر دیتا ہے جس سے ہفتے میں دو تین سو روپے تک آمدنی ہو جاتی ہے اور عام دنوں میں وہ لیتھ مشین پر کام کرتا ہے اور پچاس روپے ہفتہ کما لیتا ہے۔ راشد نے ایک بڑی دلچسپ بات بتائی۔ اس کے والد اور بڑے بھائی بھی ملازمتیں کرتے ہیں اور ان کی تنخواہوں سے اچھی آمدنی ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود راشد کام اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ مصروف رہے اور اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر آجائے اور اسے مستقبل میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔ راشد نے باتوں میں شکایت کی کہ "اسکول میں سال بھر پڑھائی نہیں ہوتی اور نقل کا رجحان بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہر سال بے شمار لڑکے نقل کے ذریعے امتحان پاس کرتے ہیں...... اپنا بھی اور ملک کا بھی نقصان

کرتے ہیں۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہیں پاکستان کیسا لگتا ہے؟"

"جی بہت اچھا............ اور پھر کس کو اپنے ملک سے محبت نہیں ہوتی۔ جو لوگ اپنے ملک سے محبت نہیں کرتے وہ غدار ہوتے ہیں۔" راشد عبدالستار نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

ریڈیو اسٹیشن کراچی کی پچھلی گلی میں مشینوں وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ جہاں میں نے ایک تیرہ سالہ بچے کو دیکھا جو اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ مشینوں کی سیاہی نے اس کے ہاتھ اور چہرے کو سیاہ کر دیا تھا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"عرفان۔"

"یہاں آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"جی یہاں کام سیکھنے آتا ہوں۔ یہاں وائرنگ، ویلڈنگ وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ اب تو مجھے اس جگہ کام کرتے ہوئے تقریباً چھ سات مہینے ہو گئے ہیں۔"

"تو یہاں کام کرنے کے آپ کو کتنے روپے مل جاتے ہیں؟"

"یہی کوئی ساڑھے تین سو روپے مہینہ۔"

ٹھیلے پر چند کتابیں روزی کا آسرا ہیں، راشد عبدالستار ایک محنت کش بچہ

"تو یہاں کام کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے ؟"
"کسی اچھی نوکری کی تلاش۔"
"پڑھتے بھی ہیں۔"
"جی نہیں۔"
"کیوں ؟"
"بس دل ہی نہیں چاہتا کیونکہ ہمارے گھر میں کسی نے بھی پڑھائی نہیں کی۔"
"یہ کام کرتے ہوئے کیسا لگتا ہے ؟"
"بہت اچھا کیونکہ محنت میں عظمت ہے۔"
"گھر میں اور کون کماتا ہے۔"
"بس جی میرے والد صاحب۔"
"اچھا پاکستان کیسا لگتا ہے ؟"
"جی اچھا لگتا ہے۔"
"کیوں ؟"
"بس کیونکہ یہ ہمارا ملک ہے ہم یہاں پیدا ہوئے ہیں یہیں بڑے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ہر شخص کو اپنے ملک سے محبت ہونی چاہئے۔"

"اچھا عرفان یہ بتایئے کہ آپ اپنے ہم عمر بچوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟" میں نے کہا۔

"میں یہی کہوں گا کہ انسان کو محنت سے کام کرنا چاہئے اور حرام کمائی سے بچنا چاہئے تاکہ قیامت کے روز ہم اللہ کے عذاب سے بچ سکیں۔"

اگلے روز میری ملاقات خالد سے ہوئی۔ یہی کوئی سولہ سال عمر رہی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا
"تم نے پڑھائی کیوں نہیں کی ؟"

"بس جی والد صاحب کے انتقال کے بعد جی ہی نہیں چاہا پڑھائی کرنے کا۔ اس کے بعد ہم یہاں کام میں لگ گئے۔"
"کیا کام کرتے ہیں آپ یہاں ؟"
"یہاں سائیلنسر اور ریڈیئٹر کی مرمت وغیرہ کرتے ہیں تقریباً چھ سال سے۔"

کام کے دوران عرفان سے ساجد سعید کی بات چیت

"کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟۔"

"تقریباً چالیس پچاس روپے روزانہ۔"

"اب اگر تمہیں دوبارہ پڑھائی کرنے کا موقع مل جائے تو کیا تم پڑھائی کرو گے؟۔"

"جی یہ کام تو میں چھوڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ گھر میں کوئی دوسرا کمانے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر مجھے پڑھائی کا موقع مل جائے تو میں دن میں ایک یا دو گھنٹے نکال کر ضرور پڑھوں گا۔" اسی دن میں ایک اور بچے سے ملا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"میرا نام عرفان رفیق ہے۔ عمر پندرہ سال، مجھے ملا کر چار بھائی، دو بہنیں اور والدہ ہیں۔"

"تو آپ کے بھائی بھی کماتے ہیں؟۔"

"جی ایک بھائی میکینک کا کام کرتا ہے، دوسرا پریس میں پلیٹ میکر ہے اور میرا تیسرا بھائی بھی پریس میں کام کرتا ہے۔" عرفان نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"تو جب آپ کے بڑے بھائی کما رہے ہیں تو پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ بھی کمائیں۔ آپ چاہیں تو کام کو چھوڑ کر پڑھائی کر سکتے ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"جی کام تو میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ بہنوں کی اسکول کی فیس، بھابی اور ان کے بچوں کا خرچہ یہ سب ہم سب بھائیوں کے کمانے سے بھی پورا نہیں ہوتا۔ دل تو کبھی کبھی چاہتا ہے کہ میں بھی پڑھوں لیکن گھر کے مسائل مجھے اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ میں کماؤں۔"

"تو آپ کو یہ کام کرتے ہوئے کیسا لگتا ہے؟"

"جی بہت اچھا۔ ضروری نہیں میں بھی اے سی والے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر کماؤں یا صرف چند دستخطوں سے مجھے ہر مہینے تنخواہ مل جایا کرے، میں محنت کرتا ہوں مجھے اسی پر فخر ہے کیونکہ ہنر ہی انسان کو کچھ بناتا ہے۔ بے کار لوگ پچھتاتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس ڈگریوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو آپ کے خیال پڑھنا نہیں چاہئے۔"

"نہیں پڑھائی بہت ضروری ہے۔ اس سے آدمی کامیاب ہوتا ہے لیکن پڑھنے کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر بھی انسان کو سیکھنا چاہئے تاکہ کمانے کے وقت وہ ہنر اس کے کام آسکے۔"

"عرفان ماشاء اللہ آپ تو کافی ذہین ہیں۔" میں نے عرفان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی۔

"یہ تو میری والدہ اور والد کی خوبی ہے کہ انہوں نے ہمیں ٹھیک ٹھاک طریقے سے اتنا بڑا کر دیا لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا اس لئے ہم سب بھائی پڑھائی نہ کر سکے۔"

"عرفان یہ بتلایئے پاکستان آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

"جی بہت اچھا لیکن یہاں کے لیڈروں نے یہاں کی یہ حالت بنا دی ہے کہ اب تو کوئی کمانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"تو آپ کے خیال میں حالات کس طرح ٹھیک ہو سکتے ہیں؟"

"اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم سب مل کر اپنے دشمن کو پہچانیں اسے شکست دیں تاکہ دشمن کا منہ کالا ہو جو یہاں کے حالات بگاڑ رہا ہے۔" اس بچے کی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے ایک چمک سی تھی جو شاید پاکستان سے محبت کی علامت تھی۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان کے ہر بچے کے دل میں اپنے ملک کے لئے محبت ہے چاہے وہ جھونپڑی میں رہنے والا بچہ ہو یا بنگلے، کوٹھی کا۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں بالکل پھول کی طرح، جس طرح پھول کی خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھتا ہے۔ اسی طرح بچوں سے ہمارا ملک پاکستان بھی مہکتا رہے گا۔

پہلے باٹا پھر سکول
دلچسپ تحائف
Bata
پہلے باٹا پھر سکول
ایک دیرینہ روایت۔
اِس بار جب آپ باٹا سکول شوُز خریدیں تو ساتھ میں
منفرد تحائف بھی حاصل کریں۔ لیدر سکول شوُز کے ساتھ ایک خوبصورت
فرزبی اور کینوس سکول شوُز کے ساتھ ایک انوکھا سٹنٹ پلین بالکل مُفت!
آج ہی اپنے قریبی باٹا شوُ سٹور پر تشریف لائیں اور باٹا سکول شوُز کی
جدید ورائٹی سے اپنے لیے سکول شوُز کا انتخاب کریں۔
یہ پیشکش سٹاکس کی دستیابی تک محدود ہے۔
Bata®
the world at your feet
BPL-90
Interflow

خستہ کرارا ۔ نیا چٹخارہ
فریش ویل
بیسٹ نمکین
RAFIX
Freshwel
Best Namkeen
NET WT. 200 GMS
بیسٹ نمکین کی مکمل ورائٹی کراچی میں
فریش ویل کے تمام سیلز پوائنٹس پر دستیاب ہے
کراچی سے باہر رہنے والے اپنے دوست احباب سے فرمائش کریں

سیاستدانوں کو خط لکھیئے

ھمارے ملک کے حالات جیسے بھی ھیں آپ کے سامنے ھیں

یہ ملک آپ کا ہے۔ مستقبل میں اس کی باگ ڈور آپ کو سنبھالنی ہے

ملک خوشحال ھوگا تو آپ خوشحال ھوں گے اور خدانخواستہ اس کے مسائل بڑھتے ھیں تو گویا آپ کی پریشانیوں میں اضافہ ھوگا چونکہ ملک کا نظام چلانے اور اسے ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری بہرحال سیاستدانوں کی ھوتی ہے۔ اگر سیاستدان اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تو یہ آپ کا بھی فرض ہے کہ آپ انہیں ان کی ذمہ داریاں بصد عزت و احترام یاد دلائیں

ھم آپ کو دعوت دیتے ھیں کہ

آپ ملکی سیاستدانوں میں سے جس سیاستدان سے جو کچھ بھی اپیل کرنا چاہتے ہوں ایک خط کی صورت میں ہمیں لکھ بھیجیئے ہم اسے شائع کریں گے ...

(۱) خط مختصر اور جامع ہونا چاہیئے۔ (۲) اس میں قومی مسائل کی نشاندہی ہونی چاہیئے

(۳) اسے فرقہ وارانہ نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات پر مشتمل نہیں ہونا چاہیئے۔

سیاستدانوں کو خط لکھیئے

اور ملکی حالات کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ادا کیجیئے

وطن عظیم ہے اسے

وطن عظیم ہے اسے عظیم تر بنائیں گے
وطن کی خاکِ پاک ہی سے کہکشاں سجائیں گے
عظیم تر بنائیں گے

ہمارا مان ہے یہی
ہماری شان ہے یہی
وطن کا ہم پہ قرض ہے، یہ قرض ہم چکائیں گے
عظیم تر بنائیں گے

سفیر الفتوں کے ہم
اٹھائے عزم سے قدم
سبق محبتوں کا ہم، ہر ایک کو پڑھائیں گے
عظیم تر بنائیں گے

جو ظلمتوں سے ہے ٹھنی
تو ہم برائے روشنی
چراغ دم بدم نئے، جلائیں گے بڑھائیں گے
عظیم تر بنائیں گے

سفر میں لاکھ خار ہوں
رکاوٹیں ہزار ہوں
جو ٹھان لی کریں گے ہم، کہا ہے جو نبھائیں گے
عظیم تر بنائیں گے

جاوید خالد

ڈنڈا ڈولی

ان صفحات میں ہر ماہ ہم کسی ایک موضوع کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کرتے ہیں۔

انعامی لطیفہ

بیربل کے اکسانے پر اکبر بادشاہ نے ملا دو پیازہ سے کہا "تم ہمارے ایک سوال کا جواب دو۔ اس نے کہا بتاؤ کتے ہندو ہیں یا مسلمان؟ ملا دو پیازہ نے کہا "حضور ان کے آگے چند ہڈیاں ڈال دیں اگر یہ علیحدہ ہو کر کھائیں گے تو ہندو ہوں گے اگر مل کر کھائیں گے تو مسلمان ہوں گے۔ ہڈیاں ڈالی گئیں تو سب کتے ایک ایک ہڈی اٹھا کر بھاگ گئے۔

عامر تاج...... پشاور

سردار جی کے ایک لکھنوی دوست نے ان کی دعوت کی اور کھانے کے بعد لذیز پان کی گلوری پیش کی۔ سردار جی نے پہلی مرتبہ پان کھایا تھا۔ وہ بار بار پیک کی پچکاریاں مار کر قالین کا ستیاناس کر رہے تھے۔ حالانکہ چاندی کا اگال دان قریب ہی رکھا تھا۔ ان صاحب کے اشارے پر ملازم نے اگال دان اٹھایا اور جدھر سردار جی تھوکنے کی کوشش کرتے وہ اگال دان سامنے کر دیتا۔ آخر سردار جی کو غصہ آیا کہنے لگے۔

"اوئے اسے ہٹاؤ سامنے سے، نہیں تو میں اسی میں تھوک دوں گا۔"

روبینہ منظور...... خانیوال

مولانا محمد علی جوہر شریفوں کے اتنے شوقین تھے کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے باوجود انہیں کھانے سے باز نہ

آ۔تے تھے۔ ایک بار علی گڑھ میں شریفے کھا رہے تھے۔ شریفوں کے بیج ادھر ادھر پھینکنے لگے۔ کسی نے کہا کہ ساری جگہ شریفے اُگ آئیں گے۔ مولانا نے فوراً جواب دیا، "اچھا ہے علی گڑھ میں شریفوں کی بہت کمی بھی ہے۔"

مرسلہ۔ اکرم سیال توقیر

پانی کی قلت سے ایک روز مولانا عبدالمجید سالک پریشان ہو گئے۔ پطرس بخاری کو جب ان کی پریشانی کا علم ہوا تو وہ پانی کی کئی بالٹیاں اپنی کار میں رکھ کر مولانا کی کوٹھی میں لے گئے اور سالک صاحب سے کہنے لگے۔ "دیکھئے حضور آپ کو پانی پانی کرنے کے لئے حاضر ہو گیا ہوں۔" سالک صاحب نے فوراً جواب دیا، "پطرس صاحب آپ تو کیا یہاں بڑے بڑے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔"

مرسلہ۔ اعزاز احسن...... اسلام آباد

ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے اعلان کیا کہ مجھے کوئی شخص پھل کھلائے اگر مجھے پسند آیا تو پھل کے وزن کے برابر اشرفیاں انعام ملیں گی۔ ورنہ وہ پھل اس شخص کو ثابت نگلنا پڑے گا۔

مسلمان فالسہ لایا جو پسند نہ آنے کے باعث اسے ثابت نگلنا پڑا۔ بعد میں سکھ ایک سیب لایا بادشاہ نے چکھ کر کہا"یہ تو بہت بدمزہ ہے تم اس کو ثابت کھاؤ"۔ سکھ پہلے رویا پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

کہیے کیسی رہی

بادشاہ کے دریافت کرنے پر جواب ملا"میں رویا تو اس لئے کہ ثابت سیب کیسے کھاؤں گا اور ہنسا اس لئے کہ ہندو تربوز لے کر آرہا ہے"۔

صائمہ ناز عالم...... بوریوالہ

ایک آدمی کے پاس ایک دنبہ تھا جسے اس نے ایک بار بھی نہیں نہلایا تھا اور نہ ہی اس کی اُون اتروائی تھی جس کی وجہ سے دنبے میں سے بہت بدبو آتی تھی۔ اس نے ہندو مسلمان اور انگریز کو اپنے گھر مدعو کیا اور کہا جو بھی اس دنبے کے ساتھ ایک رات گزارے گا اسے ۲۰۰ روپے انعام دوں گا۔ مسلمان اور انگریز تو باری آنے پر اندر گئے مگر تھوڑی دیر بعد بو سے تنگ آکر باہر آگئے مگر جب ہندو اندر گیا تو تھوڑی دیر بعد دنبہ مَیں مَیں کرتا ہوا باہر آگیا۔

ریحانہ شکیل ...... کراچی

ایک سردار جی (سکھ) کو امریکہ جانے کا اتفاق ہوا وہاں گئے تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ سردا کھایا

جائے چنانچہ وہ ایک اسٹور پر گئے (امریکہ کے اسٹور میں ہر چیز موجود ہوتی ہے) اور وہاں جب پہنچے تو ان سے پوچھا کہ آپ کو کیا چاہئے تو وہ سوچنے لگے کہ سردے کی انگلش کیا ہو گی کیونکہ سرد کی انگلش کولڈ ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ کولڈا ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے کولڈا مانگا۔ اسٹور والا حیران ہوا کہ یہ کیا چیز ہے اگر وہ کہتا کہ نہیں ہے تو اس کی بدنامی ہوتی' چنانچہ اس نے ڈکشنری وغیرہ دیکھی لیکن یہ لفظ نہ ملا۔ دو گھنٹے گزر گئے تو ان سردار جی کو دور سے ایک دوسرے سردار جی آتے نظر آئے۔ قریب آنے پر ان سے پوچھا کہ اسٹور میں کیا لینا ہے تو سردار جی نے کہا میں نے ان سے دو گھنٹے سے کولڈا مانگا ہے ابھی تک نہیں ملا۔ سردار جی پہلے تو خوب ہنسے پھر بولے "تمہیں تو صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں میں نے دو مہینے سے ان سے ہیٹا (گرما) مانگا ہوا ہے وہ نہیں ملا۔"

علی رضا زیدی۔ لاہور

ایک مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے مشہور کالم 'افکار و حوادث' میں لکھا "پنڈت ہری چند اختر کے نام میں بڑی مناسبت ہے "ہری چند اختر" یعنی سبز چاند ستارہ۔ کالم چھپنے کے تھوڑی دیر بعد پنڈت ہری چند اختر مولانا سالک کے دفتر میں پہنچ گئے اور مولانا سالک سے کہا "مولانا اٹھ کر سلامی دیں پرچم اسلام آپ کے سامنے ہے۔

یاسمین ناز...... کراچی

دس سال بعد پاکستان میں گداگری کا متوقع معیار

ایک سکھ کار چلا رہا تھا۔ اس نے نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ راستے میں ایک گدھا آگیا۔ سکھ دور ہی سے چلانے لگا۔

"اوئے ہٹ جا راستے سے۔ نیچے آگیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔"

سید اظہر علی۔ میرپور خاص

ایک پاکستانی، ایک امریکن اور ایک روسی ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں روسی نے کہا کہ اپنے اپنے ملک کی حیرت انگیز باتیں بتائیں۔ روسی نے کہا۔ "ہماری آب دوزیں سمندر کی تہہ کے ساتھ چلتی ہیں" امریکن نے پوچھا کیا بالکل تہہ کے ساتھ؟ روسی نے کہا نہیں تھوڑا سا اوپر۔ پھر امریکی نے کہا ہمارے جہاز آسمان کے ساتھ اڑتے ہیں۔ روسی نے پوچھا کیا بالکل آسمان کے ساتھ؟ امریکی نے کہا' نہیں تھوڑا سا نیچے، پھر پاکستانی کی باری آئی تو پاکستانی نے کہا' ہم ناک کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ امریکی اور روسی دونوں نے حیرت سے پوچھا "بالکل ناک کے ساتھ" پاکستانی نے کہا' نہیں تھوڑا سا نیچے۔

ذیشان...... حضرو

اڑیل کہیں کا

ماحول رنگین تھا۔ مجلس احباب جمی ہوئی تھی اور پرلطف باتیں ہو رہی تھیں۔ گاندھی جی نے مولانا محمد علی جوہر سے مخاطب ہو کر ازراہِ مذاق کہا۔ "آپ تین بھائی ہیں ان میں سے دو شاعر ہیں۔ آپ جوہر ہوئے آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی گوہر ہوئے۔" اور تیسرے بھائی شوکت علی کیا ہوئے۔

مولانا محمد علی جوہر نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ انہیں شوہر کہہ لیں۔"

محمد شاہد صدیق طور...... صادق آباد

ایک سکھ رات کے وقت موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلی تو رک کر اس نے کوٹ الٹ کر پہن لیا اور بٹن پیچھے لگا لئے اور اس نئی ترکیب پر خوش ہوا کچھ دور گیا تھا کہ اس کی موٹر سائیکل پھسل گئی تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ جمع ہو گئے تو قریب کھڑے آدمی سے ماجرا دریافت کیا اس نے کہا کہ "سردار صاحب کی گردن مڑ گئی تھی میں نے صحیح کر دیا جب سے کچھ نہیں بولتے۔"

محمد شاہد..... ناظم آباد کراچی

ایک سردار جی اپنی بلّی کو نہلا رہے تھے۔ ایک آدمی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اس نے سردار جی سے کہا "سردی میں بلّی کو نہ نہلاؤ یہ مر جائے گی" لیکن سردار جی نے اس کی بات نہ مانی۔ واپسی پر اس شخص نے دیکھا کہ بلّی ایک طرف مری پڑی ہے اور سردار جی رو رہے ہیں۔ وہ بولا۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا، نہلانے سے یہ مر جائے گی"..... سردار جی فوراً تنک کر بولے "یہ نہلانے سے نہیں مری، نچوڑنے سے مری ہے۔"

اصغر علی...... کراچی

دیکھو یہ بات کسی کو بتانا نہیں

دلدل

قسط نمبر ۵

حمید کاشمیری

راشد کا باپ رمضان ڈرائیور ہیروئن پینے کا عادی تھا۔ راشد کو بھی ویڈیو گیم کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتا۔ اس کی ماں ان دونوں باپ بیٹوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان رہتی۔ ایک روز جب راشد حسب معمول ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا، اس کی ماں روتی پیٹتی وہاں آئی اور یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد راشد کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس نے تمام بُری عادتوں سے توبہ کرلی۔ تعلیم حاصل کرنا تو اس کے لئے ممکن نہ تھا، البتہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اس نے اپنے والد کے دوست رحمت مستری کی ورکشاپ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ آئے دن کے ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ راشد کا گھر توبفرزون کے علاقے میں تھا اور ورکشاپ میوہ شاہ قبرستان کے قریب۔ ہر روز آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی ممکنہ بُری خبر سے بچنے کے لئے رحمت مستری نے راشد کی والدہ سے بات کر کے راشد کو رات دن مستقل اپنے ورکشاپ پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دن بھر تو خوشی خوشی کام کر لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ پہلی رات کاٹنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اس آسیب زدہ ماحول میں ڈر رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خوف کی ایک لہر بار بار اس کے بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی آخر کار وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے اٹھ بیٹھنے سے اس کے ساتھی بھی اٹھ بیٹھے اور یوں خوفزدہ ہونے پر اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن راشد سچ مچ ڈر رہا تھا اس پر ان لوگوں کی تلقین کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب وہ منہ لپیٹ کر سو گئے تو راشد تکیہ اور چادر بغل میں دبا کر ورکشاپ کی چھت پر

چڑھ گیا...... کافی دیر ادھر اُدھر کے خیالات اسے ستاتے رہے۔ پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا نجانے رات کا کونسا پہر تھا جب وہ ہڑبڑا کر اٹھا...... اس نے دیکھا کہ چند لوگ میت گاڑی میں سے اترے اور ایک میت کو اٹھا کر قبرستان کے اندر لے گئے جہاں انہوں نے اس کفن پوش کو ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں اتار دیا...... لیکن راشد نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ قبر میں اتاری جانے والی چیز لاش نہیں بلکہ لکڑی کی دو پٹیاں تھیں۔

صبح سویرے سب سے پہلے اکو کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا تو راشد کو نہ پا کر پریشان ہو گیا۔ اسلم اور گولا بھی جاگ گئے اور انہوں نے راشد کو چھت پر سوتا ہوا دیکھ لیا۔ ان کے جگانے پر راشد نیچے اترا اور رات کا سارا واقعہ انہیں سنایا۔ مگر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تینوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ تھوڑی دیر بعد استاد بھی ورکشاپ پر آگئے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب تھے۔ شاہ جی۔ یہ چاروں شاہ جی ہی کی کار کو ٹھیک کر رہے تھے۔ گولے نے استاد کو بھی راشد کے بارے میں بتایا اور استاد کے پوچھنے پر راشد نے ایک بار پھر رات والا واقعہ دہرایا۔ اسے سن کر استاد سے زیادہ شاہ جی چونکے لیکن بات ٹال گئے۔ گاڑی کی ٹرائی لینے کے لئے شاہ جی اپنے ساتھ راشد کو لے گئے اور راستے میں تمام حالات معلوم کئے۔ راشد نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ شاہ جی نے اسے اپنا بنگلہ دکھایا اور کسی بھی ضرورت کے وقت اپنی مدد کا یقین دلایا۔ راشد واپس آکر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ رات کے وقت اسے کسی ضرورت سے قبرستان جانا پڑا تو واپسی میں عیسٰی گورکن سے ملاقات ہو گئی۔ عیسٰی گولے کا باپ تھا۔ اور اسے بھی راشد کی زبانی رات والے قصّے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اسے ایک تازہ کھدی ہوئی قبر کے پاس لے گیا اور اسے زبردستی قبر میں گرا کر اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ باوجود کوشش کے خوف کی وجہ سے راشد کی آواز نہ نکل سکی۔

راشد قبر میں پڑا تھا اور عیسٰی گورکن اسے دھمکیاں دینے کے علاوہ دھیرے دھیرے مٹی اس کے اوپر ڈال رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ چیخے یا زور لگا کر مٹی کے اس ڈھیر سے باہر نکل جائے مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔ اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا لیکن پھر قدرت کو اس پر رحم آگیا۔ عیسٰی گورکن کی ننھی بچی نوشی کہیں سے اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آنکلی۔ وہ راشد کو زندہ دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہوئی مگر عیسٰی نے بات بنائی کہ وہ تو قبر کا ناپ لے رہا تھا۔ نوشی کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی۔ عیسٰی نے اسے قبر سے نکالا اور دھمکیاں دے کر بھگا دیا۔ راشد کی کیفیت بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ وہ تاریک سڑک پر چلا جا رہا تھا اب اسے کسی چیز کا خوف نہیں رہا تھا۔ وہ ایک چائے خانے پر پہنچا۔ اس نے چائے پینے کے دوران نشہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک بوڑھے ہیروئنچی کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔ وہ دس روپے مانگ رہا تھا۔ راشد نے اسے دس روپے دیئے تو وہ فوراً نشے کے حصول کے لئے وہاں سے بھاگ گیا۔ اس نشے کے عادی شخص کا ایک معصوم بچہ جو اسے گھر لے جانے کے لئے آیا تھا رونے لگا۔ امجد سے گفتگو کے دوران راشد کو پتہ چلا کہ امجد کی کہانی بھی بالکل راشد جیسی ہے۔ راشد افسردہ ہوا اور وہاں سے واپس آگیا۔ راستے میں اسے ایک کار والے نے روکا اور کار میں بٹھا لیا۔ یہ شاہ جی تھے۔ راشد نے شاہ جی کو بھی تمام واقعات سنائے۔ شاہ جی فوراً عیسٰی گورکن کے گھر پہنچے اور اسے دھمکی دی کہ اگر آئندہ اس نے راشد کو تنگ کیا یا اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اس کی خیر نہیں ہو گی۔ ابھی یہ لوگ عیسٰی کے گھر سے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ کسی جانب سے دو فائر ہوئے اور عیسٰی خون میں لت پت زمین پر گر پڑا۔

شاہ جی بڑی تیزی کے ساتھ گاڑی ریورس کر کے پیچھے لائے۔ فائرنگ کی آواز سن کر محلے کے اور لوگ بھی باہر نکل آئے تھے جن کی مدد سے شاہ جی نے جلدی جلدی خون میں لتھڑے عیسٰی گورکن کو اپنی گاڑی میں ڈالا راشد نے بھی مدد کی اور بہت تیزی سے زخمی کو لے کر ہسپتال کی طرف گاڑی دوڑائی۔ لیکن بے سود ہسپتال کی ایمرجنسی میں جب پہنچے تو عیسٰی مر چکا تھا۔ غالباً وہ راستے میں ہی مر گیا تھا۔ یا ممکن ہے گولیاں لگتے ہی اسی جگہ پر اس نے دم دے دیا ہو۔ عیسٰی کی موت سے پورے علاقے میں ایک سنسنی اور

خوف وہراس پھیل گیا۔ راشد بہت اداس ہو گیا تھا۔ اگلے دن مستری رحمت سمیت علاقے کے تمام لوگ عیسیٰ گور کن کے گھر میں سوگ کے لئے جمع تھے جہاں راشد نے بھی پورا دن اپنے ساتھیوں اکّو اور اسلم کے ہمراہ گولے کو تسلیاں دینے میں گزار دیا۔ اور پولیس شاہ جی کی نگرانی میں عیسیٰ کے قتل کی چھان بین اور تفتیش میں مصروف رہی۔

"دیکھو مستری رحمت اس لڑکے کی زندگی کو اب اور زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔" اگلے دن شاہ جی نے مستری رحمت کو راشد کی زندگی کے خطرے سے متعلق آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "منشیات کے سوداگروں نے یہاں اپنی جڑیں بہت مضبوط کر لی ہیں ابھی وہ مزید قتل و غارت گری کریں گے۔"

"اگر بولو شاہ جی تو اسے واپس اس کی ماں کے پاس بھیج دوں؟" رحمت مستری نے رائے دی۔

"نہیں استاد ...." راشد نے بات سن لی اور پھر شاہ جی سے مخاطب ہو کر بولا "نہیں شاہ جی، میرے اندر سے ڈر نکل گیا ہے سارا۔ میں اماں کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں کام کروں گا۔ اور ان مجرموں کو پکڑنے میں آپ کی مدد کروں گا۔"

"لیکن بیٹے تمہاری جان کو خطرہ ...." استاد رحمت نے کہنا چاہا۔

"خطرہ تو میرے لئے گھر میں بھی ہو گا استاد ...." راشد استاد کی بات کاٹ کر بولا۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے استاد ...." شاہ جی نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا "کیونکہ یہ ان کا اب واحد چشم دید گواہ ہے۔"

"چشم دید گواہ ...." استاد نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں۔ چشم دید گواہ۔" شاہ جی نے جواب دیا۔ اور راشد کا ہاتھ پکڑ کو اسے ساتھ لے گئے اس وقت کارخانے پر صرف شاہ جی، رحمت مستری اور راشد تھے اسلم اور اکّو کسی گاڑی پر کام کر رہے تھے اور گولا اپنے باپ کے سوگ میں گھر سے ہی نہیں نکلا تھا۔ کیوں کہ گولے کی ماں کے علاوہ اب گھر میں صرف گولا اور چھوٹی نوشی رہ گئے تھے اور برادری کے لوگ گولے کے پاس تعزیت کے لئے آ جا رہے تھے جس کی وجہ سے گولا گھر پر ہی موجود تھا۔ شاہ جی راشد کو کچھ دور اپنے ساتھ لے گئے اور پھر دور کھڑی گاڑی میں جب دونوں بیٹھ گئے تو شاہ جی نے گاڑی روک رکھی اور راشد سے کہنے لگے۔

"دیکھو راشد۔ وہ قبر جس میں تم نے اس رات کو مردے کے علاوہ کچھ اور چیز دفن ہوتے دیکھی تھی جانتے ہو وہ چیز کیا ہے" شاہ جی نے بہت راز داری سے اور بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"سر مجھے پہلے تو اندازہ نہیں تھا لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں اس میں کیا دبایا گیا ہے۔" راشد کسی

پولیس کے سراغ رساں کی طرح بولا "ہیروئین۔" اور پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا "انہوں نے اسے قبر میں کیوں دفن کیا؟"

"انہوں نے اسے وہاں محفوظ جگہ پر اسٹور کر لیا ہے۔" شاہ جی نے جواب دیا اور پھر مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے، "دیکھو بات یہ ہے کہ ان کی جب کنسائنمنٹ آرہی تھی تو پولیس کو پیشگی اطلاع مل گئی تھی کہ کب کونسے ٹرک اور کس راستے سے یہ کنسائنمنٹ کراچی پہنچ رہی ہے۔ لہٰذا ان کو پکڑنے کے لئے ہم نے جال بچھایا اور راستے میں ایک جگہ خفیہ چوکی قائم کر لی لیکن فجر ہو گئی ان کو بھی اطلاع مل گئی کہ ہمیں خبر ہو گئی ہے۔"

"سر ان کو کیسے اطلاع مل گئی کہ آپ کو خبر ہو گئی ہے؟" راشد نے تجسّس سے ایک سوال کیا۔

"پولیس میں بھی بہت سے لوگ ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو مال کھا رہے ہیں سارے پولیس افسر میری طرح نہیں ہوتے راشد۔" شاہ جی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"کاش سارے پولیس افسر آپ کی طرح ہو جائیں!" راشد نے ایک معصوم سی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اسے فوراً احساس ہوا کہ اس نے بیچ میں سوال کر کے شاہ جی کی بات کو روک دیا ہے، "پھر کیا ہوا سر؟" اس نے دوبارہ تجسّس سے پوچھا۔

"پھر ہوا یہ کہ اسمگلرز نے اپنی ٹریفک کا راستہ تبدیل کر دیا اور پولیس کو ناکامی ہوئی۔" شاہ جی بولے اور کہنے لگے، "لیکن پولیس کو یہ معلوم تھا کہ مال کہاں جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ مال اس علاقے کے مشہور اسمگلر سردار آسمانی کی ملکیت تھا لہٰذا پولیس نے اسی رات اور اگلے دن بھی سردار آسمانی کے گوداموں پر چھاپہ مارا لیکن مال بر آمد نہیں ہوا۔" وہ مایوسی سے بولے۔

"مال کہاں گیا سر............" راشد نے پھر تجسّس سے پوچھا حالانکہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"اسی قبر میں............" شاہ جی نے جواب دیا۔ ہمیں پہلے بھی شبہ تھا کہ قبروں میں کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن جب تم نے اپنی آنکھ سے دیکھا تو ہمیں پورا یقین ہو گیا............ کہ یہاں کچھ مشکوک قبریں بھی ہیں۔"

"تو سر آپ اس قبر کو کھودتے کیوں نہیں ہیں؟" راشد نے پھر ایک سوال کیا۔

"قبر کھودنا آسان بات نہیں بیٹے............ اس کے لئے عدالت سے اجازت لینی ہو گی اور عدالت سے اجازت لینے کے لئے پکّا ثبوت چاہئے چشم دید گواہ۔ جو عیسیٰ گور کن ہو سکتا تھا۔ یا پھر تم رہ گئے ہو۔" شاہ جی نے اپنی بات پوری کی اور راشد کے جسم میں خوف سے ایک جھرجھری سی پیدا ہو گئی لیکن راشد نے اپنا خوف

ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تھوڑی دیر کیلئے دونوں خاموش ہو گئے شاہ جی کی گاڑی مسلسل ایک تنہا سی جگہ درختوں کے جھنڈ میں قبرستان کے کنارے کھڑی تھی جہاں دونوں چپ چاپ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران ایک مشتبہ جیپ دو مرتبہ شاہ جی کی کار کے قریب سے گذری جسے دیکھ کر شاہ جی بہت چوکس ہو گئے لیکن انہوں نے راشد پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ کوئی مشتبہ بات ہو رہی ہے۔

"دیکھو راشد..............." وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "کچھ جُرم ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق زیادہ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا اس میں ایک دو یا چند افراد ملوث ہوتے ہیں۔ لیکن منشیات بیچنے والے مجرم پوری ایک نسل کو ہی نہیں آنے والی نسلوں کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔"

"جی سر..............." راشد نے اعتراف میں سر جھکایا اور یہ اس کا اپنا تجربہ بھی تھا۔

"اور میں اس علاقے میں صرف اس لئے مامور کیا گیا ہوں کہ منشیات فروشوں کا خاتمہ کروں۔ اور میں نے ان کو ختم کرنے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔" شاہ جی ایک عزم کے ساتھ بولے۔

"اس کام میں مَیں بھی آپ کے ساتھ ہوں سر۔" راشد نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"شاباش بیٹے..............." شاہ جی نے راشد کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"سر کیا آپ نے وہ قبر دیکھی ہے..............." راشد نے تجسس سے پوچھا۔ دو دن سے راشد کے اندر یہ سوال کلبلا رہا تھا کیونکہ اس کیس میں اتنی دلچسپی لینے کے باوجود شاہ جی نے ابھی تک راشد سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ قبر کہاں ہے۔

"نہیں..............." شاہ جی نے نفی میں جواب دیا۔" چلو وہ قبر دکھا دو مجھے۔" یہ کہہ کر شاہ جی نے کار اسٹارٹ کی اور تھوڑا سا آگے لے جا کے دیوار کے سائے میں کار کو ایک سائیڈ میں لگا دیا جہاں سے دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور راستہ قبرستان کے اندر جاتا تھا۔ وہ اندر جا کے دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑے راشد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ راشد کا خیال تھا کہ وہ شاہ جی سے آگے نکل کر اس قبر کی نشاندہی کرے گا جو مشکوک تھی لیکن اس وقت راشد کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب شاہ جی سیدھے جا کے ایک قبر پر کھڑے ہوئے جس پر تازہ تازہ پھول بھی پڑے تھے اور کوئی پانی بھی ڈال گیا تھا۔

"کیا یہی قبر ہے وہ..............." شاہ جی نے پوچھا۔

"جی ہاں............... بالکل وہی ہے۔" راشد نے جواب دیا اور حیرت زدہ ہو کر پوچھنے لگا "سر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"جس دن تم نے یہ انکشاف کیا تھا میں نے اسی دن اپنے اندازے سے اس قبر کی نشاندہی کر لی تھی

میں چاہتا تھا کہ عیسیٰ گورکن خود اعتراف کرے کہ اس نے کسی کے کہنے سے اس قبر میں مردے کی بجائے کوئی اور چیز دفن کی ہے"شاہ جی نے قبر پر پڑے پھولوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر اس رات جو لوگ میّت کے ساتھ تھے ان کو میں نے سامان قبر میں اتارتے ہوئے غور سے دیکھا تھا عیسیٰ ان میں نہیں تھا"۔ راشد اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"گورکن ہر تدفین کے وقت قبر پر موجود رہتا ہے تم نے دیکھا نہیں ہوگا"شاہ جی نے خیال ظاہر کیا راشد بھی آگے سے چپ ہو گیا پھر اچانک شاہ جی نے دیکھا ایک نوجوان گورکن کندھے پر پھاوڑا رکھے قبروں کے بیچ میں سے آرہا ہے شاید وہ کوئی قبر کھود کر آرہا تھا۔

"اسے جانتے ہو؟" .... شاہ جی نے گورکن کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں آرہا ہے شاید اسے ادھر قبرستان میں ہی دیکھا ہوگا"۔ راشد نے جواب دیا۔

"یہ عیسیٰ گورکن کا مددگار ہوتا تھا" .... شاہ جی نے کہا "یہ میت اتارتے وقت عیسیٰ کی مدد کیا کرتا تھا"۔ پھر جب وہ قریب سے گذرنے لگا تو اس نے شاہ جی کو سلام کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" شاہ جی نے سلام کا جواب دینے کے بعد گورکن سے پوچھا۔

"رجاق"۔ گورکن بولا۔

"رزاق تم عیسیٰ کے ساتھ ہوتے تھے تم نے کھودی تھی یہ قبر؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"جی صاحب جی میں تو ہر قبر عیسیٰ بھائی کے ساتھ کھودتا تھا یہ بھی میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔" رزاق نہایت سادگی سے بولا۔

"رزاق اس قبر میں کون دفن ہے؟" شاہ جی نے اچانک سوال کیا۔"میرا مطلب ہے کس کی قبر ہے"؟"صاحب جی یہ تو میرے کو مالوم نہیں ..... کوئی لیڈی ہے"۔ وہ معصومیت سے بولا۔

"کیا تم تدفین کے وقت موجود نہیں تھے؟" شاہ جی نے سوال کیا۔

"نہیں صاحب جی"۔ رزاق کہنے لگا "جب قبر تیار ہو گئی تو عیسیٰ بھائی نے بولا اب ہم لوگوں کا کام نہیں ہے یہ لیڈی کی قبر ہے میت والے بہت باپردہ لوگ ہیں غیر مرد کو قبر پر نہیں رہنے دیتے خود دفن کریں گے اس لئے ہم لوگوں کو اب یہاں سے چلے جانا ہے۔ عیسیٰ بھائی نے میرے کو بولا اور پھر میں قبر سے چلے گیا تھا"۔ وہ ایک ہی سانس میں بولا۔

"اور عیسیٰ" .... شاہ جی نے جیسے باقاعدہ تفتیش شروع کر دی ہو۔"عیسیٰ بھی چلا گیا تھا؟"

"عیسیٰ کا میرے کو پتہ نہیں جی"۔ اب رزاق کچھ گھبرا سا گیا تھا؟ شاید وہ بھی چلا گیا ہوگا بے

چارے کو ہروبرو گولی لگ گیا۔ چچ چچ اس کا کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھا خدا جانے کس نے مار دیا غریب کو۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں ایک بچہ ہے، بی بی ہے...... چچ چچ" رزاق افسوس کرتے ہوئے گردن ہلاتا چلا گیا راشد اور شاہ جی بھی سنجیدہ ہوگئے اچانک مشتبہ جیپ کو ایک بار پھر شاہ جی نے سڑک سے گذرتے دیکھا۔

"آؤ اب یہاں سے چلے چلیں......" شاہ جی نے راشد کا کندھا چھو کر کہا اور دونوں فوراً وہاں سے چلے گئے۔

O..........O..........O

"بیٹے تم چپ چپ کیوں ہو؟ اتنا خاموش میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" اگلا دن اس کی چھٹی کا تھا اور چھٹی کا دن گذارنے جب راشد ماں کے پاس گیا تو ماں اسے خاموش اور اداس دیکھ کر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگی۔

"کوئی بات نہیں ہے ماں جی بالکل ٹھیک ہوں میں۔" اس نے پریشانی چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"مستری رحمت نے کچھ کہا ہے کیا؟" ماں کی تشویش ختم نہیں ہوئی۔

"نہیں ماں جی مستری رحمت تو بہت اچھے ہیں یہ پیسے لے کر آیا ہوں اس نے پورا سو روپے کا نوٹ ماں کے سپرد کیا۔ چھوٹی بہن رابعہ کے لئے بسکٹ اور چوڑیاں وغیرہ لے کر آیا تھا وہ اسے دیں اور رات اپنے گھر کے اندر بہت خوش باش رہ کر گذارنے کی کوشش کی لیکن صبح جب وہ واپس کام پر گیا تو اس کی ماں خاصی پریشان تھی کیوں کہ راشد کوشش کے باوجود اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکا تھا۔

اگلے دن کارخانے پر بھی راشد کا کچھ خاص دل نہیں لگا ان کا ساتھی گولا آج بھی کام پر نہیں آیا تھا کیوں کہ برادری کے لوگ اس کے گھر میں تعزیت کے لئے مسلسل آرہے تھے۔ مستری رحمت اکو اور اسلم نے بھی آج دوپہر کے کھانے کے وقت گولے کے گھر کا چکر لگا لیا تھا اور راشد کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ گولا اپنے باپ کے غلط کاموں سے بالکل بے خبر تھا پھر اسے یہ دیکھ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

عیسیٰ کا گھر بھی بہت واجبی سا تھا، کچا سا دو کمرے کا کوارٹر، جس میں نہ تو غسل خانہ نہ لیٹرین گندی نالیاں، مچھر مکھیاں، کیڑے مکوڑے ہوا کا کوئی رخ نہیں البتہ اس کے گھر میں برقی سامان کی کچھ چیزیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جو گھر کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً اسے ایک نیا کلر ٹی وی نظر آیا غالباً وی سی آر یا وی سی پی بھی تھا ٹیپ ریکارڈ بھی نیا تھا ایک موٹر سائیکل بھی برآمدے میں رکھی تھی جو اگر نئی نہیں تو پرانی بھی نہیں تھی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ایسی چیزیں تھیں جو قیمتی سامان کہلاتی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں تو ایسی تھیں جو دوبئی اور سعودیہ جائے بغیر بھی اکثر غریب گھروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ راشد کو عیسیٰ گورکن کا

گھر کسی طرح بھی کسی منشیات فروش کا گھر دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس وقت تو اسے مزید حیرت ہوئی جب دوپہر کے وقفے کے دوران وہ اچانک تھوڑی دیر کے لئے قبرستان کے اندر والے کنویں پر گیا تو اسے عیسیٰ گورکن کی ننھی بیٹی اور گولے کی بہن نوشی کچھ پرانی کچی اور پکی قبروں پر پانی ڈالتی دکھائی دی۔ کنویں سے پانی نکالنا اور دو دو ڈول بھر کے اٹھا کے لے جانا نوشی کی عمر اور اس کی ہمت سے بہت بڑا اور مشکل کام تھا۔

راشد اسے ایک قبر کے پاس کھڑا دیکھتا رہا نوشی بھر بھر کے کنویں سے ڈول لائی اس نے تقریباً چار پانچ قبروں پر پانی ڈالا اور پھر ایک نئی قبر پر پانی ڈال کے قبر کے سرہانے بیٹھ گئی اور چھم چھم آنسوؤں سے رونے لگی راشد دھیرے دھیرے اس کے قریب آیا اور چپ چاپ پاس کھڑا ہو گیا نوشی نے آنسو پونچھے اور دھیرے سے سر اٹھا کے راشد کو دیکھا۔

"یہ تمہارے بابا کی قبر ہے؟" راشد کو معلوم تھا کہ یہ عیسیٰ گورکن کی قبر ہے کیوں کہ وہ بھی میت کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

"ہوں......" زشی نے آہستہ سے سر ہلایا اس کے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"یہ باقی قبریں کس کی ہیں جہاں تم نے پانی ڈالا ہے؟" راشد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں..........." نوشی نے لاعلمی ظاہر کی۔

"تو پھر ان پر پانی کیوں ڈالتی ہو؟" راشد نے پوچھا۔

"بابا نے کہا تھا ان قبروں کو روز ٹھنڈا کر دیا کرو...... اس لئے میں ان کو ٹھنڈا کرتی ہوں۔" وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی اور پھر کہنے لگی، "ان کے ہم کو مہینے کے مہینے پیسے ملتے ہیں۔"

"کون دیتا ہے پیسہ..........؟" راشد نے پوچھا۔

"مُردوں کے والی وارث۔" وہ معصومیت سے بولی۔ "بابا کے پاس پانی کا ٹھیکہ تھا۔"

"تم پڑھتی نہیں ہو......؟" راشد نے بڑوں کی طرح سوال کیا جیسے وہ خود بہت پڑھتا ہو یا پڑھا لکھا ہو۔

"نہیں..........." نوشی نے نفی میں سر ہلایا اور پھر کہنے لگی "پتہ ہے میرے بابا مجھ سے کہتے تھے میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ وہ کہتے تھے ہمارے پاس بہت سے پیسے آنے والے ہیں پھر ہم دوسرے مکان میں چلے جائیں گے اور قبرستان چھوڑ دیں گے لیکن بابا.........."

وہ باپ کی قبر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اب رونے سے کچھ فائدہ نہیں صبر سے کام لو۔ اٹھ جاؤ اٹھ جاؤ شاباش" راشد نے کسی بزرگ کی طرح نوشی کو تسلی دے کر قبر سے اٹھایا اور ڈول اس کے ہاتھ میں دے کر گھر روانہ کر دیا۔

وہ بہت ممنون ہو کر راشد کی طرف دیکھتی ہوئی گھر چلی گئی۔

یہ اسی رات کی بات ہے راشد کو پتہ نہیں کیوں خلاف معمول گہری نیند آگئی اس کے برابر میں اکوّ اور اسلم بھی سوئے ہوئے تھے اب وہ گیراج کی چھت پر بھی نہیں گیا تھا شام کو مستری رحمت نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ گیراج کے اندر سو کے دروازہ اندر سے بند کر دے لیکن راشد نے انکار کر دیا اندر سونے سے اسے گھٹن بھی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ بزدلی کا احساس بھی ہو رہا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ دن میں آج کچھ غیر معمولی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ شاہ جی دوپہر کے بعد آئے تھے وہ خاصی تشویش میں مبتلا تھے اور اشارے سے مستری رحمت کو اندر گیراج میں لے گئے جہاں کافی دیر تک دونوں میں کچھ رازداری سے باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد انہوں نے راشد کو اندر بلایا اور راشد سے کہنے لگے۔

"دیکھو راشد تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم اس علاقے سے سماج دشمن لوگوں کو ختم کرنے میں ہماری مدد کرو گے۔" شاہ جی نے کہا۔

"میں نے کب انکار کیا ہے سر............" وہ نہایت پُرعزم طریقے سے بولا تھا۔

"شاباش بیٹے............" انہوں نے راشد کی پیٹھ تھپتھپائی تھی اور پھر کہنے لگے، "ہم نے اس قبر کو کھولنے کے لئے آج عدالت میں درخواست دے دی ہے............ اور یہ سب کچھ ہم نے تمہاری چشم دید گواہی کی بنیاد پر کیا ہمیں جونہی اجازت مل گئی ہم یہ قبر کھولیں گے۔"

"میں گواہی دینے کے لئے تیار ہوں۔" وہ پھر مضبوط ارادے سے بولا۔"میں ان لوگوں سے اپنے باپ کا بدلہ بھی لینا چاہتا ہوں۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" شاہ جی نے تھپکی دی اور وہ راشد کے رویئے سے کافی مطمئن ہو گئے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں سر۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

لیکن راشد کا اطمینان اس وقت نصف رات کو ختم ہو گیا جب اس نے اچانک کچھ غیر معمولی آہٹ سن کر آنکھ کھولی تو اسے منہ پر ڈھاٹے بندھے دو تین آدمی اپنے اوپر جھکے دکھائی دیئے اس وقت اس پر کچھ نیند کا غلبہ تھا کچھ جسم کی تھکن اور بوجھل پن تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا اس نے مدد کے لئے پکارنا چاہا منہ کھولا۔ چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن سب بیکار وہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ بجلی کی سی سرعت سے چمڑے کے بڑے دستانوں نے اس کے منہ کو ڈھک دیا پھر دو تین فولادی ہاتھوں نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ کر لفٹر کی طرح اٹھایا اور پاس ہی کھڑی ایک ایمبولینس قسم کی بند گاڑی میں سوار کر دیا۔

پھر رات کے گہرے اندھیرے کے باوجود اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی اور منہ میں روئی ٹھونس دی گئی اور وین روانہ ہو گئی اسے کچھ پتہ نہیں تھا وین کدھر جا رہی ہے اور اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے، کسی گمنام منزل کی طرف............ (جاری ہے)

ایک باہمت نوجوان محل کی بالائی منزل تک جانا چاہتا ہے پُرخطر راہوں میں کیا آپ اسکے مددگار ہو سکتے ہیں.

مرسلہ: کاشف طاہر ۔ الریاض سعودی عرب

کیا آپ سچّے پاکستانی ہیں

احمد آفتاب

پیارے ساتھیو!

پاکستان آپ کا ہے۔

لیکن کیا آپ بھی پاکستان کے ہیں؟

پاکستانی ہونا آپ کے لئے باعثِ فخر ہونا چاہئے۔ خدا نے آپ کو ایک ملک دیا ہے لوگ آپ کو اس ملک کے حوالے سے جانتے ہیں۔ آپ باہر جاتے ہیں تو آپ کو "پاکستانی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ سفر کرتے ہیں تو آپ کے ہاتھ میں پاکستانی پاسپورٹ ہوتا ہے۔ آپ کی کرکٹ ٹیم کہیں فتح حاصل کرتی ہے تو وہاں سبز ہلالی پرچم لہراتا ہے۔ آپ خوشی سے اُچھل اُچھل کر تالیاں بجاتے ہیں۔ پاکستانی ہونے کی بنا پر خوشی سے پھول جاتے ہیں۔ یوں کچھ نہیں کرتے ہوئے بھی پاکستانی بن جاتے ہیں۔ پاکستان کے وجود، ترقی، بقاء اور استحکام میں آپ کا کوئی کردار نہیں .... آپ پاکستان کے لئے کچھ بھی نہیں کرتے۔ مگر پھر بھی خود کو پاکستانی کہلواتے ہیں۔ کیا آپ کا یہ عمل صحیح ہے؟

آج کے حالات میں عمل کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ جتنا ضروری ہے، پہلے کبھی بھی نہیں تھا .... ہمارے بڑوں کے غلط عمل ہمیں مزید غلطیوں پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب ہم غلط کو بھی صحیح سمجھ کر بہت سکون سے گزرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں بُرائی .... برائی نہیں رہی بلکہ اچھائی بن چکی ہے۔ ہم رشوت لیتے ہیں۔ ٹی وی کا لائسنس نہیں بنواتے۔ ٹیکس ادا نہیں

کرتے۔ بغیر کاغذات کی گاڑیاں چلاتے ہیں۔ پتھراؤ کرتے ہیں۔ گاڑیوں کو آگ لگاتے ہیں، گولیاں چلاتے ہیں، ہم سب کچھ کرتے ہیں.......... مگر یہ نہیں سوچتے کہ ہم کچھ اور نہیں............ بلکہ پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔

ہم نے شروع میں آپ سے پوچھا تھا۔ کیا آپ پاکستان کے ہیں؟ ایسے ہی جیسے آپ سے پوچھا جائے، کیا آپ اپنے امی ابو کے ہیں؟ اگر آپ اپنے امی ابو کے ہیں تو آپ کی چند ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو پڑھنا ہے تاکہ ترقی کر سکیں۔ آپ کو ان کی باتیں ماننی ہیں۔ آپ کو تمیز دار بننا ہے۔ آپ کو گھر کے کام کرنے ہیں۔ صحت مند رہنا ہے اور بُرائیوں سے بچنا ہے۔ یہ ذمہ داریاں پوری کر کے آپ اپنے امی ابو کے ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ یہ فرض پورے نہیں کریں گے۔ تو اپنے امی ابو کا حق ادا نہیں کر سکیں گے۔ وطن کا درجہ بھی والدین کے درجے سے کم نہیں ہوتا۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ اتنا ہی عزیز اتنا ہی قابلِ احترام اور اس سے اتنی ہی چاہت و محبت ہونی چاہئے جتنی والدین سے ہوتی ہے۔

ہم نے اس مرتبہ پھر ایک سوالنامہ ترتیب دیا ہے۔ یہ سوالنامہ آپ کو بتائے گا کہ آپ سچے پاکستانی ہیں یا نہیں؟ پاکستان کے حوالے سے آپ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسے پوری کر رہے ہیں یا نہیں؟ تو مختصر یہ کہ اس سوالنامے کا جواب بتائے گا کہ آپ کتنے اچھے اور کتنے سچے پاکستانی ہیں۔

۱۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ملک کا پورا نام کیا ہے؟

۲۔ آپ بتاسکتے ہیں کہ لفظ "پاکستان" کے معنی کیا ہیں؟

۳۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ملک کیوں بنایا گیا تھا؟

۴۔ کیا آپ اپنے ملک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ (مثلاً اس کی آبادی، محل وقوع، موسم، لوگ، تہذیب و ثقافت وغیرہ کے بارے میں)

۵۔ کیا کسی فوجی کو دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آپ کو بھی فوج میں جاکر اپنے ملک کا دفاع کرنا چاہئے خواہ اس میں آپ کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے؟

۶۔ آپ کہیں جا رہے ہیں۔ آپ کو اپنا پرچم رستے میں گرا دکھائی دیتا ہے: کیا آپ اسے اٹھالیں گے؟

۷۔ آپ امی ابو کے ساتھ فلم دیکھنے گئے ہیں۔ قومی ترانہ بجتا ہے۔ کیا آپ احترام میں اٹھ کھڑے ہوں گے؟

۸۔ آپ کے کوئی بزرگ ملک کے خلاف بول رہے ہیں کیا آپ انہیں شائستگی سے ٹوک دیں گے؟

۹۔ بازاروں میں غیر ملکی اداکاروں کے رنگین کارڈ اور اسٹیکر وغیرہ بکتے ہیں کیا آپ انہیں خریدنے سے انکار کردیں گے؟

۱۰۔ ذرا بتائیے وہ قلم جس سے آپ اسکول کا کام کرتے ہیں ، پاکستانی ہے؟
۱۱۔ کیا آپ ایسے سیاستدانوں کے بیانات ناپسند کرتے ہیں جس میں لسانی اور صوبائی تعصّب کو ہوا دی گئی ہو؟
۱۲۔ الف کا جھگڑا "ب" سے ہو گیا ہے .... "الف" آپ سے "ب" کی شکایت کرتا ہے اور ساتھ ہی "ب" کی قومیت کو بھی لعن طعن کرتا ہے .... آپ سمجھتے ہیں کہ "ب" نے واقعی زیادتی کی ہے لیکن آپ یہ بھی سمجھتے ہیں اس میں "ب" کی قومیت کا کوئی دخل نہیں کیوں کہ اچھے بُرے لوگ تو ہر علاقے اور صوبے میں ہوتے ہیں۔ کیا آپ "الف" کو یہ بات سمجھانا چاہیں گے؟
۱۳۔ ملک کے ایک حصے میں تباہی آتی ہے کیا آپ امدادی کاموں میں حصہ لیں گے؟
۱۴۔ آپ ریڈیو یا ٹی وی آن کرتے ہیں۔ علاقائی زبان کا پروگرام آرہا ہے۔ کیا آپ اسے سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے؟
۱۵۔ کیا مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے آپ یہ فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ تعلیم مکمل کر کے آپ اپنے ہی ملک میں رہیں گے؟
۱۶۔ آپ بس میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک شخص بغیر ٹکٹ کے بیٹھا ہے۔ کیا آپ اس شخص سے ٹکٹ لینے کی درخواست کریں گے؟ یا کیا آپ ٹکٹ چیکر کو بتائیں گے؟
۱۷۔ فرض کیجئے آپ بجلی یا گیس کا بل جمع کرانے جاتے ہیں وہاں ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے کیا آپ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کریں گے؟
۱۸۔ بس میں آپ کو کسی شخص کا بیگ مل گیا ہے۔ کیا آپ اسے واپس کرنے کی کوشش کریں گے؟
۱۹۔ آپ روزانہ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ کیا آپ کے پاس ٹی وی لائسنس ہے؟
۲۰۔ کیا آپ اپنے ملک کی سیر کر چکے ہیں یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں؟
۲۱۔ فرض کیا آپ کے ابو رشوت لیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو تو کیا آپ ان سے احتجاج کریں گے؟
۲۲۔ آپ کے گھر کے سامنے گٹر کا ڈھکنا نہیں ہے۔ کیا آپ اسے بند کرانے کے لئے میونسپل کونسلر سے رابطہ قائم کریں گے؟
۲۳۔ آپ سڑک سے گزر رہے ہیں۔ ایک حادثہ ہو گیا ہے کیا آپ حادثے کے زخمیوں کی مدد کے لئے رک جائیں گے؟
۲۴۔ آپ جلوس میں ہیں۔ پولیس پر پتھراؤ شروع ہو گیا ہے۔ کیا آپ جلوس سے علیحدہ ہو جائیں گے؟
۲۵۔ کبھی آپ نے اپنے دوستوں کو ٹریفک کانسٹیبل پر آوازے کسنے سے منع کیا ہے؟

۲۶۔ آپ کے گھر کے سامنے والے مکان میں ایک مشکوک شخص رہتا ہے۔ کیا آپ تحقیق کر کے پولیس کو مطلع کریں گے؟

۲۷۔ آپ کے بھائی کے پاس پستول ہے۔ کیا آپ اسے واپس کرنے کو کہیں گے؟

۲۸۔ آپ کو ایک بیگ پڑا نظر آتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس میں بم ہے۔ کیا آپ متعلقہ ادارے کو مطلع کریں گے؟

۲۹۔ آپ گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ پیچھے سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز آتی ہے کیا آپ اسے راستہ دیتے ہیں؟

۳۰۔ شہر میں ہنگامے ہوئے ہیں۔ بہت سے زخمیوں کو خون کی ضرورت ہے۔ کبھی کسی ایسے موقع پر آپ خون دینے گئے ہیں؟

۳۱۔ آپ کا کوئی عزیز جرم کرتا ہے۔ آپ یہ بات جانتے ہیں۔ کیا آپ پولیس کو رپورٹ کر دیں گے؟

۳۲۔ آپ امتحان دے رہے ہیں۔ نقل کرنے کا پورا موقع ہے۔ کیا آپ نقل نہیں کریں گے؟

۳۳۔ پارک کی دیوار پر نیا رنگ ہوا ہے۔ اگلی صبح اس پر نعرے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ کیا یہ دیکھ کر آپ کو غصہ آئے گا؟

۳۴۔ آپ کے پاس موٹر سائیکل کا لائسنس نہیں ہے۔ پھر بھی آپ سارے شہر میں گھومتے ہیں۔ آپ کو کبھی اس پر شرمندگی ہوتی ہے کہ آپ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں؟

۳۵۔ آپ پارک کے ہرے بھرے لان میں قدم رکھنا چاہتے ہیں کہ اچانک آپ کی نگاہ تختی پر چلی جاتی ہے لکھا ہے "گھاس پر چلنا منع ہے۔" کیا آپ کے بڑھتے ہوئے قدم رک جائیں گے؟

۳۶۔ ایک پولیس والا آپ کو رکنے کا اشارہ کرتا ہے کیا آپ کو رکنا چاہیئے؟

۳۷۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سرکاری بس کو آگ لگانے یا شیشے توڑنے میں آپ کا اپنا نقصان ہے؟

۳۸۔ آپ کے علاقے میں جمعدار آتا ہے اس کے باوجود کیا آپ اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ گندی گلی میں پھینک دیں گے؟

۳۹۔ کیا آپ نے کبھی کوئی پودا لگایا ہے؟

۴۰۔ سگنل بند ہے۔ آپ سڑک پر تنہا ہیں۔ کیا آپ سگنل کھلنے کا انتظار کریں گے؟

۴۱۔ رات کے ڈھائی تین بجے آپ کے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ پڑوس کا بچہ بیمار ہے، آپ کے گھر پر گاڑی یا موٹر سائیکل ہے۔ کیا آپ پڑوسی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے؟

۴۲۔ آپ کے محلے کے بیچوں بیچ ایک کوڑا گھر ہے جس میں گندگی اور غلاظت سے سارے محلے کی فضا خراب رہتی ہے۔ کیا آپ اس کوڑا گھر کو وہاں سے منتقل کرانے کے لئے لوگوں کو آمادہ کریں گے؟

۴۳۔ کیا آپ ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر دھیمی آواز میں سننے کے عادی ہیں؟

۴۴۔ ڈاکو کسی شخص کو اغواء کر کے گاڑی میں لے جا رہے ہیں۔ آپ نے نمبر نوٹ کر لیا ہے، کیا آپ ذمہ دار اداروں کو اس واقعہ سے مطلع کریں گے؟

۴۵۔ کیا وڈیو سینٹروں کو دیکھ کر آپ سوچتے ہیں کہ ان پر پابندی ہونی چاہئے کیوں کہ ان کے ذریعے غیر ملک کی تہذیب کا پرچار کیا جا رہا ہے؟

۴۶۔ آپ کو عید کے لئے کپڑے خریدنے ہیں۔ کیا آپ غیر ملکی کپڑے خریدنے کے بجائے پاکستانی کپڑے خریدیں گے؟

۴۷۔ کیا مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے آپ پکا ارادہ کرتے ہیں کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ اپنے ہی ملک میں رہیں گے اور آپ کی خدمات اسی ملک کے لوگوں کے لئے ہوں گی؟

۴۸۔ کیا صبح اسکول جاتے ہوئے آپ کو اس لئے بھی جلدی ہوتی ہے تاکہ آپ اسمبلی میں شرکت کر سکیں اور سب بچوں کے ساتھ قومی ترانہ گا سکیں؟

۴۹۔ کیا اخبار میں پریشان کن خبریں پڑھ کر آپ ملک کے مستقبل سے مایوس ہو جانے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک کے حالات کو بہتر بنا دے؟

۵۰۔ کیا کبھی کوئی نامناسب کام کرتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ ایک اچھے پاکستانی کی حیثیت سے آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے؟

سوالنامہ ختم ہوا۔ لیکن سوال ختم نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ یہ سارے سوال آپ کو خود سے آنے چاہئیں۔ ہر لمحہ، ہر موقع پر۔ جب کبھی آپ کو احساس ہو۔ خود سے یہ سوال کیجئے۔ اور ان سارے سوالوں کا سچائی سے جواب دیجئے۔ ہمیں اب سچ کی ضرورت ہے۔ ہم سچ کو جھٹلا جھٹلا کر جھوٹ کو قومی عادت بنا چکے ہیں۔ ساری دنیا میں اپنا قومی وقار کھو رہے ہیں۔ خود ملک میں ہمارے اندر اتحاد نہیں۔ دوسروں کی عزت کرنے کا جذبہ نہیں۔ کوئی کسی کے لئے قربانی دینے پر راضی نہیں۔ غرض ہم سب کچھ ہیں۔ مگر پاکستانی نہیں۔

پیارے بچو! یہ ساری بُرائیاں بڑوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ مگر آپ کو انہیں ختم کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بڑے ہونے کے بعد آپ بھی بُرائیاں اختیار کر لیں۔ اگر آج آپ کو بُرائی کا احساس ہو گیا تو کل آپ

اسے ختم کر سکیں گے۔ اور آپ کو یہ سب ختم کرنا ہے ایک سچا پاکستانی بننا ہے۔

سوالنامے سے جواب حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ہم نمبر دے رہے ہیں۔ ان سے اندازہ لگایئے کہ اس ملک سے آپ کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ ہر سوال کا ایک نمبر ہے۔ اگر جواب "ہاں" میں ہے تو نمبر لکھ لیجئے۔ "نہیں" میں جواب ہے تو نمبر مت لکھئے۔ آخر میں سب نمبروں کو جمع کر لیجئے۔ پاکستانی ہونے کا جواب آجائے گا۔

.... ○ .... ○ ....

.... ۳۵ سے ۴۵ نمبر .... بہت زیادہ محبت وطن - پر خلوص پاکستانی۔

.... ۲۵ سے ۳۴ نمبر .... اوسط درجے کا رویہ۔ اسے درست کیجئے۔

.... ۲۴ اور کم نمبر .... افسوسناک۔ آپ پاکستان کے لئے انتہائی غیر مفید ہیں۔

اے وطن تو نے پکارا

اے وطن تونے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے ، تیرے جانباز چلے آتے ہیں
تری بنیاد میں ہے لاکھوں شہیدوں کا لہو
ہم تجھے گنجِ دو عالم سے گراں پاتے ہیں
ہم ہیں جو غیرت و ناموس پہ کٹ سکتے ہیں
ہم ہیں جو اپنی شرافت کی قسم کھاتے ہیں
ہم نے رونده ہے بیابانوں کو ، صحراؤں کو
ہم جو بڑھتے ہیں تو پھر بڑھتے چلے جاتے ہیں

بچپن کی جیت

میری عمر ۱۴ سال تھی جب مجھے تحریک پاکستان سے وابستہ ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرا لڑکپن اور عنفوان شباب حصول پاکستان کے لئے وقف رہا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں ۱۹ برس کا تھا تو بنارس میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اہم کارکن، مسلم نیشنل گارڈز کا نائب سالار اعلیٰ اور مسلم لیگ کا ایک پرجوش مقرر ہونے کا شرف حاصل تھا۔

مخالفین کا لٹریچر پڑھ کر ان کے اعتراضات کا جواب تیار کرنا، مختلف حلقوں میں بالعموم اور مخالف علاقوں میں بالخصوص کنویسنگ کرنا، جلوس اور جلسوں کی تنظیم و تربیت، دن کو کارنر میٹنگز اور رات کو جلسہ عام سے خطاب کرنا میرے روزانہ کے فرائض میں شامل تھا۔

ایک دن ہم لوگ کنویسنگ کے لئے نکلے۔ بنارس کے ممتاز وکیل اور سٹی مسلم لیگ کے صدر جناب مولوی محمد اطہر، مسلم اسٹوڈنٹس فیدریشن کے محمد عاشر اور محمد نعیم اللہ میرے ہمراہ تھے۔ ہم لوگ ایک دوست وقار احمد کے گھر پہنچے انہیں ساتھ لے کر چلنے لگے تو دیکھا کہ وقار کا ۱۰ سالہ چھوٹا بھائی بھی پیچھے چلا آیا ہے۔ وقار نے سخت لہجے میں بھائی کو منع کیا اور کہا کہ ”بڑوں کے ساتھ لڑکوں کا کیا کام ہے۔“ لڑکے نے بڑی حسرت سے ہماری طرف دیکھا اور نمناک نگاہوں سے التجا کی کہ اس بھی کنویسنگ کے لئے ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ آخر ہم سب کے کہنے سے وقار نے اجازت دیدی۔ چنانچہ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔

ہم لوگ ایک مشہور کانگریسی مولوی حشمت اللہ کے گھر پہنچے اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ان دنوں نظریاتی اختلاف کے باوجود آپس میں ملاقات اور تبادلہ خیال کے ذریعہ ایک دوسرے کو اپنا ہم نوا بنانے کا رواج عام تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب بھی خندہ پیشانی سے ملے۔ گفتگو جلد ہی بحث کی شکل اختیار کر گئی۔ کافی وقت گذرنے کے بعد بھی، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔

مولوی صاحب نے محمد اطہر جیسے لائق وکیل کے تمام دلائل رد کر دیئے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ذہین ترین طالب علموں کی انتہائی پر جوش پیروی سے بھی قطعاً متاثر نہ ہوئے۔ آخر میں ہم لوگوں نے کہا کہ وہ کوئی خاص وجہ بتائیں جس کی بناء پر وہ کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے بضد ہیں۔ بہت اصرار کے بعد انہوں نے بتایا کہ کانگریس کے پاس صف اوّل کے لیڈروں کی پوری ایک فوج موجود ہے۔ لیکن مسلم لیگ میں قائد اعظم کے پائے کا کوئی اور لیڈر نہیں اور وہ تقریباً ستر سال کے ہو چکے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ان کی آنکھ بند ہو جائے تو مسلم لیگ بھی ختم اور پاکستان کا مطالبہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ایسے میں سب سے زیادہ نقصان میں وہ افراد ہوں گے جو کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ ان پر تو وہ مثل صادق آئے گی کہ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ابھی ہم لوگ ان کی اس بات کا جواب سوچ ہی رہے تھے کہ وقار کا چھوٹا بھائی آگے بڑھا۔ اس نے مولوی حشمت اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ قائد اعظم پاکستان بنائے بغیر نہیں مریں گے۔ وہ تو پیدا ہی ہوئے ہیں پاکستان بنانے کے لئے۔“

مولوی صاحب لڑکے کی بات سن کر سناٹے میں آگئے۔ مولوی صاحب قائد اعظم کی زندگی کے سلسلے میں شک و شبہ کا شکار تھے اور لڑکا مجسم یقین بنا ہوا تھا۔ آخر کار یقین جیت گیا مولوی حشمت اللہ نے آگے بڑھ کر لڑکے کو گلے لگا لیا اور سر سے پیر تک لرزتے ہوئے کہا۔

”بیٹا غیب کی باتیں تو خدا ہی جانتا ہے لیکن جس تیور سے تم نے یہ بات کہی اس نے میرے گمان کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ گواہ رہنا کہ آج سے میں بھی مسلم لیگ میں شامل ہو رہا ہوں اور حصول پاکستان کی جدوجہد میں تمہارے شانہ بشانہ کام کرنے کا عہد کرتا ہوں۔“

ہر سال ۱۱ ستمبر کو میری آنکھوں میں دو تصویریں ابھر آتی ہیں۔ ایک قائد اعظم کی اور دوسری وقار کے چھوٹے بھائی کی تصویر جس نے ۱۹۴۵ء میں کہا تھا کہ۔

”پاکستان بنائے بغیر، قائد اعظم کے مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اویس صبح سے بہت بور ہو رہا تھا۔ شہر میں ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے وہ اسکول بھی نہیں جا سکا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی تو وہ جلدی جلدی کھیلنے جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

"اویس کہاں جا رہے ہو؟" امی نے اسے باہر جاتا دیکھ کر آواز دی۔

"کھیلنے جا رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں بیٹا باہر مت جاؤ، گھر میں ہی اپنی باجی کے ساتھ کھیل لو۔" امی قریب آتے ہوئے بولیں۔

"لیکن امی میں بور ہو رہا ہوں۔" اویس نے کہا۔ اسکول میں اگلے مہینے کھیلوں کے مقابلے ہونے والے ہیں، گھر میں بیٹھا رہا تو بھاگنے دوڑنے کی پریکٹس بالکل ختم ہو جائے گی۔ پلیز مجھے جانے دیں۔"

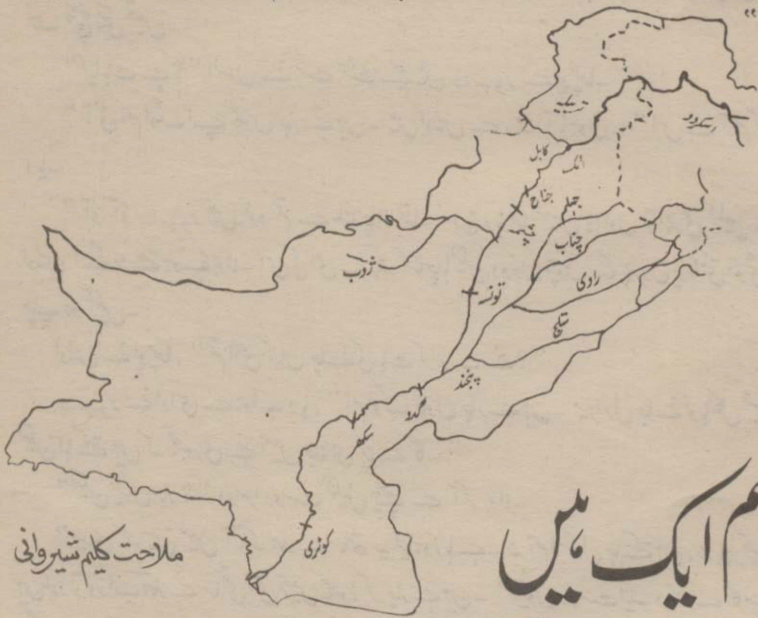

ہم ایک ہیں

ملاحت کلیم شیروانی

"خدمت کرو بیٹا، حالات بہت خراب ہیں۔ میں گلی میں تمہیں نہیں کھیلنے دوں گی" امی نے جواب دیا۔ اویس خاموشی سے جاکر اوپر ٹیرس میں کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ آخر حالات ایسے کیا خراب ہیں کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گلی میں بھی نہیں کھیل سکتا۔ پھر وہ تو بہت چھوٹا سا تھا، جب سے انہی بچوں کے ساتھ کھیلتا آیا تھا۔ اب امی کیوں منع کرتی ہیں۔ پہلے تو امی کی اور آس پاس کے گھروں میں رہنے والی دوسری خواتین کی بھی بہت دوستی تھی۔ اکثر شام کو وہ لوگ مل کر کسی کے گھر پر "ون ڈش پارٹی" کرتیں۔ بچوں کو بھی مزے مزے کی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ اتنی دیر میں اویس نے دیکھا۔ پنہور اس کے گھر کی طرف آرہا ہے۔ وہ بھاگ کر نیچے پہنچا، اتنی دیر میں امی بھی گیٹ تک پہنچ چکی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے بہت سخت لہجے میں پنہور سے پوچھا۔

"آنٹی ہم لوگ اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ میں اویس سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"آؤ آؤ پنہور میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا۔ سوچ رہا تھا تمہیں بلا لوں تو اٹاری کھیلیں گے۔" اویس آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کی امی نے کچھ کہنا چاہا لیکن دونوں بچوں کے چہروں پر چمکتی خوشی دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

اویس نے پوچھا، "تم ابھی کہاں جانے کی بات کر رہے تھے؟"

پنہور نے اداسی سے جواب دیا، "ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں۔ میرا دل جانے کو بالکل نہیں چاہتا لیکن ابا کہتے ہیں کہ مجبوری ہے ہمیں جانا ہی پڑے گا۔"

"لیکن کیوں یار؟" دوسرا دوست شکیل پیچھے سے آکر بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ ہم اسکول جا سکتے ہیں، نہ باہر کھیل سکتے ہیں اور تو اور اب ہمارے ساتھی بھی ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" تینوں دوست ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور کوئی بڑا بھی انہیں کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے باہر ہی گھاس پر بیٹھ گئے۔

"بے بی اینڈ بابا" "بے بی اینڈ بابا" گلی کے سرے پر سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ تینوں دوست ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے سے خان بابا ٹافیوں اور بسکٹوں کا تھال اٹھائے حسب معمول ہنستا بولتا چلا آرہا تھا۔

"آو آو۔ ٹی کھاؤ، بسکٹ کھاؤ۔" "بابا آگیا۔" "بابا آگیا۔"

دوسرے بچے بھی اس کی آواز سن کر گھروں سے نکل آئے۔ خان بابا قریب آگیا تھا۔ بچوں نے اسے گھیر لیا۔ لیکن سارے معصوم چہرے اداس تھے۔ بابا نے سارے بچوں کو غور سے دیکھا۔

"ارے بابالوگ، آپ کو کیا ہوا بچہ لوگ تو ہنستا اچھا لگتا ہے نا۔ ابھی ام تم کو ٹافی بھی نئیں دے گا، بسکٹ بھی نہیں دے گا۔" "بابا ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔" اویس بہت سمجھ داری سے بولا۔ "ہمیں صرف یہ بتادو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سب لوگ اتنا لڑنے کیوں لگے ہیں؟"۔

"ہاں بابا بتاؤ ہم اسکول کب جائیں؟" شکیل بھی جلدی سے بولا۔ خان بابا نے ننھے ہور کو غور سے دیکھا۔

"تم کیوں اداس ہے؟"

"میرے پاپا مجھے لے کر گاؤں جارہے ہیں۔" ننھے ہور نے تقریباً روتے ہوئے جواب دیا۔ خان بابا نے اپنا ٹافیوں کا تھال نیچے رکھ کر تینوں بچوں کو لپٹا لیا۔

"نئیں، نئیں مایوس نئیں ہوتے۔ ابھی آگے سارا کام تم لوگوں کو سنبھالنا ہے۔ اچھا اب ام تمارا دل کس طرح خوش کرے۔ بس ٹھیک ہے کہانی سنے گا تم لوگ!"

"ہاں ہاں بابا ضرور سناؤ" سارے بچے خوشی خوشی بولے۔ (خان بابا نے کہانی تو اپنے انداز میں سنائی لیکن ہم آپ کی آسانی کے لئے اپنے انداز میں سنائیں گے")۔

"یہ کہانی ایک باغ کی ہے" بابا نے کہانی شروع کی۔ "وہ بڑا خوبصورت باغ تھا، جہاں بہت سے درخت تھے۔ نہریں تھیں۔ پتہ ہے ان نہروں کا پانی کیسا تھا۔"

"نہیں بابا آپ بتائیں کیسا تھا؟" ننھا راحیل بولا۔

"وہ پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس میں خلوص اور پیار کی ٹھنڈک اور مٹھاس تھی۔" بابا نے جواب دیا۔

"اور بابا وہاں کے درختوں میں پھل اور پھول کیسے لگتے تھے؟" عاطف نے بھی جلدی سے پوچھا۔

"ان میں محبت اور دوستی کے پھل لگتے تھے۔ بھائی چارے اور خلوص کے پھول کھلتے تھے جن کی خوشبو سے سارا باغ مہکتا تھا۔ اس باغ میں بہت سارے پرندے رہتے تھے۔ ان کی رنگ برنگی بولیوں سے باغ میں رونق لگی رہتی تھی۔ وہ پرندے الگ الگ بولیاں بولتے تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ہر دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ وہ سب مل جل کر رہتے تھے، کیونکہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے باغ کو اپنی محنت اور لگن سے اتنا خوبصورت بنا رکھا تھا کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے جنت کا ٹکڑا خدا نے زمین پر اتار دیا ہو۔

"ایسے ہی جیسا ہمارا پیارا وطن پاکستان خوبصورت ہے؟" اویس نے کہا۔

"بالکل ایسا ہی۔" بابا نے کہانی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "باغ کے باہر جو دوسرے پرندے رہتے تھے وہ اس باغ کے پرندوں سے بہت جلتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کسی طرح اس باغ کے پھل پھول انہیں بھی کھانے کو مل جائیں۔ لیکن اس باغ کے پرندے آپس میں مل کر اپنے وطن کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بچے اور پھر ان کے بچوں کے بھی بچے اسی وقت تک امن وچین سے رہ سکتے ہیں جب تک ان کا باغ سلامت رہے۔ لیکن ان معصوم پرندوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے دشمن پرندے ان کو تباہ کرنے کے لئے کیا سازشیں کر رہے ہیں۔"

"کیسی سازشیں بابا؟" سارے بچے گھبرا کر بولے۔ بابا نے جواب دیا۔ "جب وہ پرندے خود کچھ نہیں کر سکے تو سب مل کر شیطان کے پاس گئے اور اس سے مدد مانگی۔ شیطان نے سارے حالات سن کر جواب دیا کہ "یہ کام بہت مشکل ہے جب تک وہ پرندے مل کر اس باغ کی حفاظت کرتے رہیں گے، میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن خیر، مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آخر شیطان جو ہوں۔ بس شیطان نے خود بھی ایک پرندے کا بھیس بدلا اور باغ میں جا پہنچا۔ وہاں جا کر وہ جھوٹ موٹ ایسے گر پڑا جیسے بہت دور سے اڑ کر آیا ہو اور تھکن سے نڈھال ہو۔ باغ کے بہت سارے پرندے اس کے پاس جمع ہو گئے اور لگے اس سے ہمدردی ظاہر کرنے۔ آخر شیطان نے اپنی بپتا سنائی کہ میں دور باغ میں رہتا تھا۔ وہاں ایک ظالم شکاری آگیا۔ اس نے میرا گھر برباد کر دیا، میرے بچوں کو پکڑ کر لے گیا۔ میں ان کو ڈھونڈنے نکلا ہوں۔ سارے پرندے کہنے لگے نہیں نہیں بھائی ابھی تم آرام کرو۔ ذرا تمہاری طبیعت بحال ہو جائے تھوڑی سی طاقت آجائے تو اس کو ڈھونڈنے جانا۔ ہم بھی تمہاری مدد کریں گے۔" خان بابا یہاں تک سنا کر چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا بابا جلد بتاؤ نا؟" کئی بچے بول اٹھے۔

"ہاں تو آہستہ آہستہ شیطان نے ان پرندوں سے خوب دوستی کر لی وہ لوگ اس کو **بہت اچھا** سمجھنے لگے اور اس پر بھروسہ کرنے لگے۔ اب شیطان نے اپنا اصل کام شروع کیا۔ اس نے کہا کہ "میرے پاس ایسے پودے کا بیج ہے جس میں بہت زیادہ پھل آتے ہیں۔ جو بہت خوشبو والے اور میٹھے ہوتے ہیں۔ پرندوں نے خوشی خوشی وہ بیج اس سے لے کر اپنے باغ میں بو دیا۔ بہت جلدی وہاں ایک پودا نکل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پودا بڑا درخت بن گیا۔ سارے پرندے حیران تھے اتنی جلدی تو درخت بڑا نہیں ہوتا۔ بہت جلدی شیطان کے کہنے کے مطابق اس میں خوشبودار پھل لگنے لگے۔ سارے باغ کے پرندوں نے ایک شام مل کر جشن منایا اور اس پیڑ کے پھل کھائے۔ کافی دیر تک وہ گاتے بجاتے رہے وہ بہت خوش تھے کہ ان کے باغ میں ایک اچھا درخت آگیا۔ لیکن ایک صبح جب وہ پرندے اٹھے تو وہ ویسے نہیں

رہے تھے جیسے سوئے تھے۔

"کیا مطلب بابا کیا ان کی شکلیں بدل گئیں؟" شکیل نے پوچھا۔ سارے بچے بھی حیران بیٹھے تھے۔

"نہیں بیٹا ان کی بولیاں بدل گئیں۔" خان بابا نے جواب دیا۔

"ہائیں ارے بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اویس گھبرا کر بولا۔ "ایسے کہ جو بولی وہ پہلے بولتے تھے۔ اب اس میں "محبت" نہیں رہی تھی۔ ایک دوسرے سے شکایتیں تھیں، بیزاری تھی، بلکہ نفرت تھی۔ کوئی پرندہ سوچتا تھا کہ دوسرے پرندے ان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں خود اچھے درختوں پر رہتے ہیں اور ہمیں خراب درخت دے دیئے ہیں۔ دوسرے پرندے سوچتے تھے کہ جب انہیں نہر کا پانی چاہئے ہوتا ہے تو انہیں انتظار کرنا پڑتا ہے اور دوسرے پرندے عیش کر رہے ہوتے ہیں۔ پرندوں کی ایک ٹولی ایسی بھی تھی جس نے ایک خفیہ منصوبہ بنایا کہ اب کہ جب پھلوں کا موسم آئے گا تو ہم راتوں رات سارے پھل توڑ لیں گے تاکہ دوسرے پرندے اس میں سے اپنا حصہ نہ مانگ سکیں۔ غرض کہ آپس کی شکایتیں بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن سارے پرندے آپس میں لڑ پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو خوب مارا۔ شیطان کا کام پورا ہو چکا تھا۔ وہ خوشی خوشی حاسد پرندوں کے پاس پہنچا اور بولا "لو بھئی میں نے اپنا کام تو پورا کر دیا۔ اب یہ لڑ لڑ کر کمزور ہو جائیں گے پھر تم باغ پر قبضہ کر لینا۔" اتنا کہہ کر شیطان تو رخصت ہوا اور حاسد پرندے اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب وہ آسانی سے باغ پر قبضہ کر سکیں۔ ادھر باغ میں حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ روز روز کے جھگڑوں نے سارے باغ کا حسن خراب کر دیا۔ نہروں کا پانی سوکھنے لگا۔ پھل پھول جھڑنے لگے۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ پرندوں کو سوائے ایک دوسرے سے لڑنے کے کوئی کام نہیں رہا۔ خوف اور دہشت کے سائے پورے باغ پر پھیل گئے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی جگہ چیخ و پکار کا شور سنائی دینے لگا۔" بولتے بولتے خان بابا چپ ہو گیا۔ سب بچے بھی چپ بیٹھے رہے۔ اس نے ایک نظر ان کے اداس چہروں پر ڈالی اور کہانی آگے بڑھائی۔ "پرندوں کے بچے بھی اسی طرح اداس ہو گئے جیسے تم لوگ ہو۔ وہ بھی پریشان تھے کہ ان کے بڑوں کو کیا ہو گیا ہے وہ انہیں ساتھ کھیلنے کیوں نہیں دیتے۔ آپس میں اتنا لڑتے کس لئے ہیں۔ ایک دن یہ سارے بچے اپنے اپنے گھر والوں سے چھپ کر ایک درخت پر جمع ہو گئے اور آپس میں صلاح مشورہ شروع کیا کہ "آخر یہ حالات کیسے ٹھیک ہوں گے۔" ایک بچہ جو ذرا بڑا تھا اور زیادہ سمجھ دار تھا اس نے کہا "ہمیں پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ حالات خراب کیوں ہوئے ہیں۔؟" سوچتے سوچتے بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب سے یہ نیا درخت لگا ہے اور اس کے پھل کھانے شروع کئے گئے ہیں اسی وقت سے یہ لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں۔ ایک بات اور ان کی

سمجھ میں آئی کہ جس پرندے نے وہ بیج انہیں دیا تھا وہ خود بھی اب غائب ہے اور کسی نے ہنگاموں میں اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ انہوں نے طے کیا کہ کسی سمجھ دار پرندے کو یہ پھل دکھا کر معلوم کیا جائے کہ آخر اس پھل کا نام کیا ہے اور یہ کس قسم کا پھل ہے۔ دو بچے وہ پھل لے کر قریبی باغ میں رہنے والے ایک بزرگ پرندے کے پاس پہنچے تاکہ اس سے اس پھل کے بارے میں معلوم کریں۔ اس پرندے نے جیسے ہی پھل دیکھا ایک دم چلّا اٹھا۔

"ارے یہ تم کہاں سے لے آئے۔ اسے فوراً پھینک دو بلکہ آگ میں جلا دو یہ نفرت کا پھل ہے۔"

بس بابا لوگ! وہ بچے واپس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا۔ بچوں کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ انہوں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اب سب سے پہلے تو نفرت کے اسی درخت کو کاٹنا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بڑے انہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے اس لئے یہ کام بھی انہیں رات کو ہی کرنا ہو گا۔ انہوں نے دن بھر میں اپنے تمام ساتھیوں اور دوستوں کو چپکے چپکے اپنا منصوبہ سمجھا دیا۔ بلکہ رات کو انہوں نے دیکھا کہ کچھ بڑے پرندے جو خود بھی ان حالات سے پریشان تھے ان میں شامل ہیں۔ ان سب نے مل کر وہ درخت اکھاڑ پھینکا۔ حالانکہ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں اور دور تک پھیل گئیں تھیں لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

کئی بچے زخمی بھی ہو گئے وہ بُری طرح تھک گئے تھے اس کے باوجود اس درخت کو گھسیٹ کر اپنے باغ سے دور لے گئے اور اس میں آگ لگا دی۔ خان بابا کے گرد بیٹھے ہوئے بچوں نے سکون کی سانس لی۔
"پھر کیا ہوا بابا۔" اب بچوں کی آوازوں میں عجیب سی خوشی تھی۔ خان بابا بھی مسکرایا اور بولا۔

ادھر سارے حاسد پرندوں نے جب دیکھا کہ نفرت کا درخت گرایا جا چکا ہے تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ وہ جان گئے کہ باغ کے پرندے اب غفلت کی نیند سے جاگ چکے ہیں۔ اس لئے وہ تھک ہار کے بیٹھ رہے۔

نفرت کے درخت کا جلایا جانا تھا کہ باغ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ ان ہواؤں میں محبت کی مہک تھی، پیار تھا، ایک دوسرے کے لئے ایثار و احترام کا جذبہ تھا۔ باغ میں پھر وہی پرانے دن لوٹ آئے اور سارے پرندوں نے عہد کیا کہ اب وہ کسی "شیطان" کے بہکانے میں نہیں آئیں گے۔ اس باغ پر سب کا حق ہے وہ کوئی بھی بولی بولیں آپس میں ایک دوسرے سے محبت تو کرتے ہیں۔ ان کے بچے ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں، ایک ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کریں گے بلکہ اب وہ اپنے اپنے بچوں کو ایک دوسرے کی بولیاں سکھائیں گے تاکہ وہ اور قریب آسکیں اور دشمن ان کی اس

کمزوری کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔"

باباکی بات ابھی جاری تھی کہ منصور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں اپنے امی اور ابا کے ساتھ ہرگز گاؤں نہیں جاؤں گا۔"

"ہاں ہم بھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارے بڑوں کو ہماری یہ بات ماننی ہی ہوگی۔"

اویس نے بھی چلّا کر کہا۔ "ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں" سب بچّے چلائے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر خان بابا کے گرد گھیرا ڈال لیا اور ناچنے لگے۔

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں" اچانک ان آوازوں میں کچھ بڑی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ بچوں نے گھوم کر دیکھا منصور کے ابو، شکیل کے بڑے بھائی، اویس کے چاچا اور محلے کے دوسرے بڑے ان کے ساتھ شامل تھے۔ خواتین ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ تالیاں بجا کر ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہاں نہ دہشت تھی، نہ خوف، نہ غصہ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

" ہم ایک ہیں" اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں۔

انسان کے شکاری

رامانند ساگر

کئی مسلم گاڑیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب میں جو کچھ کیا گیا وہ بھی کم ہولناک نہ تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی کے تیرہ ہزار انسانوں میں سے صرف پندرہ بچے تھے اور وہ بھی لاشوں کے نیچے دب جانے کے باعث۔

ان پندرہ نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب فرش پر جمے ہوئے اپنے بھائیوں، بیویوں اور بچوں کے خون کو چاٹا۔ انتہا یہ کہ کئی روز پیاسے رہنے کے بعد آخر انہوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا تا کہ حلق تر ہو سکیں۔

بچوں کے محبوب ترین رسالے

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی کو

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی جانب سے

پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ قرار دیئے جانے پر

ہم تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور

دعاگو ہیں کہ

آنکھ مچولی ترقی کی منازل یونہی طے کرتا رہے

شفیق بُک سینٹر

اسٹیشنرز اینڈ بُک سیلرز

چوک گڑھی شاہو ۔ لاہور ۳۹ فون نمبر۔ ۳۰۴۷۶۱

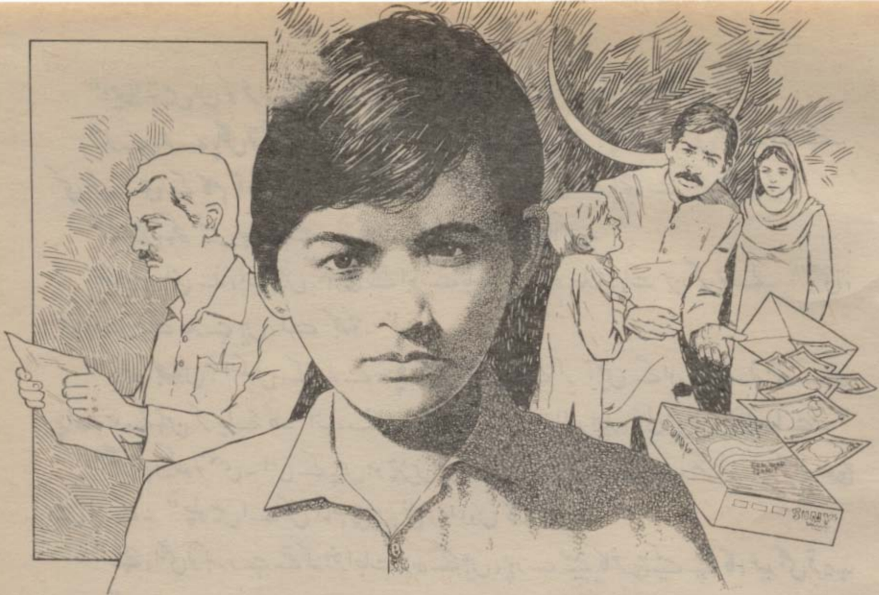

نئے کپڑے

کلیم چغتائی

"بالکل نہیں! میں نہیں پہنتا یہ پرانے موزے!!"

سلمان میاں نے سفید رنگ کے موزے زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "مگر بیٹا یہ موزے تو ابھی دو ماہ پہلے آپ کے ابّو لے کر آئے تھے۔" امی نے سمجھایا۔

"جی نہیں۔ میں نئی کلاس میں گیا ہوں۔ سب بچے نئے جوتے، نئے موزے، نئی یونیفارم پہن کر آئیں گے اور میں پرانے موزے جوتے پہن کر جاؤں۔ میری ٹوپی بھی پرانی ہے اور بستہ بھی۔" سلمان میاں رونے لگے۔

"بیٹا یہ چیزیں خراب تو نہیں ہو گئیں؟ اگر خراب ہو گئی ہوتیں تو ہم آپ کو نئی چیزیں دلوا دیتے۔" امی نے پھر سمجھایا۔

"اچھا! تو میں ان کو خراب کر دیتا ہوں۔" سلمان میاں نے لپک کر قینچی اٹھالی۔

"ارے، ارے پاگل تو نہیں ہو گئے آپ؟ اگر آپ کو یہ چیزیں نہیں چاہئیں تو انہیں خراب تو نہ کیجئے۔ کسی غریب ہی کے کام آ جائیں گی۔" امی نے اٹھ کر سلمان میاں کے ہاتھ سے قینچی چھین لی۔

"پھر میں کچھ نہیں جانتا، مجھے نئے موزے اور نئے جوتے دلائیں۔"

سلمان کی امی نے رات میں سلمان کے ابو سے بات کی۔ وہ ساری بات سن کر بولے۔ "بھئی، اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں، اسے سمجھاؤ۔"

"کیسے سمجھاؤں؟ اسکول کے سارے بچے نئی نئی چیزیں لے کر آئیں گے اور وہ پرانے موزے اور پرانے جوتے پہن کر جائے گا۔ آپ نے اسے بستہ بھی نہیں دلایا اور بیچارہ ٹوپی بھی پرانی چلا رہا ہے۔"

"مگر تم دیکھو تو سہی۔ اس کے پاس جو چیزیں ہیں وہ اب بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مگر خیر...... " ابو سوچ میں پڑ گئے۔ "چلو میں اسے کل تمام چیزیں نئی دلوا دوں گا۔"

"لیجئے، ابھی تو کہہ رہے تھے کہ اخراجات بڑھ گئے ہیں، پورے مہینے کا خرچ کیسے چلے گا، عید بھی قریب ہے۔"

"بس ٹھیک ہے بچے کا دل تو میلا نہ ہو۔"

اگلے دن سلمان میاں کے ابو نے سلمان میاں کو نیا بستہ، نئے جوتے، نئے موزے اور نئی ٹوپی دلوا دی۔ سلمان صاحب خوشی کے مارے ناچتے پھر رہے تھے۔

چند دنوں بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو گیا۔ سلمان میاں نے بھی ضد کر کے چھ روزے رکھے۔ آخر ان کی عمر صرف آٹھ سال ہی تو تھی۔ گرمی کا موسم تھا، سلمان میاں کی امی اور ابو نے ان سے کہا تھا کہ آپ ابھی چھوٹے ہیں، اگلے سال روزے رکھ لیجئے گا، لیکن سلمان میاں نہ مانے۔

عید کے دن نہا دھو کر سلمان میاں نے اپنا نیا جوڑا پہنا جو ان کے ابو چند دن پہلے لے کر آئے تھے۔ سلمان میاں کے ابو بھی تیار ہو کر آ گئے۔ مگر یہ کیا؟ سلمان میاں نے حیرانی سے دیکھا۔ ابو نے کئی بار کے استعمال شدہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ بادامی رنگ کی شلوار قمیص۔ سلمان میاں کو یاد تھا کہ اس نے اس قمیص میں ایک جگہ رفو بھی دیکھا تھا۔ ان کے ابو نے پوچھنے پر بتایا تھا کہ ان کی قمیص منی بس میں ٹین کی پتری لگنے سے ذرا سی پھٹ گئی تھی۔

سلمان میاں ابھی سویاں کھا ہی رہے تھے کہ ان کے ابّو امّی سویاں ختم کر کے بولے۔ "جلدی چلو بھئی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔"

نماز کے بعد خطبہ ہوا، پھر دعا کے بعد لوگ ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ سلمان کے ابو بھی کئی

افراد سے گلے ملے۔ سلمان میاں نے سب کو سلام کیا۔ ابو کے دوست ہاشمی صاحب نے تو وہیں عید گاہ میں سلمان میاں کو پانچ روپے عیدی دے دی اور ہنس کر بولے۔ لو بھئی تمہاری تو کمائی شروع ہو گئی!"

گھر آکر سلمان میاں ابو کے ساتھ ناشتہ کرنے لگے۔ وہ ایک بات پوچھنے کے لئے بے چین تھے، انہوں نے کہا۔ "ابو"

ابو ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"جی بیٹے!"

"ابو ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں بیٹے کیا بات ہے؟ عیدی چاہئے......؟"

"نہیں ابو، عیدی کی بات نہیں، یہ بتایئے کہ آج تو عید ہے، آپ نے نئے کپڑے کیوں نہیں پہنے......؟"

"نئے کپڑے؟" ابو گڑ بڑا گئے۔ "آں ہاں، نئے کپڑے۔ مگر بیٹے یہ تقریباً نئے ہی تو ہیں، صرف دو مہینے پہلے تو بنوائے تھے۔

"مگر ابو بالکل نئے تو نہیں ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹے۔"

"بتایئے نا، ابو، آپ نے نئے کپڑے کیوں نہیں بنوائے۔"

"اوہو...... اچھا خیر، تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو سنو۔ میں نے نئے کپڑے اس لئے نہیں بنوائے کہ ہمارے وطن پاکستان کو اچھے سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔!"

"جی؟!" آٹھ سالہ سلمان میاں کا ننھا سا ذہن اس جملے کو سمجھ نہ سکا۔

"جی ہاں بیٹے......"

"مگر ابو میں تو نئے کپڑوں کی بات کر رہا تھا اور آپ سائنس دانوں کی بات کرنے لگے۔"

"بیٹے میں بھی نئے کپڑوں ہی کی بات کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خوب محنت سے پڑھیں۔ بہت بڑے سائنس داں بنیں اور ملک میں خوشحالی لائیں۔"

"مگر میں سمجھا نہیں ابو۔"

"میں سمجھاتا ہوں۔" ابو نے پیار سے کہا۔ "دیکھئے بیٹے آپ کو یاد ہو گا، اسکول کھلنے پر آپ نے نئے جوتوں، نئے موزوں، ٹوپی اور بستہ کے لئے ضد کی تھی۔ ہم نے نئی چیزیں آپ کو اس لئے نہیں دلوائی تھیں

کہ آپ کے جوتے، موزے، ٹوپی اور بستہ ابھی تک بہت اچھی حالت میں تھے اور کوئی بھی ان چیزوں کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پھٹی پرانی چیزیں ہیں۔ لیکن آپ نے ضد کی تو میں نے سوچا کہ اگر میں نے آپ کو یہ چیزیں نہ دلوائیں تو آپ رنجیدہ رہیں گے، آپ کا دل پڑھنے میں نہیں لگے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ پڑھ لکھ کر بڑے سائنس داں نہیں بن سکیں گے۔ سمجھ رہے ہیں نا بیٹے؟"

"جی؟ جی ابو!"

"تو بیٹا، اسی لئے میں نے اسکول کھلنے پر آپ کو ہر چیز نئی دلوا دی، مگر اس کے لئے مجھے تھوڑی سی قربانی دینی پڑی۔"

"قربانی؟ مگر ابو قربانی والی عید تو بہت دنوں بعد آئے گی۔"

"قربانی بیٹے صرف گائے یا بکری کی نہیں ہوتی، قربانی اور چیزوں کی بھی ہوتی ہے، جیسے میں نے آپ کے لئے اپنے نئے کپڑوں کی قربانی دے دی، یعنی جو پیسے میں نے اپنے نئے کپڑے سلوانے کے لئے رکھے تھے۔ ان سے میں آپ کی نئی چیزیں لے آیا۔ میں نے سوچا کہ میں تو استعمال شدہ کپڑے پہن لوں گا مگر میرے بیٹے کا دھیان پڑھائی سے ہٹنا نہیں چاہئے۔"

"ابو! صرف میری وجہ سے آپ نے نئے کپڑے نہیں بنائے نا؟" سلمان میاں شرمندہ ہو گئے۔

"بیٹا، ہم آپ کے ابو جو ہیں، ہم آپ سے محبت جو کرتے ہیں، ہماری خواہش یہی ہے کہ آپ پڑھ لکھ کر ملک کے کام آئیں۔ اس ملک کے بچے دل لگا کر پڑھیں گے تو بڑے بڑے سائنس داں اور مختلف چیزوں کے ماہر بنیں گے، کھیتی باڑی کے نئے طریقے ایجاد کریں گے، جانوروں کی پرورش کے نئے طریقے بتائیں گے، بہت اچھے اسپتال قائم کریں گے؟ توانائی کے جدید اور کم خرچ ذرائع تلاش کریں گے۔ بہت سی چیزیں پاکستان ہی میں بننے لگیں گی اور وہ اتنی اچھی ہوں گی کہ دوسرے ملک ان چیزوں کو فرمائش کر کے اپنے ہاں منگوایا کریں گے اور کسی چیز کے اچھا ہونے کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ چیز پاکستان میں بنی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں بیٹے کہ پاکستان کا ہر شہری خوب خوشحال اور دولت مند ہو جائے تاکہ ہر پاکستانی بچہ تعلیم حاصل کرے اور کوئی پاکستانی بچہ ایسا نہ رہے جس کے پاس نیا بستہ، نئی کتابیں، نئی یونی فارم، نئے جوتے اور نئے موزے نہ ہوں...... ہے نا بیٹے؟"

"جی ابو۔" سلمان میاں نے سر جھکا لیا۔

"ابو نے جھک کر سلمان میاں کو پیار کیا۔ "بیٹے آپ شرمندہ نہ ہوں، میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا تھوڑا ہی تھا۔

"ابو، اب میں پوری محنت سے پڑھوں گا اور بہت بڑا سائنس دان بنوں گا۔" سلمان میاں جوش

سے بولے۔

"ضرور بیٹے، انشاءاللہ کہنا چاہئے، یعنی اگر اللہ نے چاہا۔"

اگلے دن سلمان کے ابو سو کر اٹھے تو ان کے سرہانے سبز رنگ کا ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے حیرانی کے ساتھ لفافہ اٹھا کر دیکھا، لفافے پر لکھا تھا۔

"میرے پیارے ابو کے لئے۔"

سلمان کے ابو نے لفافہ کھول کر دیکھا، اندر دس پانچ اور ایک روپے کے نئے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے گنے، ایک سو دس روپے تھے۔ ساتھ ہی ایک پرچہ بھی رکھا تھا۔ انہوں نے پرچہ کھول کر پڑھا لکھا تھا۔

"میرے اچھے ابو...... اسلام علیکم!

"اگر آپ میرے اچھے ابو ہیں تو میں بھی آپ کا اچھا بیٹا ہوں، آپ نے میری وجہ سے نئے کپڑے نہیں سلوائے نا، میں نے اپنی ساری عیدی آپ کو دے دی ہے۔ آپ اس میں اور پیسے ملا کر نئے کپڑے سلوا لیجئے گا۔ دیکھیے ابو انکار نہیں کیجئے گا...... اور ہاں ابو، اب میں آپ سے نئی چیزوں کے لئے کبھی ضد نہیں کروں گا۔ خوب دل لگا کر پڑھوں گا۔ مجھے بہت بڑا سائنس دان جو بننا ہے۔ آپ دعا کیجئے گا میرے لئے۔"

آپ کا بیٹا، سلمان۔

سلمان کے ابو نے پرچہ کو چوم لیا اور تیز تیز قدموں سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئے جہاں سلمان میاں کی امی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

ایسی جلدی بھی کیا ہے

تحمل کے ساتھ کھانے کی عادت آپ کی صحت کی ضامن ہے۔

(اشتہار ادارہ آنکھ مچولی)

نذرِ اہلِ وطن

یہ نظم ہمیں صبوحی فاروق (کراچی) نے ارسال کی۔

ہم نے لاکھوں جان گنوا کر پاکستان بنایا ہے
گھر کے سارے دیپ بجھا کر اس کا دیپ جلایا ہے

کوئے وفا میں خاک بسر اور چاک گریباں بیٹھے ہیں
پاک وطن کی پاک زمین سے ہم نے سب کچھ پایا ہے

بھائی بھائی مل جائیں تو قوم کی قوت کہلائیں
بھائی بھائی بن کر ہم نے پاکستان بنایا ہے

اہلِ وطن سے خاص محبت اپنے دل کی ہے دولت
پاکستان سے عشق ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے

ایک خدا کے بندے ہیں اور ایک نبیؐ کی امت ہیں
ان رشتوں کو توڑ کر کس نے دشمن کو اپنایا ہے

رات بہت تاریک ہے لیکن ہم نے ساری بستی میں
نورِ محبت پھیلانے کو دل کا دیپ جلایا ہے

امن کا پرچم لہرانے ہم قریہ قریہ جائیں گے
سب کے دل کو رام کریں گے، کام یہ ہی اپنایا ہے

سب کو ایک نظر سے دیکھیں سب کے حق کا پاس کریں
سب کو ایک بنانے والا نقشہ، ذہن میں آیا ہے

نفرت کی دیوار گرا دیں دل کے دریچے وا کر دیں
پیار کا تحفہ اس کو بھیجیں، آپ کا جو ہمسایہ ہے

اس دھرتی کے رہنے والے نیک بھی ہیں اور ایک بھی ہیں
کوئی پہلے آیا تھا اور کوئی بعد میں آیا ہے

اہلِ نظر، اربابِ سیاست ٹھنڈے دل سے غور کریں
نفرت کے شعلے بھڑکا کر کیا کھویا کیا پایا ہے

آؤ سب سے پیار کریں اور سب کے ساتھ انصاف کریں
پیار نہیں، انصاف نہیں تو اپنا خون پرایا ہے

ہم نے دل کی بیتابی کو ڈھال دیا ہے شعروں میں
یعنی غم کے کوہِ گراں کو اشکوں میں پگھلایا ہے

کیفؔ کی باتیں اہلِ وطن کے دل میں اتر جائیں شاید
ان میں راہِ فکر و عمل کی خوشبو کا سرمایہ ہے

نوٹس بورڈ

قارئین اور قلم کاروں سے ادارہ آنکھ مچولی
کے ماہانہ رابطے کا مستقل سلسلہ

درج ذیل ساتھیوں کی شائع شدہ تحریروں کا معاوضہ بھجوانا مقصود ہے۔ ایڈریس نہ ہونے کی وجہ سے معاوضہ نہیں بھجوایا جاسکتا۔ براہ کرم یکم ستمبر سے قبل اپنے مکمل نام پتہ بھجوادیں ورنہ معاوضوں کے چیک منسوخ کردیئے جائیں گے۔

جن ساتھیوں کے پتے مطلوب ہیں۔

۱۔ احسان اللہ احمد
۲۔ شمع سرور
۳۔ محمد افضل شاہین
۴۔ ایم شہزاد احمد
۵۔ محمد تنویر شعیب
۶۔ بن یامین
۷۔ سرتاج احمد

جوابی لفافے کے بغیر کسی ساتھی کو جواب دینا ادارے کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے خطوط کے ہمراہ جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ غیر اہم سوالات کے جواب دینا یا غیر ضروری باتوں کے لئے خط لکھنا ادارے کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

قومی یک جہتی

آغا فیصل مرزا

دنیا کی کوئی بھی قوم خواہ وہ کتنی ہی محنتی اور ذہین ہو قومی یکجہتی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

اسلام سے قبل سارا عرب قبائل میں بٹا ہوا تھا اور یہ قبیلے ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان میں میل جول کے بجائے دشمنی اور یک جہتی کے بجائے اختلافات تھے۔ ان سب کا مشترک مذہب بت پرستی تھا۔ لیکن اس معاملے میں بھی ان میں یک جہتی نہ تھی۔ ہر قبیلے نے اپنے الگ الگ بت بنا رکھے تھے اور دن رات ان کی عبادت کرتے تھے۔ اسی اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے وہ فطرتاً بہت بہادر قوم تھی، مگر اس کی بہادری صرف اپنی ہی قوموں کو تباہ کرنے میں استعمال ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پورا عرب غلامی

کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ پھر اسلام نے دنیا کو نئی راہ پر چلنے کا درس دیا۔ اسلام نے سب سے پہلے انہیں کلمہ توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا پھر جب انہوں نے کلمہ توحید پڑھا تو سب کا معبود بھی ایک اور رسول بھی ایک ہو گیا۔ منزل بھی ایک اور رستہ بھی ایک ہو گیا۔ اس اتحاد کی ابتداء مٹھی بھر انسانوں سے ہوئی لیکن ۲۳ سال کی مختصر سی مدت میں سارا عرب اپنے سارے اختلافات بھلا کر اسلام کے پرچم تلے جمع ہو گیا۔

اسی یکجہتی کی برکت تھی کہ ساری دنیا پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سارے عالم میں ان کا سکہ رواں تھا۔ مگر میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار بھی مسلمان قوم میں موجود تھے۔ انہوں نے مسلمانوں سے غداری کی اور اپنی قوم کی ساری عظمت و شان خاک میں ملادی۔ جب ایک اینٹ نے دوسری اینٹ کو سہارا نہ دیا تو پوری دیوار زمین پر گر پڑی۔ جب بھی دنیا کہ کسی علاقے کے مسلمانوں نے اپنے اندر اتحاد پیدا کیا اور ایک مقصد متعین کر کے متحدہ کوشش کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا کی۔

پاکستان کا حصول کچھ اتنا آسان کام نہیں تھا لیکن جب جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں نے قائد اعظم محمد علی جناح ؒ کی قیادت میں قومی یک جہتی کا مظاہرہ کیا تو ہندوؤں اور انگریزوں کی مشترک قیادت اور مخالفت کے باوجود مسلمانوں نے ایک آزاد ملک حاصل کیا۔ نہ صرف حاصل کیا بلکہ پاکستان میں بسنے والے ہر نسل کے باشندوں نے مل کر اس کی حفاظت اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

پاکستان کے حصول کے وقت نہ کوئی سندھی تھا نہ مہاجر تھا، نہ پنجابی تھا، نہ پٹھان تھا اور نہ بلوچ تھا پھر آج انہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ آگ کس کی لگائی ہوئی ہے؟ آج یہ سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ کیا مسلمان، مسلمان کا بھائی نہیں کیا سندھی، مہاجر پنجابی، پٹھان اور بلوچ مسلمان نہیں ہیں۔ ان سب کا مذہب ایک، اللہ ایک، قرآن ایک۔ تو پھر یہ تفرقے میں کیوں پڑ گئے ہیں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہے یک جہتی کا فقدان۔ ۱۹۶۵ء میں جب پاک دھرتی پر ہندوستان نے حملہ کیا تھا تو ہم نے اس کی پانچ گنا زیادہ قوت کو اسی یک جہتی کے بل پر منہ توڑ جواب دیا تھا۔ دشمن جب بھی ہماری متحد قوم کے مقابلے میں آیا منہ کی کھا کر واپس گیا۔ ہم میں یک جہتی ہوگی تو ہندوستان کیا دنیا کی سپر طاقتیں مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی لیکن اگر خدانخواستہ ہم میں اسی طرح یک جہتی کا فقدان رہا تو پھر کسی دوسرے ملک کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوگی کہ ہمیں نیست و نابود کرے، ہم خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ تباہی ابھی بہت دور ہے۔ کاش ہم جلد از جلد قومی اتحاد اور یک جہتی کو بحال کر لیں۔ آج ہمیں پھر ایک قائد اعظم ؒ جیسے مخلص اور ذہین رہنما کی ضرورت ہے۔ کوئی ہے جو یہ عظیم فرض انجام دے؟ میں نے آپ سے بھی پوچھا ہے! آپ بھی خود سے اور دوسروں سے یہ سوال پوچھئے گا۔ شاید کہیں سے جواب مل ہی جائے۔

معلوماتِ پاکستان

طاہر جمیل گوہر۔ گوجرانوالہ

۱...... پاکستان میں کل کتنے ریڈیو اسٹیشن ہیں؟

۲...... پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ کب جاری ہوا؟

۳...... پاکستان کا پہلا سکہ کب جاری ہوا ؟

۴...... پاکستانی ترانے میں اردو کے کتنے لفظ ہیں ؟

۵...... پاکستان کے پہلے اور آخری نائب صدر کون تھے ؟

٦...... پاکستان کا قومی ترانہ کب نشر ہوا تھا ؟

۷...... پاکستان کے جھنڈے کا ڈیزائن کس شخصیت نے تیار کیا ؟

۸...... پاکستان میں کل ہوائی اڈوں کی تعداد کتنی ہے ؟

۹...... قیام پاکستان کی تجویز سب سے پہلے کس صوبے کی اسمبلی نے منظور کی تھی ؟

۱۰...... پاکستان ہاکی ٹیم کے سب سے پہلے کپتان کون تھے ؟

جوابات

(۱) گیارہ ریڈیو اسٹیشن۔
(۲) پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو جاری ہوا۔
(۳) پہلا سکہ ۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو جاری ہوا۔
(۴) صرف دو لفظ اردو کے (باقی فارسی اور عربی)
(۵) مسٹر نور الامین۔
(٦) ۱۳ اگست ۱۹۵۴ء۔
(۷) چوہدری رحمت علی۔
(۸) ۲۳ (تیئس)
(۹) صوبہ سندھ۔
(۱۰) علی اقتدار شاہ دارا۔

مجاہد ملک فضل ربی۔ کراچی

وہ باغ میں بالکل اکیلا بیٹھا کراچی کے حالات پر غور کر رہا تھا۔ سترہ سال کا یہ نوجوان کراٹے، جمناسٹک، کنگ فو اور لڑائی کے دوسرے طریقوں سے بخوبی آشنا تھا۔ اس کا نام مجاہد تھا۔ وہ سچ مچ مجاہد تھا۔ پاکستان کا مجاہد۔ وہ ملک دشمن عناصر سے اکیلا لڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ آج کل وہ تخریب کاری کے خاتمے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ایک سفید رنگ کی کار میں سے فائرنگ ہوئی اور بہت سی چیخیں فضا کو دہشت ناک کر گئیں...... کار تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی مجاہد تیزی سے اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور موٹر سائیکل اس کار کے تعاقب میں دوڑا دی۔ یہ تعاقب کوئی سوا گھنٹہ جاری رہا پھر وہ کار ایک بنگلے کے مین گیٹ سے ہوتی ہوئی گیراج میں جا کھڑی ہوئی۔ مجاہد نے اپنی موٹر سائیکل قریبی کھڈ میں چھپا دی اور خود اس علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ علاقہ ہر طرح کی آبادی سے پاک تھا۔ اس سنسان علاقے میں وہ بنگلہ کسی بھوت بنگلہ کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ اگر یہاں اس وقت مجاہد کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو ڈر کے مارے اپنی راہ لیتا مگر وہ تو مجاہد تھا۔ اسلام کا مجاہد، اس دیس کا مجاہد۔

مجاہد نے بنگلے کے قریب جاکر بنگلے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ وہاں سے مین گیٹ کے علاوہ اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا اور گیٹ کے اندر کسی کے موجود ہونے کا خدشہ تھا۔ اب اندر جانے کا واحد راستہ دیوار تھی مگر دیواروں پر بھی شیشے کی بوتلیں توڑ کر سیمنٹ کے ذریعے اس طرح چپکائی گئی تھی کہ اگر کسی کا ہاتھ ان پر لگے تو ہاتھ کا قیمہ بن جائے۔

بنگلے کا جائزہ لیتے ہوئے مجاہد کا دماغ متواتر حرکت میں رہا۔ بالآخر وہ اندر جانے کی ایک ترکیب سوچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ جلدی سے کھڈ سے اپنی موٹر سائیکل نکال لایا اور اسے بنگلے کی پچھلی دیوار کے ساتھ ٹکا کر اس طرح کھڑا کیا کہ اب اس کا ہاتھ بآسانی دیوار کے سرے تک پہنچ سکتا تھا پھر وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا کوٹ کو اتارنے کے بعد اس نے کوٹ کو اس طرح تہہ کیا کہ وہ ایک تین انچ موٹی گدی کی صورت میں ڈھل گیا۔ پھر اس نے وہ گدی نما کوٹ موٹر سائیکل کی سیٹ پر چڑھ کر ان کانچ کے ٹکڑوں پر رکھ دیا۔ اب وہ ان کانچ کے ٹکڑوں سے محفوظ ہو گیا پھر وہ ایک ہی جست میں دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ بنگلے کے اندر کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بڑی آہستگی سے اندر اتر گیا۔ چونکہ بنگلے کا پچھلا حصّہ تھا اس لئے اس طرف کوئی نہیں تھا اس بنگلے میں تین کمرے تھے۔ مجاہد بنگلے کا اندر سے جائزہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا پھر وہ چونک کر اچانک رک گیا۔ تیسرے نمبر کے کمرے سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر وہ دھیمے دھیمے قدموں سے اسی کمرے کی طرف بڑھا۔ مجاہد کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا اور کمرے کے اندر کی آوازیں سننے لگا "شیرے جب باس کو یہ خبر ملے گی کہ ہمارا یہ راؤنڈ بھی کامیاب گیا ہے تو باس ہمیں ضرور خصوصی انعام سے نوازے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو نواز، واقعی باس ہم سے بہت خوش ہو گا۔" اور پھر دھڑام سے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے اور مجاہد اندر داخل ہوگیا۔ اندر بیٹھے تینوں دہشت گرد چونک کر یکدم کھڑے ہوگئے مگر مجاہد عقاب کی طرح ان تینوں پر جھپٹ پڑا اور ان تینوں پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ تینوں لاتوں اور گھونسوں کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوگئے اور مجاہد اس طرح ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے اب سارا کھیل ختم ہو گیا ہو مگر اسی لمحے کمرے میں ایک آواز گونجی "اوئے لڑکے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔" "کھیل ختم نہیں ہوا کھیل تو اب شروع ہو گا بڑے میاں" اور اس کے ساتھ ہی مجاہد اپنی جگہ سے اچھل کر اس شخص پر جا پڑا جو شاید چوکیدار تھا چوکیدار نے فائر کر دیا مگر مجاہد بال بال بچ گیا مگر پھر بھی گولی اس کے بائیں بازو کو چھو گئی اور پھر پلک جھپکتے میں مجاہد نے چوکیدار سے بندوق چھین لی اور گھما کر بندوق کا دستہ چوکیدار کے سر پر دے مارا چوکیدار ایک چیخ مار کر وہیں لمبا لیٹ گیا۔ مجاہد نے بندوق ایک طرف پھینکی اور جلدی جلدی کوئی رسی تلاش کرنے لگا مگر بڑی کوشش کے بعد بھی جب وہ رسی کی تلاش میں ناکام رہا تو اس نے ان چار غنڈوں میں سے دو کی شرٹیں اتار دیں اور انہیں درمیان سے پھاڑ کر چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا پھر ان چاروں کے ہاتھ باری باری باندھ دیئے پھر وہ اٹھا اور کراٹے کا ایک مخصوص داؤ ان چاروں کو مارا اب وہ چاروں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے بے ہوش ہو چکے تھے۔

پھر مجاہد جس راستے سے اندر آیا تھا اسی راستے

سے باہر نکلا۔ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور شہر کی جانب دوڑا دی۔ شہر پہنچ کر اس نے ایک جنرل اسٹور سے قریبی تھانے کے انسپکٹر کو فون پر صورت حال سمجھائی اور جنرل اسٹور پر آنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔ پھر وہ اسی جنرل اسٹور کے باہر ٹہلنے لگا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک جیپ جس میں پولیس کے نوجوان سوار تھے وہاں آکر رکی۔ مجاہد نے اپنا نام بتایا اور اچھل کر جیپ میں سوار ہو گیا اور انسپکٹر کو اس بنگلے کا راستہ بتانے لگا۔ جیپ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب لوگ اسی بنگلے میں پہنچ گئے جس میں مجاہد نے چار تخریب کاروں کو باندھا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے تیزی سے ان کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا۔ اب وہ کچھ کچھ ہوش میں آرہے تھے۔

دوسرے دن کے اخبار میں یہ خبر نمایاں تھی "ایک نوجوان کی مدد سے تخریب کاروں کا ایک اہم گروہ پکڑ لیا گیا۔ بہت سا اسلحہ بھی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس گروہ کی پشت پناہی شہر کا مشہور صنعت کار سیٹھ امجد کر رہا تھا۔ جو غیر ملکی تنظیم کا کارندہ تھا۔"

یقیناً جب تک مجاہد جیسے نوجوان اس پاک دیس میں بستے ہیں تب تک کوئی اس دیس کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟۔

پاکستان کے شہروں کے اعزازی نام

علی حسن لغاری، گوٹھ محمد حسن لغاری ماتلی

۱۔ پاکستان کا دل لاہور کو کہا جاتا ہے۔
۲۔ پاکستان کی دلہن کراچی کو کہا جاتا ہے۔
۳۔ پاکستان کا دماغ کراچی کو کہا جاتا ہے۔
۴۔ عقابوں کا شہر سرگودھا کو کہا جاتا ہے۔
۵۔ روشنی والوں کا شہر حیدر آباد کو کہا جاتا ہے۔
۶۔ کالجوں کا شہر لاہور کو کہا جاتا ہے۔
۷۔ ایشیاء کا برازیل اسلام آباد کو کہا جاتا ہے۔
۸۔ پاکستان کی شہ رگ ریاست جموں وکشمیر کو کہا جاتا ہے۔
۹۔ ایشیاء کا سوئٹزرلینڈ کشمیر کو کہا جاتا ہے۔
۱۰۔ پاکستان کا برمنگھم سیالکوٹ کو کہا جاتا ہے۔

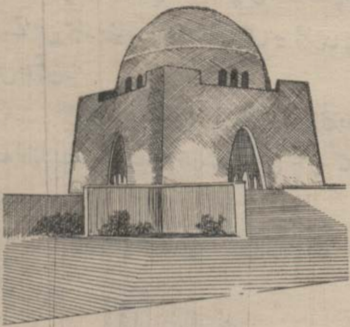

قائدِ اعظمؒ

محمد سعید گلاب، کورنگی، کراچی

پاکستان کا بانی تو ہے — دنیا میں لاثانی تو ہے
عزت پائی عظمت پائی — تو نے بے حد شہرت پائی
تو نے بے حد کام کیا — جگ میں اپنا نام کیا
بکھرے ہوؤں کو ایک بنایا — اک پرچم کے نیچے لایا
پاکستان رہے گا قائم
زندہ رہیں گے قائدِ اعظمؒ

کیا آپ جانتے ہیں؟

مرسلہ ...... محمد جمیل اشرف، گجرات

○ ...... ہمارا وطن پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا

گیارہواں بڑا ملک ہے۔
○ ...... اس میں ان گنت دریا اور ندیاں ہیں جبکہ دنیا کے ۱۶ ملکوں میں ایک بھی دریا نہیں ہے۔
○ ...... اس کا ایک بہت لمبا چوڑا ساحل ہے، جبکہ دنیا کے ۱۷ ملک چاروں طرف سے خشکی سے گھرے ہوئے ہیں۔
○ ...... ہمارے ملک میں گندم، کپاس، گنا اور چاول ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے ۴۵ ملکوں میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں۔
○ ...... ہمیں قدرت نے قدرتی گیس کے ذخیروں سے نوازا ہے، جبکہ ۷۷ ملکوں میں قدرتی گیس نہیں ہے۔
○ ...... ہم ان ۱۷ ملکوں میں شامل ہیں جو بجلی ایٹمی توانائی بھی پیدا کرتے ہیں۔

ایک حادثہ

تحریر، رافعہ تحسین، لاہور

"نہیں! میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ آخر آج تک اس ملک نے مجھے کیا دیا ہے۔ یہاں فائرنگ، کرفیو اور ہنگامہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ میں یہاں رک کر اپنی محنت کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں امریکہ جا رہا ہوں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

یہ کہتا ہوا وقاص اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ایسا نہ تھا؟ اس میں اتنی تبدیلی کیونکر واقع ہو گئی؟ کیوں یہ اپنے ملک سے بدظن ہو گیا ہے؟ ابراہیم صاحب کھڑے سوچتے ہی رہ گئے۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ وقاص اور نعمان جنہیں پیار سے وکی اور نومی کہا جاتا تھا۔ وقاص بڑا تھا۔ ذہین۔ سعادتمند ہر کلاس میں اچھی پوزیشن لینے والا۔ وقاص اب میڈیکل بھی پاس کر چکا تھا۔ اس نے بے حد اچھے نمبر لیئے تھے۔ نجانے کچھ دنوں سے کیوں اس پر باہر جانے کا بھوت سوار تھا۔ اسے اپنا ملک اپنا پاکستان برا لگنے لگا تھا۔ کیونکہ وہ اسے اس کی پسندیدہ ملازمت مہیا نہ کر سکا تھا۔ لیکن وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ اسی پاکستان نے اسے ایک ڈاکٹر بنایا ہے۔ وہ روز ہی ایسی باتیں کرتا تھا۔ لیکن آج تو اس نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ امریکہ جا رہا ہے۔

اس کی اس بات سے ابراہیم صاحب کو سخت دھچکا لگا۔ ان کا دل بھر آیا۔ اس خوبصورت ملک کو چھوڑ دے گا۔ اتنی قربانیوں سے حاصل ہونے والے ملک کو اس بے دردی سے چھوڑ دے گا۔ یہ ملک اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر کے جب ان سے ان کی توجہ اور سہارا چاہتا ہے۔ تو وہ اس کو چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ یہ ملک کس حسرت سے اپنے ان جگر گوشوں کو غیر ممالک میں جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔

نہیں وکی تم اپنی اس دھرتی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سے یوں سنگدلی نہیں برت سکتے۔ اس مادر وطن کو جس نے تمہیں اس قابل بنایا ہے۔ ابراہیم صاحب، کھوسے گئے۔ انہیں شاید پاکستان بنتے وقت اپنی قوم پر ہونے والے ظلم یاد آ گئے تھے۔

نومی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وکی امریکہ جائے۔ وہ اپنے بھائی سے بڑی محبت کرتا تھا۔ مگر اس نے وکی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس خیال سے کہ جہاں اسکے ابو ناکام ہو گئے۔ وہاں وہ کیا کر سکتا ہے۔؟

کچھ ہی دنوں میں وقاص کا پاسپورٹ، ویزا اور دیگر کاغذات تیار ہو گئے۔ اسکی پرواز منگل کو تھی اور آج پیر

کا دن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پیک شدہ سامان پر نظر دوڑا رہا تھا۔ یکایک ان کا نوکر شرفو کمرے میں داخل ہوا۔ "صاحب جی وہ وہ چھوٹے سرکار۔"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا نومی کو۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی وہ جی انہیں گولی لگ گئی ہے۔ بڑے صاحب اور بیگم صاحب انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔ جناح ہسپتال۔"

وقاص تیزی سے اٹھا۔ اس نے گیراج سے گاڑی نکالی اور آندھی کی رفتار سے ہسپتال پہنچا۔ سامنے ہی ابراہیم صاحب ٹہل رہے تھے۔ اور وقاص کی امی بیٹھی سسک رہیں تھیں۔

"ابو کیا ہوا ہے نومی کو؟"

"بیٹے اس کے کالج میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ زبردستی اس سے نعرے لگوانا چاہتے تھے۔ اس نے پاکستان کے خلاف نعرے لگانے سے انکار کیا تو انہوں نے گولی مار دی۔"

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟ زخم مہلک تو نہیں۔" وقاص نے پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں بیٹے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ لوگ اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اللہ اپنا رحم فرمائے۔" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ اور ڈاکٹر باہر آیا۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ "کیوں ڈاکٹر صاحب میرا بیٹا ٹھیک تو ہے نا"

ڈاکٹر نے کہا۔ "خدا کے فضل سے ہم اسے بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"کیا میں نومی کو دیکھ سکتا ہوں۔" وقاص نے بے

چین ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں...... مگر اس سے کوئی بات مت کیجئے گا" ڈاکٹر نے کہا۔

اگلے ہی لمحے وقاص نومی کے کمرے میں تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو نومی کے لب ہل رہے تھے۔ اس نے غور سے کان لگا کے سنا وہ کہہ رہا تھا...... "میں کبھی...... بھی...... نن...... نن...... نہیں...... بو...... بولوں...... گا...... پاک...... کستان...... کے...... خل...... لاف...... کبھی...... بھی...... نہیں۔"

وقاص چونک کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ اس حال میں بھی پاکستان کو یاد کر رہا ہے۔" اس نے بے ساختہ سوچا۔

نومی وقفہ وقفہ سے یہی فقرہ دہرا رہا تھا۔ وقاص حیرت سے نومی کو تک رہا تھا۔ ایک دو بار یہ فقرہ سن کر تو وقاص کو کچھ نہ ہوا مگر پھر رفتہ رفتہ اسے یہ فقرہ سن کر شرمندگی سی ہونے لگی۔ اس لگنے لگا جیسے وہ گندا ہو۔ جیسے وہ مدت سے نہایا نہ ہو۔ اپنے گندے ہونے کے احساس سے وقاص کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اور پھر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی چیز اس کے اندر بھر بھرا کر گئی ہو۔ چند گھنٹوں بعد اس کے ابا جان آئے اور بولے "بیٹا اب تم گھر جا کر آرام کر و کل تمہاری فلائٹ ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر انہیں

دیکھا اور گھر کی طرف چل پڑا ، نہ چاہنے کے باوجود۔ کار کی رفتار سے کہیں تیز اس کے خیالات تھے۔ گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور اپنے کاغذات اور ویزا وغیرہ نکال کر چند لمحوں تک انہیں دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے تمام چیزیں پھاڑ ڈالیں۔ واقعی خدا لوگوں کو عجیب و غریب طریقوں سے بدل دیتا ہے۔

قائد اعظمؒ کی باتیں

(نادیہ قادر خان)

ہندو اور مسلمان میں فرق

ایک دفعہ برطانوی حکومت کے ایک انگریز نمائندے نے قائد اعظمؒ سے کہا۔

"مسٹر جناح ! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مدت سے ایک جگہ رہتے ہوئے ہندو اور مسلمان اب یکایک الگ قومیں کیسے بن گئے۔ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ اکٹھے مطمئن زندگی نہیں گزار سکتے۔"

قائد اعظم نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کا سوال بے حد آسان ہے۔ ہندو اور مسلمان اکٹھے اس لئے زندگی نہیں گزار سکتے کہ ان میں سے ایک قوم جس جانور (گائے) کو دیوتا سمجھتی ہے وہی دوسری قوم کی خوراک ہے۔ بتائیے کیا یہ ممکن ہے کہ اتنے گہرے اختلاف کے بعد قومیں خوشی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔"

چھوٹا آدمی...... چھوٹی بات:

سردار پٹیل کانگریس کا ایک سنگدل اور بدمزاج لیڈر تھا۔ وہ سخت متعصب تھا اور مسلمانوں یا ان سے متعلق کسی بھی تحریک کا کھلا دشمن تھا۔ ایک بار اس نے اپنی تقریر میں پاکستان کے مطالبہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"پاکستان کا مطالبہ سائیکل ٹیوب کی طرح پھٹ گیا۔"

کسی اخبار نویس نے پٹیل کے اس بیان کی جانب قائد اعظمؒ کی توجہ دلائی تو انہوں نے برجستہ کہا۔

"چھوٹے آدمی سے ہمیشہ چھوٹی بات کی توقع رکھنی چاہئے۔"

بطخ پر پانی:

دہلی میں قائد اعظمؒ ایک بہت بڑی پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ ایک کانگریسی اخبار کا رپورٹر بار بار ان کی گفتگو میں مداخلت کرتا اور گھوم پھر کر ایک ہی سوال دہرائے جا رہا تھا۔ قائد اعظمؒ اس کے سوالات کا بار بار جواب دیتے۔ وہ کسی اور انداز میں پھر سے وہی سوال کر دیتا۔ جب وہ باز نہ آیا تو قائد اعظم نے کہا

"تمہارے سوال کا جواب دے کر میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے بطخ پر پانی پھینکا ہو جو پروں سے پھسل کر نیچے آجاتا ہے اور کوئی اثر نہیں کرتا"

اخبار نویس شرمندہ ہو کر قائد اعظمؒ کا منہ تکنے لگا اور پھر اس نے اپنا سوال دہرانے کی جرات نہیں کی۔

روپے کے بدلے سترہ آنے۔

تقسیم ملک کے آخری مرحلے میں انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور متحدہ ہندوستان کے ہندو مسلم لیڈروں کے درمیان آزادی کے مسائل پر بات چیت ہو رہی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کانگریسی لیڈروں سے بہت متاثر تھا۔ وہ قائد اعظمؒ سے ہر ملاقات میں کانگریسی لیڈروں کا نقطہ نظر سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ ایک ایسی ہی گفتگو میں جبکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوؤں کی وکالت کر رہا تھا قائد اعظمؒ نے فوراً کہا "وائسرائے صاحب! ہندو ایک چالاک قوم ہے اور اسے سمجھنا آسان نہیں۔ اس قوم کا ہر فرد ہمیشہ روپے کے سترہ آنے وصول کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ (واضح رہے کہ کبھی ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے)

بے تکلف دوست:

ایک دفعہ قائد اعظمؒ نے ایک تحریر پڑھنے کے لئے اپنا شیشہ نکالا۔ وہ ایک شیشے (عدسے) کی عینک لگاتے تھے۔ اچانک وہ ان کے ہاتھ سے گر پڑا۔ پاس کھڑے ایک بے تکلف دوست نے کہا۔

"مسٹر جناح اب تو آپ کو جھکنا پڑے گا"

قائد اعظمؒ یہ سن کر مسکرائے اور جیب سے دوسرا شیشہ نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

ہمارا وطن

تنویر احمد صدیقی

وطن کے لیئے ہم لٹائیں گے جاں!
وطن کو بنائیں گے اک گلستاں!
ہمارے دلوں کا سہارا وطن!
ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن!
جہالت کی ظلمت مٹائیں گے ہم!
دیئے علم و فن کے جلائیں گے ہم!
بنے گا درخشاں ستارا وطن!
ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن!
سنو پھول! میرا یہ ایقان ہے!
خدا خود ہی اس کا نگہبان ہے!
اندھیرے میں روشن منارہ وطن!
ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن!

فیصلہ

تحریر، سید حامد حسین شاہ۔ ملتان

روفی میاں کا کمرہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ رنگ

برنگی سینریاں ، طرح طرح کے گلدان ، بک شیلف ، ٹی وی ، ایک خوبصورت بیڈ۔ روفی میاں تو خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔ نئے گھر میں آتے ہی روفی میاں کو یہ کمرہ بھا گیا۔ ساتھ ہی ایک اور بڑا سا کمرہ تھا مگر وہاں روفی میاں کے سوتیلے بڑے بھائی ڈوبی میاں رہتے تھے۔ ڈوبی میاں کو بڑا کمرہ پسند تو بے حد تھا مگر روفی میاں کا سجا سجایا کمرہ انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اپنا کمرہ سجانے کی بجائے اس فکر میں گھلتے رہتے تھے کہ کسی طرح روفی میاں کو نکال باہر کردیں۔ ڈوبی اور روفی کے ممی ڈیڈی روفی کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتے تھے۔ جبکہ ڈوبی میاں سے ممی ڈیڈی بھی سخت ناراض تھے۔ مگر ڈوبی میاں اتنے چالباز تھے کہ شرارت ڈوبی میاں کرتے اور الزام روفی میاں کے سر آجاتا۔ ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ روفی میاں بازار سے ایک خوبصورت پینٹنگ خرید لائے۔ یہ پینٹنگ روفی میاں نے اپنا جیب خرچ بچاکر بہت مشکل سے خریدی تھی تاکہ ان کا کمرہ اور بھی خوبصورت ہوجائے۔ مگر جناب لڑاکے ڈوبی میاں کو تو یہ پینٹنگ ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں رہنے لگے کہ وہ پینٹنگ روفی میاں کے کمرے میں لگنے نہ پائے۔ روفی میاں نے پینٹنگ دیوار پر لگادی۔ دیوار بہت خوبصورت لگنے لگی تھی۔ اچانک ڈوبی میاں نہایت غصے میں چیختے چلاتے اندر داخل ہوئے اور زور زور سے بولنے لگے۔ "روفی روفی۔" روفی میاں ہوم ورک کررہے تھے ادب سے بولے "جی ڈوبی میاں کہئے کیسے تشریف لائے؟۔" "تم یہ پینٹنگ کس لئے لائے ہو؟ اس لئے کہ تم مجھ سے زیادہ خوبصورت کمرے کے مالک بن جاؤ، میں کمتر ہوجاؤں۔ اور، تم ہر وقت مجھ پر اور میرے دوستوں پر رعب جماتے رہو" ڈوبی میاں

غصے سے چلائے "ارے نہیں ڈوبی میاں میں تو صرف اس لئے پینٹنگ لایا ہوں تاکہ میرا کمرہ خوبصورت لگے اور میں اس میں خوشی سے رہ سکوں۔" "ہرگز نہیں تم جھوٹے مکار ہو" ڈوبی میاں پھر چلائے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "میں تم سے نپٹ لوں گا۔ تمہارے کمرے کو کباڑ خانہ نہ بنادیا تو میرا نام بھی ڈوبی نہیں" ڈوبی میاں یہ کہہ کر غصے سے چلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور روفی میاں سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ڈوبی میاں نے دھمکی تو دے دی مگر سوچنے لگے کہ روفی میاں کا کمرہ کیسے خراب کیا جائے۔ اگر وہ خود جاکر کوشش کرتے ہیں تو ممی ڈیڈی انہیں خوب ماریں گے۔ لہٰذا وہ دل ہی دل میں ترکیبیں سوچنے لگے "آیا بہت مزے کا خیال آیا" ڈوبی میاں خوشی سے اچھل پڑے۔

اگلے روز شام کا وقت تھا روفی میاں کھیلنے کیلئے باہر لان میں گئے ہوئے تھے کہ ڈوبی میاں چپکے سے کھڑکی پھاند کر روفی میاں کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے بڑے غور سے چاروں دیواروں کا جائزہ لیا۔ پھر بولے "کیا حال ہے پیاری بہنو۔" چاروں

دیواریں شاید اچھے موڈ میں تھیں۔ پہلے تو انہیں نک چڑھے ڈوبی میاں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے مگر آج شاید موسم بھی خوبصورت تھا لہٰذا دیواروں نے جواباً کہا۔ "اجی ڈوبی میاں آپ سنائیے یہ چوروں کی طرح آنے کا مقصد کیا ہے؟" ڈوبی میاں نے ادھر ادھر دیکھا پھر آہستگی سے سامنے والی دیوار سے بولے "ارے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ باقی دیواریں بہت پیارے روغن خوبصورت تصاویر سے سجی ہوئی ہیں اور آپ اتنی پھیکی پھیکی سی۔" سامنے والی دیوار نے پہلی مرتبہ غور سے ساتھ والی دیوار کو دیکھا۔ دائیں والی دیوار پر روفی میاں کے بچپن کی تصاویر تھیں۔ بائیں والی دیوار پر رنگ برنگے پردے۔ "ارے میں تو واقعی سب سے کم تر ہوں" سامنے والی دیوار نے سوچا۔ "مجھ پر تو صرف ایک کپڑے لٹکانے والی کھونٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ روفی میاں تو بڑے دغاباز ہیں باقی دیواروں کو اتنا سجایا سنوارا اور مجھ پر صرف ایک کھونٹی۔" ڈوبی میاں نے سامنے والی دیوار کو سوچوں میں غرق دیکھا تو چپکے سے باہر نکل گئے۔ اسی طرح دو تین دن میں ڈوبی میاں نے بقیہ تینوں دیواروں کو بھی بھڑکا دیا آخر کار جب سب دیواریں خوب غصے میں بھر گئیں تو ڈوبی میاں مطمئن ہو کر آرام سے اپنے بڑے کمرے میں جاکر تماشا دیکھنے لگے۔ اب روفی میاں کی تو شامت آگئی۔ وہ جب بھی کمرے میں داخل ہوتے ہر دیوار جلی بھنی ایک دوسرے سے لڑتی نظر آتی۔ پھر وہ سب روفی میاں کے پیچھے پڑ جاتیں ان کے لڑائی جھگڑے سے تو چھت بھی ہلنے لگی تھی۔

روفی میاں سب کو بہت سمجھاتے مگر وہ تو بس ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھیں آخر کار نوبت ہاتھا پائی تک آئی۔ اسی ہاتھا پائی میں کئی سینریاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ گلدان اوندھے ہو گئے دیواروں کا روغن اکھڑنے لگا۔ ڈوبی اپنے بڑے کمرے سے یہ منظر دیکھتے تو خوب قہقہے لگاتے۔ روفی میاں کی شامت آئی ہوئی تھی کبھی ایک دیوار کی منت کرتے تو کبھی دوسری کی۔ چھت زور زور سے کڑکڑاتی لگتا تھا جیسے اب گری کہ گری۔ روفی میاں کو اپنے کمرے کی فکر پڑ گئی۔ آخر کار ایک دن روفی میاں غصے سے چلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور دیواروں سے مخاطب ہوئے "میری بات غور سے سنو" تمام دیواریں خاموش ہو کر ان کی بات غور سے سننے لگیں۔ روفی میاں نے بات آگے بڑھائی "ہم سب کے وجود سے ہی یہ کمرہ قائم و دائم ہے۔ یہ کس قدر خوبصورت تھا۔ ہم سب خوش تھے مگر اب۔ اب ہمارے آپس کے جھگڑوں نے اس کمرے کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم مل جل کر امن سے رہیں۔ دیکھو اگر تم یونہی لڑتی رہیں تو یہ چھت ہم پر آگرے گی۔ ہم سب ملبے کا ڈھیر بن جائیں گے اس چھت کو اپنے اتفاق سے مضبوط کرو ورنہ ہمارا ملبہ ڈوبی میاں اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیں گے اور اپنے کمرے کو اور وسیع کر لیں گے۔ بولو تمہارا کیا ارادہ ہے جلد فیصلہ کر لو۔" روفی میاں یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور دیواریں فیصلہ کرنے لگیں۔ چند لمحوں بعد ایک دیوار نے چپکے سے روفی میاں کے کان میں کچھ کہا۔ روفی میاں مسکرانے لگے۔ دیواروں نے ان کی بات مان لی تھی۔

پاکستانی پرچم

سلیم اختر...... لاہور

پرچم کہنے کو تو کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے لیکن جب

اپنی نگارشات
صاف خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

نقل شدہ، طویل اور
غیر معیاری تحریریں شائع
نہ ہوسکیں گی

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

اسے کسی قوم کے ساتھ منسوب کر دیا جائے تو وہ اس قوم کا امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ پرچم قوم کی آزادی اور خود مختاری کی علامت ہوتا ہے۔

پاکستان کا قومی پرچم پہلی بار ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی کراچی کے پہلے اجلاس میں پیش کیا۔ اور ۱۴ اگست کو ملک کے طول و عرض کے علاوہ بیرون ملک کے پاکستانی سفارت خانوں میں بھی پاکستانی پرچم بڑی شان سے لہرایا گیا۔ ہمارے پرچم میں دو رنگ ہیں گہرا سبز اور سفید اور بیچ میں چاند ستارہ ہے۔ گہرا سبز رنگ سرسبزی، شادابی اور خوشحالی کو ظاہر کرتا ہے جبکہ سفید رنگ اقلیتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ دونوں رنگ مل کر آپس میں پیار محبت، خوشحالی، یکجہتی اور یکساں انصاف کو ظاہر کرتے ہیں، گہرے سبز رنگ کے بیچ میں چاند کا رخ بائیں جانب اوپر کے کونے کی طرف ہے چاند ترقی کو ظاہر کرتا ہے۔ درمیان میں پانچ کونوں والا ستارہ ہے ستارہ علم اور روشنی کو ظاہر کرتا ہے۔ ستارے کے پانچ کونے اسلام کے پانچ ارکان کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج ظاہر کرتے ہیں۔

خاموش پرندے

نفیس، یوسف اسلام آباد

میں تین سال بعد جب اپنے گھر واپس آیا تو سب لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس سال مجھے چار ماہ کی چھٹیاں ملی تھیں۔ میں نے اپنے کمرے کو ٹھیک کیا اور ٹائم ٹیبل بنانے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک مجھے چڑیوں کے چہکنے کی آوازیں سنائی دی۔ میں دوڑ کر اپنے کمرے کے روشن دان پر پہنچا تو دیکھا ایک چڑیا اور چڑا اپنا گھونسلہ بنانے میں مصروف ہیں۔ میں نے کچھ سوچا اور دل ہی دل میں ان کو گھونسلہ بنانے کی اجازت دے دی۔ پھر میں نے کچھ عرصہ ان پر دھیان نہ دیا۔ ایک دن جب میں نے ان کے گھونسلے میں جھانکا تو دیکھا کہ تین ننھے منے انڈے پڑے تھے۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ان کی نگرانی شروع کر دی۔ کچھ عرصے بعد ان میں سے بچے نکل آئے۔ چڑیا اور چڑا صبح صبح ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے چلے جاتے اور وقفہ وقفہ سے آکر اپنے منہ سے کچھ دانے ان کو کھلاتے۔ رفتہ رفتہ وہ بچے بڑھنے شروع ہو گئے مگر ابھی وہ اڑنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ ایک روز میں کرکٹ کھیل کر واپس آیا تو دیکھا ایک سیاہ بلا گھونسلے پر بیٹھا ہے اور اس کے اوپر چڑیا چکر کاٹ رہی ہے۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ بلا چڑیا کے تینوں بچوں کو کھا گیا ہے۔ میں نے غصے سے بلے کو جوتا پھینک کر مارا وہ تو بھاگ گیا مگر چڑیا اور چڑا شور مچاتے رہے۔ چند دنوں بعد وہ ہمیشہ کے لئے کسی اور مضبوط ٹھکانے کی طرف چلے گئے اور اب میں روزانہ ان کا بچا کھچا ویران گھونسلہ

دیکھتا ہوں جس کے تنکے بکھر چکے ہیں جس پر اداسی کا راج ہے۔ بالکل ہمارے دیس کی طرح۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سا احساس دل کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم چڑیا کے ننھے منے بچے ہیں اور ان گنت کالے بلے ہمیں کھانے کے لئے جھپٹ رہے ہیں۔ ایسے جیسے ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جائیں گے۔ لیکن کیا ہم بھی چڑیوں کی طرح کمزور ہیں؟۔

پاکستان کے مختلف شہروں کے اعزازی نام

مرسلہ ...... فیصل حمید فاروقی، کراچی

(۱) روشنیوں کا شہر کراچی کو کہا جاتا ہے۔
(۲) پاکستان کا عراق ثانی ٹھٹھہ کو کہا جاتا ہے۔
(۳) پاکستان کا وینی پگ فیصل آباد کو کہا جاتا ہے۔
(۴) قدیم شہر ملتان کو کہا جاتا ہے۔
(۵) اولیاء کا شہر ملتان کو کہا جاتا ہے۔
(۶) نمک کا شہر کھیوڑا کو کہا جاتا ہے۔
(۷) پاکستان کا ثمرستان کوئٹہ کو کہا جاتا ہے۔
(۸) پاکستان کا سوئیزر لینڈ کاغان کو کہا جاتا ہے۔

غلامی کے آثار

مرسلہ۔ طارق محمود انجم ...... رحیم یار خان

ہم لوگ نہ قومی نہ عوامی ہیں ابھی تک
انگریزی و انگریز کے حامی ہیں ابھی تک
چالیس برس بیت چکے ہیں مگر افسوس
اس قوم میں آثار غلامی ہیں ابھی تک

نشان حیدر

عاطف غفار ...... کراچی

نشان حیدر حضرت علیؓ سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ اسی فرزند توحید کو دیا جاتا ہے جو اسلام کی سربلندی، ملک اور قوم کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

نشان حیدر: پانچ کونوں کا ایک ستارہ ہے۔ اسی میں ہیرے کا چاند اور ستارہ بنا ہوتا ہے۔ باقی تمغہ توپ کی دھات یار گ ، کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ ستارے کے کونوں کے کنارے سفید انیمل کی ہوئی تانبے اور نکل کے مرکب دھات سے تیار ہوتے ہیں اس کا فیتہ ریشمی اور سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ فیتے کی چوڑائی ڈیڑھ انچ ہوتی ہے۔ جب اسے تمغہ کے ساتھ بنا جاتا ہے تو ربن کے ساتھ اس پانچ کونے والے ستارے کی ایک مختصر سی شبیہ لٹکا دی جاتی ہے۔ نشان حیدر کی شبیہ کی اوپر والی پٹی پر جلی حروف میں نشان حیدر کندہ ہوتا ہے۔

ستارے کی پشت پر نشان حیدر پانے والے سپاہی کے بارے میں مختصر معلومات درج ہوتی ہیں۔ جس میں اس سپاہی کا فوجی نمبر، شہادت کا مقام، لفظ شہید اور تاریخ و سال شہادت لکھا ہوتا ہے۔

پاکستان کا یہ سب سے بڑا اعزاز اب تک آٹھ نامور سپاہی حاصل کر چکے ہیں۔

پہلا نشان حیدر کیپٹن راجہ سرور شہید کو ملا جو ۲۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو کشمیر کے محاذ پر شہید ہوئے۔

دوسرا نشان حیدر میجر طفیل محمد کو دیا گیا وہ ۱۷ اگست ۵۸،۱۹ء کو لکشمی چور (مشرقی پاکستان) کے محاذ پر وطن کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

تیسرا نشان حیدر میجر راجہ عزیز بھٹی کا مقدر بنا

جنھوں نے ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لاہور کے محاذ پر بھارتی فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہادت پائی۔

چوتھا نشان حیدر پائلٹ آفیسر راشد منہاس نے حاصل کیا۔ انہوں نے یہ اعزاز ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کو ٹھٹھہ کے قریب پاکستان کے ایک تربیتی طیارے کو گرا کر حاصل کیا جس میں وہ خود ایک تربیتی پرواز پر تھے۔ اسی طیارے کو غدار انسٹرکٹر مطیع الرحمٰن بھارت لے جانا چاہتا تھا۔ طیارہ تباہ ہونے سے راشد منہاس شہید ہوگئے اور غدار جہنم رسید ہوا۔

پانچواں نشان حیدر میجر محمد اکرم شہید نے پایا۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہلی (مشرقی پاکستان) کے مقام پر وطن دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

چھٹا نشان حیدر میجر شریف بشیر شہید کے نام کی زینت بنا جنھوں نے چھ دسمبر ۱۹۷۱ء پاک بھارت جنگ کے دوران گور مکھیرہ کے محاذ پر جام شہادت نوش کیا۔

ساتواں نشان حیدر سوار محمد حسین کو ملا جنھوں نے دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کرنے کے لئے پاکستانی فوجیوں کی رہنمائی کی اور بھارتی فوج کو شکست سے دوچار کرتے ہوئے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہرڑ خورد کے میدان میں شہید ہوئے۔

آٹھواں نشان حیدر لانس نائیک محمد محفوظ کو دیا گیا۔ انہوں نے ۱۶ دسمبر کو پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے دوران "پل کنجری والا" معرکہ میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے شہادت کو گلے لگایا تھا۔

قوم کا مستقبل

اشفاق، احمد راحیل
..... شکارپور

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔

پرویز اپنے ننھے سے ہاتھوں میں ٹافیوں کی ٹوکری اٹھائے سوچ رہا تھا کہ وہ خالی ہاتھ گھر کیسے جائے اس کا باپ اسے بہت مارے گا کیوں کہ اس کی اب تک ایک بھی ٹافی نہیں بکی تھی۔ وہ اداس چلا جا رہا تھا۔

پرویز ایک غریب لڑکا تھا۔ عرصہ ہوا اس کی ماں فوت ہو چکی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا، اس کی ماں بھی اسے جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس کا باپ بات بات پر اسے مارتا اور جب وہ روتا ہوا اپنی ماں کی گود میں منہ چھپاتا تو اسے ایک عجیب قسم کا آرام اور سکون ملتا۔ اس کا باپ نشہ کرتا تھا، کوئی کام نہ کرتا۔ پرویز کی ماں ہی گھروں میں کام کر کے گھر کی گاڑی چلا رہی تھی۔ گھر کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا اوپر سے جب پرویز کا باپ پیسے مانگتا تو اس کے انکار کرنے پر اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ پرویز یہ سب کچھ دیکھتا اور اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ پرویز کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی ماں نے شوہر سے کچھ پیسے بچا کر پرویز کو کتابیں دلا دی تھیں جن کو وہ چھپ کر رات کو پڑھتا۔

مسلسل کام محنت اور بے آرامی کی وجہ سے پرویز کی ماں بیمار رہنے لگی لیکن پھر بھی وہ کام کرنے جاتی جس سے اس کی طبیعت اور بگڑ گئی اور پھر ایک رات وہ ایسی سوئی کہ دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ اس روز پرویز خوب رویا۔ دنیا میں ایک ماں ہی اس کی تھی وہ بھی نہ رہی۔ ان کے گھر کی حالت دیکھ کر ایک بھلے مانس نے پرویز کو ٹافیوں کی ایک ٹوکری لا کر دی۔ اب وہ ٹافیاں بیچتا۔ جب شام کو

گھر جاتا تو اس کا باپ اسے مارتا اور اس سے سارے پیسے چھین لیتا۔ اچانک تالیوں کی آواز سے پرویز کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس نے دیکھا میدان میں شامیانے لگے ہوئے تھے نیچے قطار در قطار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک اونچی سی جگہ پر ایک اسٹیج بنایا گیا تھا جسے خوبصورت بلبوں اور قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ اتنے میں ایک بڑی سی گاڑی وہاں آکر رکی۔ سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ گاڑی سے ایک خوش پوش صاحب باہر نکلے جن کو ہار پہنائے گئے اور تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا گیا۔ پرویز بھی ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان صاحب کو تقریر کرنے کے لئے اسٹیج پر بلایا گیا۔ ان صاحب نے کہا۔ "جیسا کہ آپ سب کو پتہ ہے کہ ہم یہاں محنت کش بچوں کے سلسلے میں جمع ہوئے ہیں۔ بچے ہماری قوم کا سرمایہ اور ہماری قوم کا مستقبل ہیں۔ ملک کی باگیں انہی سواروں کے ہاتھوں میں ہیں۔
غریب بچے جن کو پڑھنے کا بہت شوق ہوتا ہے وہ اپنی غربت اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ صاحبان آپ خود سوچیں کیا یہ عمر ان بچوں کے کام کرنے کی ہے؟ جن ہاتھوں میں قلم ہونا چاہئے ان ہاتھوں میں محنت مزدوری کی وجہ سے چھالے پڑ گئے ہیں۔ بچے قوم کا افتخار ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم ان کی بھلائی اور بہتری کے لئے سوچیں اور غریب بچوں کو مفت تعلیم دلائیں تاکہ وہ آگے چل کر معاشرے کے کار آمد اور مفید فرد بن سکیں۔"
حاضرین نے تالیاں بجائیں اور "ہاشم صاحب زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ ہاشم صاحب واپس اسٹیج پر بیٹھ گئے اور لوگوں نے بھی تقریریں کیں۔ جب تقریب ختم ہوئی تو ہاشم صاحب واپس اپنی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں پرویز ان کے قریب آیا اور کہا۔ "صاحب ......" ہاشم صاحب نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہے...... ؟" "صاحب جی! ...... میں بہت ...... غریب ہوں ...... مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے ......" پرویز نے رک رک کر کہا۔

"ہونہہ! پڑھنے کا شوق ہے۔" ہاشم صاحب نے نفرت سے کہا۔ "تم جیسے فقیر بھی پڑھنے لگے تو ہمارے بیٹے کہاں جائیں گے۔ جاؤ بھاگ جاؤ" کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے بچوں کو قوم کا مستقبل کہا تھا۔

بڑھتے ہی جاؤ

فضل احمد فانی ...... ربوہ

ترقی کی راہوں پہ بڑھتے ہی جاؤ
قدم اپنے منزل کی جانب بڑھاؤ
بلندی پہ ہوں سب ارادے تمہارے
زمانے کو تم اپنے جوہر دکھاؤ
ہر اک دل میں پیار و محبت بسا کر
کدورت، عداوت کے شعلے بجھاؤ
صداقت، شجاعت، محبت کے پیکر
بنو خود بھی اور دوسروں کو بناؤ
نہ چھوڑو کبھی آج کا کام کل پر
جو کرنا ہے کل وہ ابھی کر دکھاؤ

خواب

شازیہ جمیل

دسمبر کی ایک سخت سرد اور تاریک رات تھی۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔ کراچی جیسے بارونق شہر میں بھی ابھی سے سناٹا طاری تھا۔ زیادہ تر لوگ اپنے گھروں میں لحافوں میں گھسے، خشک میووں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایسے میں صدر کی ایک فٹ پاتھ پر ایک تیرہ سالہ لڑکا اس طرح سکڑا سمٹا بیٹھا تھا گویا ان یخ بستہ ہواؤں سے خود کو بچانا چاہتا ہو۔ سردی سے بچاؤ کے لئے اسکے جسم پر صرف ایک سوئٹر تھا جو کئی جگہوں سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے گزرے دن ایک تواتر سے یاد آرہے تھے۔ اس کا نام انور تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کی ماں نے ایک کوٹھی میں ملازمت کرلی۔ اور وہ اسی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہنے لگے۔ اس بیوہ عورت نے اپنی ساری امیدیں انور سے وابستہ کرلیں۔ وہ اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی تھی۔ انور خود بھی ایک محنتی لڑکا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ پڑھنے لکھنے میں لگادی۔ وہ پہلی سے ساتویں تک ہر جماعت میں اول پوزیشن لایا تھا۔ لیکن ایک روز انور کی ماں سڑک پار کرتے ہوئے بس کے نیچے آکر ہلاک ہوگئی۔ اس روز انور بلک بلک کر رویا۔ ساری دنیا میں ایک ماں ہی اس کا سہارا تھی وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس کی دنیا اندھیری ہوگئی تھی۔

ماں کی یاد آتے ہی اس کے آنسو میں شدت پیدا ہوگئی۔ اب وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ آج اس کی ماں کو فوت ہوئے تیسرا دن تھا۔ صبح بیگم صاحبہ نے اسے بلا بھیجا اور نئی نوکرانی کے آنے کی خبر سنا کر اسے کوارٹر خالی کرنے کا حکم صادر کردیا۔ انور کا معصوم دل اس سنگدلی اور حالات کی تبدیلی پر پریشان تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب کہاں جائے۔ کیوں کہ اس نے تو شعور کی آنکھ اسی کوارٹر میں کھولی تھی اور ماں کے سوا کسی رشتہ دار کو دیکھا نہ تھا۔ اس نے چھوٹا موٹا سامان اٹھایا اور اس بڑے شہر کی سڑکوں پر آنکلا۔ سارا دن وہ مارا مارا پھرا مگر کہیں بھی ٹھکانہ نہ ملا۔ کوئی اسے فقیر سمجھا تو کوئی چور اچکا۔ غرض کوئی بھی اسے اپنے گھر رکھنے یا کام دینے کو تیار نہ تھا۔ شام کو تھک ہار کر وہ اس فٹ پاتھ پر آبیٹھا جہاں وہ اب اپنے بیتے دن یاد کر رہا تھا۔ لوگوں کی بے حسی اور اپنی بے کسی کا خیال کر کے وہ اور زیادہ رونے لگا اور یونہی روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ سوتے میں اس نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا جو کہہ رہی تھی "بیٹے میں نے تمہیں بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ اس کے لئے میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائیں تھیں اور تم یوں حوصلہ ہار بیٹھے ہو۔ زندگی میں برا وقت ہر کسی پر آتا ہے۔ میرے بیٹے۔ اٹھو! ہمت کرو۔ دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے خود اپنی منزل

تلاش کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ "
دیکھا جو کہہ رہی تھی "بیٹے میں نے تمہیں بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ اس کے لئے میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائیں تھیں اور تم یوں حوصلہ ہار بیٹھے ہو۔ زندگی میں برا وقت ہر کسی پر آتا ہے۔ میرے بیٹے اٹھو! ہمت کرو۔ دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے خود اپنی منزل تلاش کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ "

اس کے ساتھ ہی انور کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ہونے والی تھی۔ انور نئی صبح کی طرح ایک نئے حوصلے کے ساتھ اٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ محنت مزدوری کر کے تعلیم حاصل کرے گا اور اپنے مستقبل کو کبھی بھی اس رات کی طرح سرد اور تاریک نہ ہونے دے گا۔ بلکہ اپنی محنت سے ایک روشن حیات حاصل کر کے اپنی ماں کے خواب کو پورا کرے گا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ یادیں اور خواب بھی کتنے اہم ہوتے ہیں۔ اگر انور کو ماں یاد نہ آتی یا اسے خواب نظر نہ آتا تو کون جانے اس کی زندگی کا کیا بنتا؟۔

ٹھٹھہ کی سیر

مہہ وش خان۔ کراچی

چھٹیاں ایک نعمت ہیں۔ اکثر بچوں کی زبان پر یہ مقولہ ہوتا ہے۔ جو نالائق بچے ہوتے ہیں وہ تو واقعی چھٹیوں کو نعمت کہتے ہیں مگر ذہین بچوں کے لئے چھٹیاں ایک عذاب ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بات تو طے ہے کہ چھٹیاں گزارنے کا اپنا ہی ایک مزا ہوتا ہے۔ یہ پچھلے سال کا ذکر ہے کہ جب میری سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم سب نے ٹھٹھہ جانے کا ارادہ کیا۔ ہم نے سیر کے لئے جمعہ کا دن منتخب کیا۔

امی نے صبح ہی کھانے کی چیزیں بنا کر ٹفن میں رکھ لیں۔ ہم بھی صبح جلدی اٹھ کر تیار ہوگئے اور یوں آخر ہم صبح آٹھ بجے ٹھٹھہ کے لئے گھر سے نکلے۔ سفر بہت خوشگوار گزرا کیوں کہ ایک تو راستے میں حسین مناظر دیکھنے نے ان کو بھر دیا ہے۔ قبرستان دیکھنے کے بعد ہم شاہجہاں مسجد (جو کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے تعمیر کرائی تھی) گئے۔ وہاں ہم نے نماز پڑھ کر کھانا کھایا اور پھر سیر کی۔ شاہجہاں مسجد کے چاروں طرف ایک بہت بڑا اور سرسبز باغ ہے۔ اس باغ کی خوبصورتی قابل دید ہے۔ اس مسجد کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے مصوری کے فن کو واضح کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کی جگہ مختلف فاصلوں پر گنبد بنائے گئے ہیں۔ اگر ایک گنبد کے پاس کھڑے ہو کر کچھ بولیں تو سارے گنبدوں میں وہ آواز گونجتی ہے اس مسجد کا مین گیٹ بہت بڑا ہے اور اس کے اوپر محراب نما ستون بنا کر نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت حوض کو ملے اور پھر وہ سردیوں کی خنک صبح تھی۔ ہاں تو بالاخر ہم دو گھنٹے میں ٹھٹھہ سے قریب واقع مکلی کے قبرستان پہنچ گئے۔ مکلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں بڑے بڑے بادشاہوں، وزیروں اور عالموں کی قبریں مزار اور مقبرے ہیں جو مختلف رنگوں کے پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ اور ان پتھروں پر مختلف قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ مقبروں پر قرآنی آیات، سورتیں اور احادیث کھدی ہوئی ہیں۔ مکلی میں ۱۴۰۰ء سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کی قبریں موجود ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پرانا قبرستان ہے۔ ہر قبر و مقبرے کے سامنے بورڈ پر اس کی تاریخ اور اس میں دفن

بادشاہ یا عالم کی حکومت کے دور، اس کی پیدائش اور موت کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ اس قبرستان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سیر کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسی دور میں پہنچ گیا ہو جس زمانے کا یہ قبرستان ہے۔ ہم نے قبرستان کی سیر کی اور وہاں کی مختلف اشیاء کی تصاویر اتاریں۔ مکلی میں ایک بہت بڑا سبز رنگ کا مزار ہے۔ اس مزار پر گہرے سبز رنگ کا جھنڈا بھی ہر وقت لہراتا رہتا ہے۔ یہ مزار کسی بہت پہنچے ہوئے بزرگ کا ہے۔ ہم نے وہاں جاکر فاتحہ پڑھی۔ اس مزار میں اور بہت سے عالموں کی قبریں بھی ہیں۔

یہاں مختلف قسم کے کنوؤں کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے لیکن اب زمانے کے طول و عرض اور مٹی کنکروں نے انہیں بھر دیا ہے۔ اس میں ایک فوارہ بھی ہے۔ اس مسجد کی دیواروں پر انتہائی خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور اس زمانے کی زبان میں مختلف اقوال بھی لکھے ہوئے ہیں۔ عرض کہ یہ مسجد فنکاری کا ایک اعلیٰ اور حسین نمونہ ہے۔

مسجد دیکھنے کے بعد ہم نے شہر کی سیر کی اور پھر واپسی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم چوکھنڈی کے قبرستان میں رکے۔ یہاں بھی مختلف قبریں اور مقبرے ہیں اور ان سب کے شروع ہونے سے پہلے ایک بورڈ پر ان کی تفصیلات درج ہیں۔ آگے جاکر ان کے درمیان بوگن والا کی بیلیں لگی ہوئی ہیں۔ عورتوں کی قبروں پر پتھروں کے زیورات کے نمونے دکھائے گئے ہیں اور مردوں کی قبروں پر پتھروں سے بنے ہوئے مختلف قسم کے تاج کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ یہاں پر بھی مقبروں پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ان قبروں پر پتھر رکھے گئے ہیں جو گل کاری کا بہترین نمونہ ہیں لیکن اب کچھ پتھر ٹوٹ کر گر چکے ہیں۔

اس قبرستان کی سیر کے بعد ہم واپس چلے اور یوں ہماری اس حسین سیر کا اختتام ہوا۔

یہ سیر میری زندگی کی یادگار سیر ہے اور یہ دن میں کبھی بھی بھلا نہ پاؤں گی۔ یہ قبرستان اتنا سحر انگیز ہے کہ ہمیں کبھی کسی تفریحی مقام پر مکلی سے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ ویسے قبرستان میں جاکر تفریح کرنا ذرا ہے عجیب سی بات۔ مگر جناب ہمارے یہاں تو بہت سی عجیب باتیں ہورہی ہیں۔ ایک اور کے اضافے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

ریکارڈ

ویوین رچرڈز نے آسٹریلیا کے خلاف آل راؤنڈ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلی اننگ میں ۲۰۶ رنز کی شاندار اننگ کھیلی (دوسری اننگ میں بدقسمتی سے صفر پر آوٹ ہوگئے) فیلڈنگ کی باری آنے پر ایک وکٹ حاصل کی اور بطور ایمرجنسی (Emer-gency) وکٹ کیپر کے ایک کیچ بھی پکڑا، آل راؤنڈ کارکردگی کا یہ بے نظیر مظاہرہ ۸۵-۱۹۸۴ میں میلبورن کے مقام پر دیکھنے میں آیا۔

"عجیب پاگل" عامر سلیم مارچ ۱۹۹۰ء
"ندامت" عدنان ادریس جون ۱۹۹۰ء
"سپاہی اور جن" سید شاہد میر جولائی ۱۹۹۰ء

تینوں کہانیاں نقل شدہ تھیں۔ ثبوت فراہم کرنے پر ادارہ .... ظفر محمود منہاس، خانیوال۔ احمد حسین گوجر خان۔ جواد شفیق فیصل آباد۔ شگفتہ، کراچی۔ عبدالقیوم فتح محمد قریشی حیدر آباد۔ ناظمہ خان زئی، کراچی۔ احسن فیروز، لاہور سبین مرتضیٰ حیدر آباد کا ممنون ہے۔ (ادارہ)

قلمی دوستی

مختلف مہینوں میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

فہد علی خان، چہارم
۲۸ر جولائی ۱۹۸۱ء
کرکٹ کھیلنا اور دیکھنا
حساب، فوج میں جانا چاہتا ہوں ۴۳۶۔
سی پی برار سوسائٹی کراچی نمبر ۵، فرسٹ فلور

خالد محمود مغل، ہفتم
۱۲ر اگست ۱۹۷۶ء
مطالعہ کرنا، کرکٹ
سائنس، ڈاکٹر۔ مکان نمبر ۵ گلی نمبر ۳۰
ایف سیکٹر منظور کالونی کراچی نمبر ۴۴

عمران سہیل بوبی،
۹ر جولائی ۱۹۷۴ء
غریبوں کا ساتھ دینا
پرندوں سے پیار، سائنس، انگلش، انجینئر
۱۱ر سندھو کالونی گلی نمبر ۲۔ اوکاڑہ

ثناء اللہ ثاقب بلوچ، دہم
۱۵ر سال
شاعری، سائنس
ڈاکٹر۔ گورنمنٹ ہائی اسکول
کہداں دشت ضلع تربت مکران، بلوچستان

شکیل حیدر، ہشتم
۲۵ر جولائی ۱۹۷۷ء
ٹکٹیں اور سکے جمع کرنا
انگلش، سائنس، ڈاکٹر۔ محمد اقبال خان
نیازی نیوز ایجنٹ بکسٹال ریلوے اسٹیشن کندیاں ضلع میانوالی

راشد علی، سوم
۷ر سال
کرکٹ کھیلنا، انگلش
پائیلٹ
پوسٹ بکس نمبر ۴۰۸۹ دوحہ قطر

محمد احمد شاہین، دہم
۳ر جولائی ۱۹۷۳ء
کہانیاں پڑھنا، ریاضی
انجینئر۔ رانا محمد جمیل خان
حسین آباد کالونی، رحیم یار خان

عمیر عبد الغیث، چہارم
۹ر سال
معلوماتی کتابیں پڑھنا
سائنس، پائیلٹ۔ ایف ۴/۶۵
فیڈرل کیپٹل ایریا، کراچی

امیرزادہ، یاسر، دہم
۱۴ر اپریل ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی کرنا۔ ریاضی
جو خدا کو منظور۔ کتابستان بک سیلرز
بازار بٹ خیلہ مالاکنڈ ایجنسی

محمد یونس، ہفتم
۱۵ سال
آنکھ مچولی پڑھنا
سائنس، انجینئر۔ مکان نمبر ۵/۸ نظامی
روڈ، جیکب لائن کراچی

محمد مجاہد مصطفیٰ II ایئر
۱۶ سال
قلمی دوستی، مطالعہ
بیالوجی، ڈاکٹر۔ ڈاکخانہ عثمان کوریہ
مستانہ شاہ جمال، تحصیل و ضلع مظفر گڑھ

دانش رضا، ششم
۱۰ سال
ٹکٹ جمع کرنا، سائنٹس
چیف جسٹس گلی نمبر ۳۷ گھر نمبر
پی ۳۷ ۱۱/۱۰/ایف اسلام آباد

فائز علی شاہ، دہم
۲۹ نومبر ۱۹۷۴ء
مطالعہ کرنا، بائیالوجی
ڈاکٹر بنیں گے۔ محلہ میاں گان گاؤں
بدرشی، تحصیل نوشہرہ، ضلع پشاور

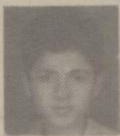

مبشر علی زیدی فرسٹ ائیر
یکم جولائی ۱۹۷۴ء
کرکٹ، مطالعہ
اکاؤنٹنگ، چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ
آر ۶۹، بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

محمد فرمل شریف، پنجم
۵ نومبر ۱۹۷۹ء
ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
اردو، فوجی بنیں گے۔ ۴/۱۴۰ - سی ۱
ناظم آباد نمبر ۱، کراچی نمبر ۱۸

عامر زبیر شاکر، نہم
۱۵ سال
ٹکٹیں جمع کرنا۔
اسلامیات، وکیل۔ عامر زبیر شاکر کلاس نہم
پی دو نمبر ۳۷ گورنمنٹ ہائی سکول 99/10R تحصیل و ضلع خانیوال

جہانزیب خان، X
۱۸ سال
کتابوں پر تبصرہ کرنا
ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں، میانوالی کالونی
نزد دلکشا مسجد، میوہ شاہ روڈ کراچی

محمد فیصل ولد عبدالرشید
۱۲ سال
کرکٹ کھیلنا
انجینئر بننا چاہتا ہوں، مسلم
کریانہ اسٹور بمبئی بازار ٹنڈو آدم ضلع سانگھڑ

نفیس احمد، گیارہویں
۲۵ جولائی ۷۲ء
اخبار پڑھنا، اسلامیات
بزنس مین بنوں گا۔ پھلیلی چار ٹانگہ
اسٹینڈ حیدرآباد، سندھ

ظفر اسلام شیخ، انٹر
۲۰ سال
ہر آدمی کو ہنسانا، مذاق
کرنا، اردو، اسلامی کلچر، بینک مینجر
نزدیک ٹی وصدر تھانہ غوثیہ کالونی شرقو دکانڈ جیکب آباد

سید ذیشان شہزاد
۲۶ جون ۱۹۸۱ء
کرکٹ کھیلنا، حساب
پائیلٹ بنوں گا۔ مکان نمبر I-۱۳۵۱
گلی نمبر ۲۲، اعظم بستی کراچی ۴۴

شوکت اقبال ہاشمی، ہفتم
یکم جنوری ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا، آنکھ مچولی
پڑھنا، انگلش، سائنس، ڈاکٹر۔ تحصیل و
ضلع خوشاب بمقام منگور ڈاکخانہ کرپالکہ

جمیل احمد،
۲ اگست ۱۹۷۶ء
رسائل پڑھنا
اردو، فوجی ۱۷/۱ اے ایریا
لیاقت آباد کراچی نمبر ۱۹۔

محمد عامر رضا، ہشتم
۷ ستمبر ۱۹۷۵
آنکھ مچولی پڑھنا،
انگلش، اے سی۔ چک نمبر ۳۷/ای بی
تحصیل عارف والا ضلع ساہیوال

چونکہ "سالگرہ کے ساتھی" اپنے اختتام کو پہنچا اس لئے ہم اس ماہ مختلف مہینوں میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا ملا جُلا تعارف محض اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تصاویر اور تعارف بھجوا چکے تھے۔ آنکھ مچولی کا نیا سلسلۂ تعارف آئندہ ماہ سے شروع ہو گا۔ اس نئے تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک ہو سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام،. کوئی اور کارنامہ ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ...... آپ کے تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BESTOFMONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تا کہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جا سکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہو سکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۲۶۱ پر موجود ہے۔

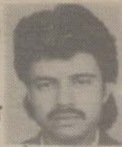

راجہ محمد علی ، دہم
۴؍نومبر ۱۹۷۱ء
آنکھ مچولی پڑھنا
اسلامیات ، بزنس مین۔ مکان نمبر ۱۵۰
این۔ محلہ وارث خان گلی نمبر ۳۲ راولپنڈی

محمد عارف پردیسی، دہم
۱۸؍سال
قلمی دوستی کرنا اسلامیات
فوجی ۔ محمد عارف پردیسی
محلہ گوجر موڑہ رنگیلا روڈ ، ہری پور

عتیق الرحمٰن سکندری
۲۹؍جولائی ۱۹۷۲ء
کرکٹ کھیلنا ،
اردو ، کرکٹر۔ کاشانہ نور جہاں
سکندر گول بلڈنگ ، کھوکھر محلہ ، حیدر[آباد]

راجا سلیم اللہ ، نہم
۱۳؍سال
کرکٹ ، معلومات، شاعری
جانوروں کا ڈاکٹر ۔ راجہ افتخار اللہ (مرحوم)
مکان نمبر ۱۷، ۵ گلی نمبر ۳ کرنال پورہ نزد وحدت کالونی لاہور

محمد معصوم سندیلہ ، دہم
۱۴؍جولائی ۱۹۷۳ء
اردو ، سندھی رسائل پڑھنا
عربی ، اسلام کی خدمت کرنا ۔ ڈاکخانہ احمد پور
براستہ پیر گوٹھ تحصیل و ضلع خیر پور (میرس)

اورنگزیب میمن (نوری)
۱۱؍سال
ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی
حساب ، پائیلیٹ اورنگزیب میمن
مکان نمبر ۱۲۷ بی ۔ II موتی بازار نوابشاہ سندھ

محمود علی خان ، ہشتم
۱۳؍سال
کرکٹ ، حساب، اسلامیات
کرکٹر ۴۳۶ سی بی ۔ برار سوسائٹی
دھوراجی ، کراچی

شاہد قذافی ، نہم
۱۲؍سال
فٹبال ، کرکٹ ، سندھی
کیمسٹری ، انجینئر ۔ مکان نمبر ۳۲۵ ۔ جی
سیکٹر منظور کالونی ، کراچی نمبر ۴۳

ذوالفقار علی ، ششم
۱۵؍سال
ناول پڑھنا ، ارد[و]
فوجی ۔
محمود آباد نمبر ۴ ، کراچی نمبر ۴۳

محمد الیاس قریشی
۷؍مارچ ۱۹۷۰ء
ٹکٹ ، کرنسی سکے
جمع کرنا ، اسلامیات ، وکیل بنیں گے۔
سیکٹر ۱۲/ ایف مکان نمبر ۱۵۲/ اے ، ٹی میرپور آزاد کشمیر

محمد عمر خان ، ہشتم
۲۹؍جولائی ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا ، مطالعہ
اردو ، ریاضی ، ڈاکٹر مکان نمبر ۹۰۳ ر سی
بی بی ، محمد شاہ آباد ، راولپنڈی

محمد غضنفر عرف غازی
۱۰؍جولائی ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا ، مطالعہ
ریاضی ، انجینئر ۔ مکان نمبر ۹۲۳
لطیف آباد نمبر ۴ ، حیدر آباد۔

شہزاد الحق ، نہم ڈی
۲۱؍جولائی ۱۹۷۶ء
انسائیکلوپیڈیا ، کتب
جمع کرنا ، فزکس ، سائنسدان ۔ قصر استقبال
الناصریہ الریاض ، سعودی عرب

آپ کی تصویر اس فریم کے سائز میں کٹی ہوئی ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا بڑی تصویر قابلِ قبول نہ ہوگی ۔

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ---------- کلاس ---------- عمر ----------
ارسال کردہ کل رقم ---------- بذریعہ ---------- دستخط ----------
پتا --

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام ---------- عمر ---------- کلاس ----------
پتا --
جواب نمبر ① ---------- ② ---------- ③ ---------- ④ ---------- ⑤ ----------
⑥ ---------- ⑦ ---------- ⑧ ---------- ⑨ ---------- ⑩ ----------

نام ---------- عمر ---------- جماعت ----------
مشاغل ---------- پسندیدہ مضمون ----------
کوئی اہم کامیابی --
پتہ --

امّی ابّو کا صفحہ

ام رمیصاءٔ

ہم سب کہنے کو پاکستانی ہیں۔ ہم اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ پاکستان سے اپنے تعلق کے احساس پر ہمیں ایک راحت سی محسوس ہوتی ہے۔ پاکستان کی ترقی پر، اس کی کامیابیوں پر اس کی کامرانیوں پر ہم خوش ہوتے ہیں، جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پاکستانی جو ہیں۔ مگر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ باقی ہے کہ .... کیا ہم پاکستانی ہیں؟

اگر "پاکستانی" سے مراد محض پاکستانی شہریت ہے تو کوئی شک نہیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ لیکن اگر پاکستانی ہونے سے مراد ایک ذمہ دار اور وطن کی محبت سے سرشار شہری ہے تو ہم میں سے بہت سوں کی پاکستانیت مشکوک ہوتی نظر آئے گی۔ یہی نہیں بلکہ اپنے قومی کردار کے حوالے سے ہم ایسے مجرم نظر آئیں گے جس نے پاکستان کو بڑے دکھ دیئے ہوں۔ اپنی قومی ذمہ داریوں کے حوالے سے اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے۔ بڑے معاملات کو چھوڑ دیجئے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی لے لیجئے۔

○ ...... ہم قطار میں کھڑے ہونے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ○ ...... پابندی وقت ہماری شان کے سراسر خلاف ہے۔ ○ ...... قانون توڑنا ہمارے نزدیک جوانمردی ہے۔ ○ ...... ہمارے بچے غیر ملکی لباس نہ پہنیں تو ہماری تسکین نہیں ہوتی ○ ...... ہمارے گھر بیرونی اشیاء کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور معلوم ہوتے ہیں۔ ○ ...... ہماری گلیاں ہمارے محلے ہمارے شفاف ذہنوں کا عکس نہیں بنتے۔ .... یہ اور ایسی لاتعداد خرابیاں ہماری گردن جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ ہم اپنی معمولی معمولی ناکامیوں پر پاکستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اپنے فرض کی ادائیگی سے پہلے ہم اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں۔

اس صفحے پر یہ باتیں جو ہم آپ سے کر رہے ہیں ان کا مقصد محض اس احساس کو بیدار کرنا ہے کہ اگر ہم ہی اچھے پاکستانی نہ ہوں گے تو ہمارے بچے کیوں کر اچھے پاکستانی بن سکیں گے۔ ہمارے بچے ہمارا عکس ہی تو ہیں ہمارا عکس ہم سے بہت مختلف کس طرح ہو سکتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کم از کم کوئی ایک کام، ہمارا کوئی ایک عمل تو ایسا ہو جو پاکستان کے حوالے سے ہماری شناخت بن جائے۔ پاکستان سے ہماری محبت تعصب کی حد تک شدید کیوں نہیں ہو جاتی۔ یہ عقیدت ہمارے لہو میں سرائیت کیوں نہیں کرتی۔

آیئے عہد کریں کہ آج سے پاکستان کی والہانہ محبت کا ایک دیپ ہم اپنے اندر روشن کر لیں گے۔ اپنے لئے...... اپنے بچوں کے لئے...... اپنے پاکستان کے لئے......

NO F.43 87/FIER

حکومت پاکستان

فیڈرل انسٹیٹیوٹ برائے تعلیم و تحقیق

اسلام آباد ۱۴ جولائی ۱۹۹۰ء

اسامیاں خالی ہیں

فیڈرل انسٹیٹیوٹ برائے تعلیم و تحقیق ۹ ایچ اسلام آباد میں واقع درج ذیل اسامیوں کے لئے جو عارضی بنیادوں پر چھ ماہ یا اس سے زائد عرصے تک جاری رہیں گی، کے لئے خواتین و حضرات سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

نام اسامی	تعلیمی قابلیت اور تجربہ	عمر	ڈومیسائل
انسٹرکٹر (۲) (بی پی ایس ۱۷) انگریزی اور عربی کے لئے ایک ایک	متعلقہ مضمون میں ایم اے (کم از کم درجہ دوم) دو سالہ تجربہ کالج کی سطح پر یا۔ متعلقہ مضمون میں ایم اے درجہ اول (تجربہ ضروری نہیں)	۳۲ سال	سندھ (دیہی)
اسسٹنٹ لائبریرین ا (بی پی ایس ۱۶)	(۱) بیچلرز ڈگری سیکنڈ کلاس میں (۲) لائبریری سائنس میں ڈپلوما مع کسی اچھی عوامی لائبریری کا ۳ سالہ تجربہ	۳۲ سال	سندھ (دیہی)
اسٹینو ٹائپسٹ (اردو) (بی پی ایس ۱۲)	میٹرک سیکنڈ ڈویژن مع شارٹ ہینڈ اسپیڈ ۸۰ الفاظ فی منٹ اور ٹائپنگ اسپیڈ ۴۰ الفاظ فی منٹ	۲۵ سال	سندھ (دیہی)
پروجیکٹر آپریٹر ا (بی پی ایس ۱۱)	ایف ایس سی کم از کم درجہ دوم اور دو سال کا تجربہ	۲۵ سال	سندھ (دیہی)
لیب اسسٹنٹ ا (بی پی ایس ۷) عارضی	سائنس کے مضمون کے ساتھ کم از کم میٹرک مع دو سالہ تجربہ	۲۵ سال	سندھ (دیہی)

۲ درخواستیں مکمل کوائف، اسناد، سرٹیفکیٹس اور ڈومیسائل کی مصدقہ نقول کے ہمراہ ۹۰-۷-۳۱ تک موصول ہو جائیں۔ انٹرویو کے دن امیدوار اپنی اصل اسناد سرٹیفکیٹس اور ڈومیسائل اپنے ہمراہ لے کر آئیں۔

(مسز ثریا بیگ)

ڈائریکٹر

فیڈرل انسٹیٹیوٹ برائے تعلیم و تحقیق

ایچ - ۹ اسلام آباد

آفس آف ایگزیکٹو ایجوکیشن ورکس ڈویژن ویسٹ
پہلی منزل پلاٹ نمبر جے ایم ۳۱/۷۹/ جگر مراد آبادی روڈ نیو ٹاؤن کراچی۔ ۱
No: XEN EDIN TC G-55 NIT 1990-91 5140

ٹینڈر نوٹس

مندرجہ ذیل کاموں کے لئے اسی ڈائریکٹوریٹ کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے B1 فارم پر سربہ مہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔

نمبر شمار	اسکیم نام / مقام	تخمینی لاگت	زر بیعانہ	مدت تکمیل
۱	تعمیر از سرنو تعمیر! شہری علاقہ میں واقع پرائمری اسکول کے لئے پانچ کمروں پر مشتمل عمارت ۸۸-۸۷ء پروگرام اے ڈی پی نمبر ۲۱۰۹ (۱) یونس آباد	۲۶۰۰۰۰	۵۲۰۰	۵ ماہ
۲	تعمیر۔ از سرنو! شہری علاقہ میں واقع پرائمری اسکول کے لئے پانچ کمروں کی عمارت ۸۸-۸۷ء پروگرام اے ڈی پی نمبر ۲۱۰۷			
	(۱) جی بی پی ایس بوانی چالی	۱۵۱۲۰۰	۳۰۲۴	۴ ماہ
	(۲) جی بی بی ایس، کے ایس علی ڈینو	۱۵۰۰۰	۳۰۰۰	۴ ماہ
۳	سندھ میں سنگل سیکشن ہائی اسکول کا قیام شہری علاقہ اے ڈی پی نمبر ۲۲۳۷			
	(۱) باباولائت علی شاہ	۱۵۰۰۰۰	۳۰۰۰	۴ ماہ
۴	شہری علاقہ پانچ کمروں پر مشتمل پرائمری اسکول کا قیام			
	(۱) حاجی قاسم کالونی	۱۲۴۲۰۰	۲۴۸۴	۴ ماہ

مختصر کام

۵	جی یو پی ایس مسجد اسکول الفلاح بھٹو ولیج	۱۰۳۰۰۰	۲۰۶۰	۳ ماہ
۶	جی بی ایس ایس۔ اے کے شیر شاہ کراچی	۹۱۰۰۰	۱۸۲۰	ڈھائی ماہ
۷	جی جی ایس ایس سائٹ ماڈل کراچی	۵۷۰۰۰	۱۱۴۰	۲ ماہ
۸	جی جی پی ایس سعید آباد بلدیہ	۴۳۰۰۰	۸۶۰	۲ ماہ
۹	ہوسٹل بلاک جی سی ٹی سائٹ کراچی	۳۹۸۰۰۰	۷۹۶۰	۵ ماہ
۱۰	انٹرنل روڈ اسٹاف کالونی جی سی ٹی سائٹ کراچی	۳۸۳۰۰۰	۷۶۶۰	۵ ماہ
۱۱	مرمت۔ از سر نو تعمیر، پلینتھ پروٹیکشن اسٹاف کالونی جی سی ٹی سائٹ کراچی ای ٹائپ ایسٹ اینڈ	۱۸۴۰۰۰	۳۶۸۰	۴ ماہ
۱۲	مرمت۔ از سر نو تعمیر، پلینتھ پروٹیکشن ۔ اسٹاف کالونی جی سی ٹی سائٹ کراچی ای ٹائپ ویسٹ اینڈ	۲۵۸۰۰۰	۵۱۶۰	۴ ماہ
۱۳	پلینتھ پروٹیکشن رہائشی کواٹر جی سی ٹی کراچی ڈی ٹائپ کوارٹر	۳۰۰۰۰۰	۶۰۰۰	۵ ماہ

خاص مرمت / عام مرمت

۱۴	شیر شاہ ایس / آر ٹو او / آر ٹو جی بی ایس	۷۵۰۰۰	۱۴۰۰	ساڑھے تین ماہ
۱۵	پاڑہ بلدیہ ایس / آر ٹو او آر ٹو لاسی	۴۵۰۰۰	۹۰۰	ڈیڑھ ماہ
۱۶	سعید آباد بلدیہ ایس / آر ٹو او / آر جی بی پی ایس	۵۰۰۰۰	۱۰۰۰	۲ ماہ
۱۷	شمس پیر کراچی ایس / آر ٹو او / آر ٹو جب بی پی ایس	۸۶۰۰۰	۱۷۲۰	۳ ماہ
۱۸	خاص مرمت دیکھ بھال			
۱۹	قصبہ کالونی ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی پی ایس			
۲۰	علیگڑھ نمبر ۱ کراچی ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی پی ایس			
۲۱	منگھو پیر کراچی ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی پی ایس			
۲۲	علیگڑھ نمبر ۲ کراچی ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی ایل ایل ایس			
۲۳	بجلی کی تنصیبات ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی ایل ایل ایس نیا ہائیر گارڈن۔ اورنگی کراچی			
۲۴	بجلی کی تنصیبات ایس / آر ایم / پی ٹو جی بی ایل ایل ایس محمد حسین، مومن آباد			
۲۵	بجلی کی تنصیبات ایس / آر ایم / آر ٹو جی بی پی ایس خورشید الاسلام اورنگی، کراچی			
۲۶	بجلی کی تنصیبات ایس / آر ایم / آر ٹو جی بی پی ایس نمبر ۳ سیکٹر نمبر ۴ اورنگی			
	جی سی ٹی۔ ایس / آر او / آر۔ ٹی سائٹ کراچی ورک شاپ			

- ٹینڈر ۹۰۔ ۸۔ ۱۲ کو دوپہر ۲ بجے تک جاری کئے جائیں گے۔ اور ۹۰۔ ۸۔ ۱۳ کو ایک بجے دن تک کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر دستاویزات آفس سے ۲۵ روپے (ناقابل واپسی) ادا کر کے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔
- مشروطی ٹینڈر ناقابل قبول ہونگے۔
- انتظامیہ کوئی وجہ بتائے بغیر کسی بھی یا تمام ٹینڈر کو منظور کرنے حق رکھتی ہے۔

جو تھی کل بھی پسند
وہ ہے اب بھی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو ناں
ناز
پان مصالحہ
NAZ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE
Repcom

LASERDOT

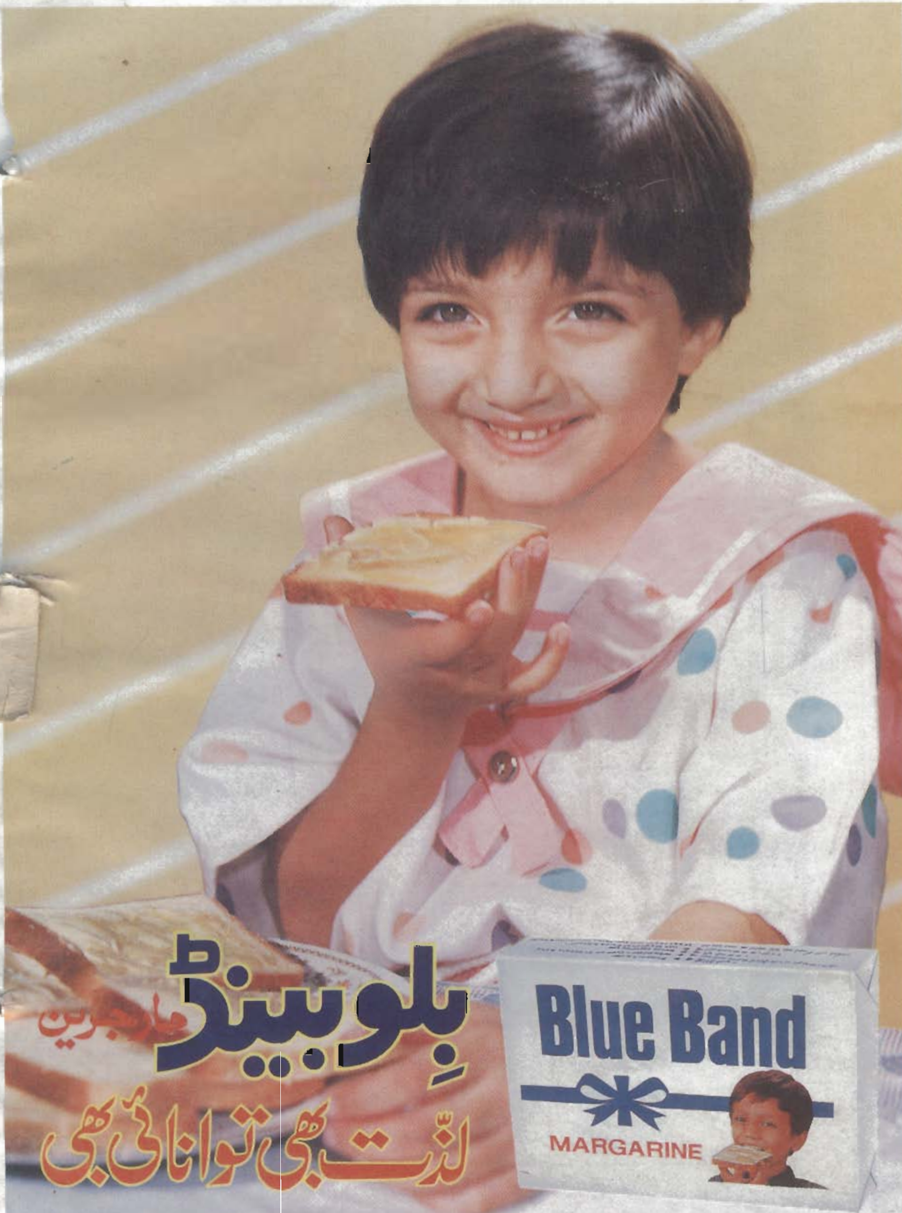
بلو بینڈ
مارجرین
لذت بھی توانائی بھی
Blue Band
MARGARINE